بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء — نمبر ۱

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر بی اے

مخزن

اردو علم و ادب کی ترقی کا ایک ماہوار رسالہ

فہرست مضامین نظم و نثر

شیخ محمد اقبال ایم اے — ۱

سید شریف حسین بی اے



SHAIKH ABDUL QADIR

سہ سالہ ریویو

صرف تین سال ہوئے۔ ملک میں ماہوار اُردو رسالے خال خال نظر آتے تھے۔ دو تین مفید اور نامور پرچے جاری ہو کر بند ہو چکے تھے اور جو تھے وہ بالعموم نظم کے رسالے تھے۔ اور نظم میں بھی ایک صنف خاص کے۔ یعنی غزل اور غزل میں بھی ایک طرح خاص کی قید کے ساتھ ہر گلدستے میں مختلف شعرا کا طرحی کلام درج ہوتا تھا۔ اور کبھی کوئی غزل زائد درج ہوتی تھی تو اس پر "غیر طرح" لکھا جاتا تھا۔ اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں مخزن نے جنم لیا۔ جو پہلا اعلان اس کے مقاصد کا ہوا اُس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ خاص اغراض لیکر نکلا ہے۔ یہ اغراض بہت سی تھیں۔ اور اس تین سال کے قلیل عرصے میں اُن سب کی طرف کچھ نہ کچھ توجہ ہوئی ہے مگر اُن میں چند بڑی زبردست یہ تھیں :۔

۱۔ اُن انگریزی خوان اصحاب کو جو عموماً اپنی زبان کو پروا کے قابل ہی نہ سمجھتے تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ اُردو کے اخبار یا رسالے یا کتابیں دیکھنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ اور اُس میں کچھ لکھنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اِس امر کا قائل کرنا۔ کہ اپنی زبان کی ترقی ضروری ہے۔ اپنی زبان میں بھی دلچسپی کے سامان ہیں اور اُس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اِس مقصد میں نمایاں کامیابی ہوئی اور ایک پُر زور ترغیب نوجوانوں کو اُردو کی کتابیں اور رسالے پڑھنے اور اُن میں کچھ لکھنے کی جانب ملک میں پیدا ہو گئی۔ جس سے نہ صرف ہم نے فائدہ اُٹھایا اور اُٹھا رہے ہیں۔

حصّہ ہے گو جس قدر ہے۔ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ ہم ایسے ہندو اصحاب کے متلاشی ہیں جو سنسکرت کے ذخیروں میں سے نکال کر کچھ ہمیں دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان اُن مضامین کو خاص توجہ سے پڑھیں اور اسی طرح اگر مسلمان کچھ عربی علوم سے چھانٹ کر پیش کریں تو وہ ہندو ناظرین کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہو۔ غضب ہے کہ اہلِ یورپ کے لئے تو سنسکرت اور عربی دونوں علوم بے انتہا دلچسپی رکھیں اور اہلِ مشرق خود ایک دوسرے کے علوم سے نہ صرف بے بہرہ بلکہ بالکل بے پروا ہوں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تین سال کی مدّت قلیل کے اعتبار سے یہ کام خاصہ اطمینان بخش ہے۔ اور اگر ہمارے عنایت فرماؤں کی توجہ اسی طرح جاری رہی تو ہم اُمید کرتے ہیں کہ رسالہ روز بروز زیادہ مفید اور زیادہ دلچسپ ہوتا جائیگا۔ جو جو نتائج حاصل ہوئے ہیں اُن میں ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو ابھی حاصل ہونے باقی ہیں۔ انہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہمیں قدردانانِ مخزن کی مساعی پر پورا اعتماد ہے۔ اگر تائیدِ ایزدی شاملِ حال رہی تو یہ کوشش خالی نہیں جائیگی۔

مخزن

آبادی

شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے نے حال میں ایک کتاب پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے علم الاقتصاد پر لکھی ہے۔ جس کا انگریزی نام "پولیٹیکل اکانمی" ہے اور جسے عموماً علم سیاست مدن کہتے ہیں۔ بلا مبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ ہندوستان میں اس علم کا ابھی بہت کم چرچا ہے۔ حالانکہ اسے بغور پڑھنے کی ہندوستان کو نہایت ہی ضرورت ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو ہمیں کامل امید ہے کہ شیخ صاحب کی شہرت اور اس کی ذاتی خوبی مقبولیت کو اس کے استقبال کے لئے اٹھا کر لائیگی۔ اور علاوہ عام قدردانی کے خاص جماعتیں اسے خریدینگی۔ ٹکسٹ بک کمیٹی نے اسے پسند کیا ہے اور ایک سو جلدیں خریدنا منظور فرمایا ہے۔ ہم قابل مصنف کی اجازت سے اسکا ایک دلچسپ حصہ نقل کرتے ہیں کتاب زیر طبع ہے:۔

کسی شے کے صرف سے مراد اس شے کے استعمال سے ہے۔ صرف شے عدم محض کا مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً جب اینٹوں کے ایک خاص تعداد کا پل بنجاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اینٹوں کی یہ تعداد صرف ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس صرف سے اینٹیں بالکل فنا نہیں ہو جاتیں۔ تاہم لفظ صرف کے مفہوم میں فنا کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اور صرف شے کے معنوں میں اس شے کا انعدام اور تبدیل ہیئت دونوں داخل ہیں۔

بعض حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ صرفِ دولت کی بحث مضامینِ اقتصاد میں داخل نہیں ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ مورخین کیلئے اس علم کا مطالعہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس کے اصول اور مسائل ان اسباب پر روشنی ڈالیں جنکے عمل سے مختلف اقوامِ عالم کا عروج و زوال ظہور میں آتا ہے اور اس جزر و مد کے بواعث معلوم نہیں ہو سکتے جب تک کہ اقوامِ عالم کی دولت اور اسکو صرف کرنے کے مروج طریق نہ معلوم کئے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہم اپنی آئندہ نسلوں کی دولت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم خود کس قدر صرف کرتے ہیں۔ کسی قوم کی آئندہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر اسقدر ضروری نہیں ہے کہ اس قوم کی موجودہ دولت کا اندازہ کیا جائے۔ بلکہ زیادہ ضروری اس بات کا معلوم کرنا ہے کہ وہ قوم اپنی موجودہ دولت کو کس طرح صرف کرتی ہے اور اسکی عادات کس قسم کی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ اسکے دستکاروں کا ہنر اور انکی محنت کی کارکردگی روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح صرف کرے کہ اسکے افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے۔ جس سے مفلسی بیماری اور دیگر بد نتائج پیدا ہوتے جائیں۔ باوجود ان صریح دلائل کے ہمیں تعجب ہے کہ بعض حکماء اس بحث کو مضامینِ اقتصاد میں داخل نہیں سمجھتے۔

(۱) دولت کا پہلا استعمال یہ ہے کہ اسکی وساطت سے دستکار کو سامانِ معیشت لباس اور جائے رہائش ملتی ہے۔ تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیگر حیوانات کی طرح انسان بھی صرف نباتات اور قدرتی پھل پھول پر گذارہ کرتا تھا۔ مگر انسان کے تمدن کا حقیقی سلسلہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب اس نے آگ کے خواص اور اس کے طریقِ استعمال معلوم کرکے اپنی خوراک کو پکانا شروع کیا۔ علیٰ ہذا القیاس رفتہ رفتہ تمدنی ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ انسان برہنہ پہاڑوں کی غاروں اور درختوں کے پتوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہے اور بجائے انکے لباس جھونپڑوں چمڑے کے خیموں اور مکانوں کا استعمال سیکھے۔

(۲) دولت کا دُوسرا استعمال یہ ہر کہ اسکی وساطت سے دستکار کی بی بی پرورش پاتی ہر
بی بی کی خواہش ایک فطری خواہش ہر اور یہ بالعموم ان خواہشات کے پُورا ہو چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہر جسکا پُورا ہونا انسان کے جسمانی بقا کے واسطے انتہا درجہ کا ضروری ہر۔ مگر بی بی انسان کے بعض قدرتی تقاضوں کو ہی پُورا نہیں کرتی بلکہ ابتدائی تمدّن میں خاوند کو اپنے کاروبار میں مدد دیتی ہے اور اس طرح اسکی پیداوار محنت پر بڑا اثر کرتی ہے۔ اکثر قدیم قوموں میں ایک سے زیادہ بیبیاں کرنا مستحسن تصور کیا جاتا تھا اسکی وجہ کچھ تو یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ اور کچھ یہ کہ ہر قبیلہ اپنے افراد کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے جنگ و جدل میں جو تمدّن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ہوتا ہے دیگر قبائل پر غلبہ رہے تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقتصادی لحاظ سے تعدد ازدواج تمدّن کی ہر صُورت میں مستحسن ہے اس سے آبادی بہت بڑھتی ہے جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ہوتی ہر۔

(۳) صرف دولت کی تیسری صُورت دستکار کے بچّوں کی پرورش اور اُن کی تعلیم و تربیت ہر۔ جس طرح بی بی کا ہونا دستکار کو محنت کی تحریک دیتا ہے اسی طرح بچّوں کا پیدا ہونا بھی اُس کے لئے ایک مزید محرک ثابت ہوتا ہے۔ بچّے کی محبت ایک فطری تقاضا ہر پس باپ کا اپنے بچّوں کو پرورش کرنا یا انکی تعلیم و تربیت پر روپیہ خرچ کرنا صرف اس خیال سے نہیں ہوتا کہ وہ بڑے ہوکر روپیہ کمائینگے یا قوم و ملک کے استحکام کا باعث ہونگے بلکہ اس کی محبت ایک طبعی جوش ہر جسکو کوئی شے دبا نہیں سکتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض عورتیں بانجھ ہوتی ہیں اور بعض باپ قوت مردمی سے عاری ہوتے ہیں لیکن چونکہ انکی تعداد نہایت قلیل ہر۔ اسواسطے اس واقعہ کو نظر انداز کرکے اس صریح اصول کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر کسی باپ کے بچّوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اُسیقدر اسکے وسائل آمدنی پر اثر پڑیگا۔ اگر کسی شخص کی آمدنی قلیل ہو اور اسکی اولاد بڑھتی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان کی فارغ البالی وہ نہ رہے گی جو پہلے اُسے حاصل تھی۔ موجودہ آمدنی تمام افراد کے

گذارے کے لئے کافی نہ ہوگی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ خاندان کی جسمانی حالت میں فرق آجائیگا اور وہ
پس انداز بھی جو کسی ایسے وقت کے لئے جمع رکھا ہوگا خرچ ہوجائیگا۔ بلکہ قلت معیشت کی وجہ سے خاندان
مذکور میں بعض ایسی بیماریاں پیدا ہوجائینگی جنکا اثر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا جائیگا۔ جب کسی قوم میں آبادی
مناسب حدود سے زائد ہوجاتی ہے تو قدرت خود بخود وبا اور قحط کے تازیانوں سے اسکا علاج کرتی ہے
بچے اور بوڑھے اجل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جوانوں کی قوت مردمی میں فرق آجاتا ہے اور قحط بالعموم
آبادی کی افزائش کو روکتا ہے۔ محقق واکر کے نزدیک انسانی قبائل کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے
کہ وبا اور قحط کے وسائل کسی قوم کی آبادی کو مستقل طور پر کم نہیں کرسکتے۔ وسیع معنوں میں زندگی
کا قیام ایک کلیہ قانون کے تابع ہے۔ جسکو فلسفی قانون بقائے افراد قویہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں
غالباً تمام حکمائے حال اس بات پر متفق ہیں کہ نظامِ عالم کا ہر حصہ اس قانون کے عمل سے متاثر ہوتا ہے۔
کیا نباتات کیا حیوانات اور کیا انسان سب کے بقا و فنا کا اصلی راز اسی قانون کا عمل ہے۔ تم
جانتے ہو قیامِ حیات کے وسائل و اسباب ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں پس جب یہ اسباب و وسائل دفعتہً
متغیر ہوجائیں اور جانداروں کے کسی خاص طبقے میں وسائلِ بقا کے تغیر کے ساتھ ہی ان کو مطابق
تبدیلی پیدا کرسکنے کی صلاحیت نہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ وہ طبقہ فنا ہوجائیگا۔ اور وہی حیوان
محفوظ رہینگے جو ان وسائل متغیر شدہ میں قائم رہنے کی قابلیت رکھتے ہونگے۔ مثلاً فرض کرو
کہ کسی ملک کی آب و ہوا میں دفعتہً اس قسم کی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے جو چارپایوں کے حق میں نہایت
مضر ہے۔ اس حالت میں صرف وہی چارپائے زندہ رہ سکینگے جنکے قوائے میں تبدیل شدہ آب و ہوا
کے متحمل ہوسکنے کی قابلیت ہوگی باقی سب فنا ہوجائینگے۔ غرضیکہ نظام عالم کے ہر حصہ میں جانداروں
کے درمیان ایک قسم کی مصافِ ہستی شروع ہے جس میں قوی افراد فتح پاتے ہیں اور ضعیف و ناتوان
افراد صفحۂ عالم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر محقق واکر کہتا ہے کہ انسان کے بقا و فنا کی صورت
میں یہ قانون کامل طور پر عمل نہیں کرسکتا۔ اور وبا اور قحط سے جو اس قانون کے عمل کی صورتیں
ہیں انسانوں کی تعداد میں کوئی مستقل کمی پیدا نہیں ہوسکتی۔ انکے نزدیک انسان اور دیگر

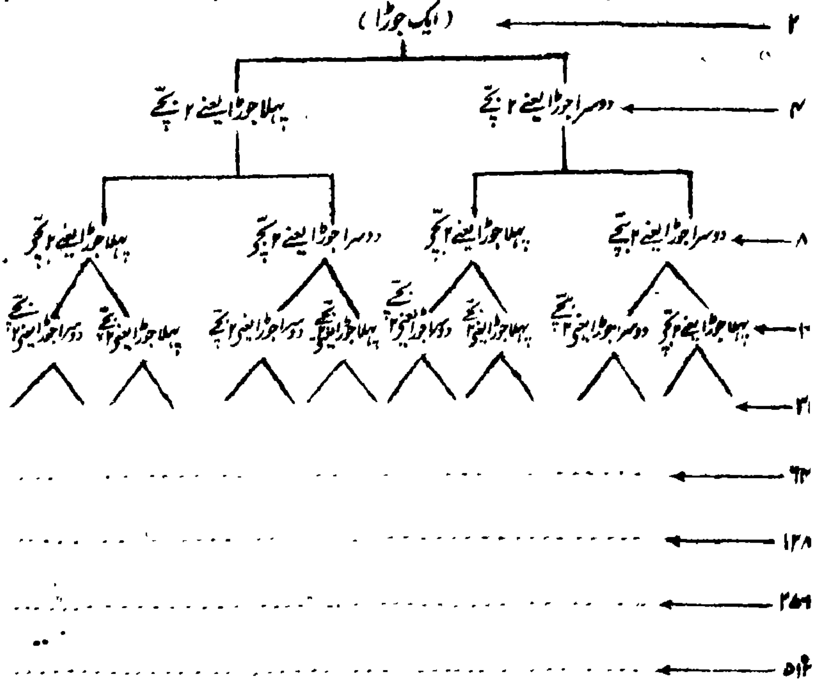
جانداروں میں ایک بڑا فرق ہے جو انسان کو اس قانون کے عمل سے آزاد کرتا ہے۔ حیوانوں اور دیگر جانداروں میں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اسکو اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ مگر انسان کی حالت اس سے مختلف ہے۔ نسبی تعلّق جو تمدنِ انسانی میں خاندان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایک ایسا زبردست رشتہ ہے جو ایک فرد کو دوسرے افراد سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ جانداروں کے کسی طبقہ کا کوئی فرد اگر کسی دُکھ درد میں مبتلا ہو جائے تو باقی افراد کو اسکی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ مگر انسانی خاندان کے کسی فرد کو اگر کوئی بیماری آجائے تو باقی افراد نہایت خلوص اور محبت سے اسکی حفاظت کرتے ہیں اور اسکو موت کے پنجہ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا وہ مصافِ زندگی جو اور حیوانات میں بوجہ اجنبیت و غیریّت جاری ہے انسانی قبائل میں بوجہ یگانگت اور تعلّقات نسبیہ کے معدوم ہے۔ اِس استدلال سے محقق موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسانی زندگی بوجہ اس یگانگت کے جو تعلّقاتِ نسبیہ سے پیدا ہوتی ہے مذکورہ بالا قانون کے عمل سے کُلی طور پر آزاد ہے۔ مگر ہماری ذاتی رائے حکیم موصوف کے خلاف ہے۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ نسبی تعلّقات کی وجہ سے انسان اپنے خاندان کے کمزور و ناتوان افراد کی حفاظت کرتا ہے اور مختلف افرادِ انسانی کے درمیان وُہ اجنبیت اور غیریّت نہیں ہے جو حیوانوں کو قانونِ بقائے افرادِ قویہ کے تحت میں لاتی ہے۔ تاہم یہ اجنبیت و غیریّت مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں کے درمیان ضرور موجود ہے اگرچہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان نہیں ہے۔ حکیم موصوف کا خیال اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب تمام نوعِ انسان یہ محسوس کریں کہ وُہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور نہ صرف یہ محسوس ہی کریں بلکہ عملی طور پر اسکو کر کے بھی دکھائیں۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمدنی انسان کی سب سے اعلیٰ صورت یہی ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ مگر چونکہ نفس الامر میں ایسا نہیں ہے اسواسطے وُہ اجنبیت اور غیریّت جو حیوانوں میں موجود ہے اور جو انکو مذکورہ بالا قانون کے عمل سے متاثر کرتی ہے مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف استعداد

ہے کہ حیوانات میں مصافِ زندگی افراد کے درمیان جاری ہو مگر انسانوں میں یہ لڑائی خاندانوں اور قوموں کے درمیان جاری ہو۔ ہر خاندان اور ہر قوم اس مصافِ ہستی میں فتحمند ہونے کی خواہش کرتی ہو اور سب کا یہ قدرتی اور فطری تقاضا ہو کہ حریف کو گرا کر تمام روئے زمین کی خود وارث بنجائے جس طرح اِس قانون کے اثر سے حیوانوں کی بعض قدیم قسمیں صفحہ ہستی سے معدوم ہوگئی ہیں اِسی طرح اس قانون کے عمل سے انسانوں کی قدیم قومیں بھی حرفِ غلط کی طرح کتابِ ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ اور اب انکا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غیر مادی اشیاء مثلاً خیالات ومذاہب کا قیام بھی اِسی قانون کے تابع ہے جو خیال یا جو مذہب انسان کے تمدّنی حالات اور اُس کی عقلی ترقّی کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کرسکیگا۔ ضرور ہے کہ وُہ انسان کی جدید رُوحانی ضروریات کو پُورا نہ کرسکنے کے باعث معدوم ہو جائے۔ پس ہماری رائے میں مذکورہ بالا قانون انسانی قبائل کی صُورت میں بھی اپنا عمل بدستور کر رہا ہو۔ اور قحط ووبار اور آبادی کو کم کرنے کے دیگر قدرتی وسائل کو جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تمدن انسانی کی ترقی کے لیئے نہایت ضروری شرائط ہیں۔

یہانتک تو ہم نے یہ ثابت کیا ہو کہ آبادی کا مناسب حدود سے باہر نکل جانا افلاس اور دیگر بدنتائج کا سرچشمہ ہو۔ مگر عملی نتائج پر پہنچنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہو کہ انسانی موت و پیدایش کے درمیان صحیح نسبت کیا ہو۔ یہ ایک ظاہر واقعہ ہو کہ بعض پیدا ہوتے ہی بعض مرتے ہیں لیکن مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یہ دیکھنا ضروری ہو کہ معمولی اموات وغیرہ کو نکال کر شرح پیدایش فی زن و مرد کیا ہو۔ حکیم مالتھس اپنے مضمون موسوم بہ آبادی میں یہ اصُول قرار دیتا ہو کہ باوجود تجرید اور ضُعفِ مردمی کے جو بعض صورتوں میں ہوتا ہو انسان کی شرح پیدایش بحسابِ اوسط بالعموم چار بچے فی زن و مرد کے حساب سے ہوتی ہو۔ اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ آئندہ نسلوں کی قوتِ توالد وتناسل میں کوئی ضعف نہیں عارض ہوگا تو صاف ظاہر ہو کہ

نوع انسان کی آبادی کا شجر مندرجۂ ذیل طریق پر شاخ در شاخ ہو کر بار آور ہوتا جائیگا :-

مرد عورت کا ایک جوڑا جو حکیم مالتھس کے نزدیک بالعموم چار بچے پیدا کرتا ہے یعنی بحساب اوسط ۲ لڑکیاں اور ۲ لڑکے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک جوڑی سے دو جوڑے پیدا ہوتے ہیں



اس سلسلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہندسہ اپنے مقدم سے دگنا ہے پس یہ وہ سلسلہ ہے جس کو اصطلاح ریاضی میں سلسلۂ ہندسیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں لہذا نوع انسان کی آبادی بشرطیکہ کوئی اختیاری یا غیر اختیاری اسباب مانع نہ ہوں سلسلہ ہندسیہ کے مطابق بڑھے گی۔ مگر برخلاف اسکے تم پیچھے پڑھ آئے ہو کہ پیداوار زمین یعنی خوراک انسانی قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہے اور اس کی مقدار روز بروز کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ لہذا اس واقعہ سے حکیم موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نوع انسان کی آبادی اسی قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے

قدرتی وسائل اس کے لئے کفائت نہیں کر سکتے۔ ذرا خیال تو کرو اگر نوع انسان کی
آبادی بغیر کسی قید کے بڑھ جائے اور انسان اپنی عقل خداداد کے وساطت سے اپنے
وسائلِ زندگی کو زیادہ کرنے کی راہیں نہ سوچے تو بنی آدم کا کیا حشر ہوگا فطرتاً انسان
اس قسم کی ہستی ہے کہ اس کے قوائے نظامِ قدرت کے اُن قوائے کا مقابلہ کر سکتے
ہیں جو اسکے قیامِ زندگی کے مخالف ہوں۔ قدرت عظیم الشان جنگوں وباؤں اور
قحطوں کے وساطت سے خود بخود آبادیِ انسان وحیوان کو کم کرتی ہے۔ اور انسان
اپنی انجام بینی کی وجہ سے اپنے شہوانی قوائے پر غلبہ پاکر افزائشِ آبادی کے میلان
کو اختیاری طور پر بھی روک سکتا ہے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک افلاس اور دیگر
بُرائیوں کا اصل منبع آبادی کا انداز سے زیادہ بڑھ جانا ہے۔ اکثر ممالک کے مشاہدے
سے معلوم ہوا ہے کہ نوعِ انسان کی آبادی ہر پچیس سال میں دُگنی ہو جانے کا میلان رکھتی ہے
جب یہ حال ہو تو جس مُلک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو وہاں کے لوگوں کو چاہئے کہ
انجام بینی سے کام لیں اور ایسے وسائل اختیار کریں جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں۔ انسان
کی قوتِ توالد و تناسل قدرتاً کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری
اسباب سے روکا نہ جائے تو اسکا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث
ہوگا۔ اُجرت کے بحث میں بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب دستکار افزائشِ آبادی کے
بد نتائج محسوس کرینگے تو خود بخود ایسے وسائل اختیار کرینگے جن سے آبادی کم ہو۔ مگر تجربہ
اس بات کے خلاف ہے۔ چین اور ہندوستان کی موجودہ حالت یہ ظاہر کرتی ہے کہ غریبی اور
افلاس کی صورت میں انسان کی قوتِ تناسل و توالد مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے۔
بس سے آبادی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتی اور مفلسی کے درد کی شدت کو اور زیادہ جان فرسا
بناتی ہے۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افزائشِ آبادی کے قدرتی علاج قحط و وبا وغیرہ ان
ممالک کو آئے دن ستاتے رہتے ہیں۔ (اقبال)

موجودہ اُردو لٹریچر

ہمیں یقین ہے کہ "بھارت مترا" کے فاضل ایڈیٹر صاحب کا یہ مضمون بہت شوق سے پڑھا جائیگا۔ اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنکی تصحیح کے لئے حاشیے ایزاد کرنے پڑے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمیں معذور سمجھا جائیگا۔ ہم اُنکے مفید مشورے کے مشکور ہیں۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ اُنکی تحریر یا ہمارے حواشی کسی گرم مباحثے کا پیش خیمہ بنیں۔ کم از کم یہ اوراق ایسے مباحثے کے لئے جگہ نہیں نکال سکینگے۔ اس مضمون کو بھی اس لئے درج کرنا مناسب سمجھا کہ ہم جناب بالمکند صاحب کے مضامین کے خصوصیت سے منتظر رہتے ہیں اور ساتھ ہی اس لئے کہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بیرونی دُنیا ہمیں اور ہمارے کام کو کس نگاہ سے دیکھتی ہے:۔

اپنے ۱۹ مئی سنہ ۱۹۰۳ء کے عنایت نامہ میں مخزن کے لائق ایڈیٹر شیخ عبدالقادر صاحب نے لکھا تھا "مہینے دو مہینے میں گھنٹے دو گھنٹے میرے لئے وقف کر رکھئے۔ کچھ ناممکن تو نہیں مانا کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ مَیں اگر ہندی لکھ سکتا تو معاوضہ میں آپ کے اخبار کے لئے لکھ بھیجتا"۔ تب سے میری خواہش تھی کہ مَیں شیخ صاحب سے ہندی نہ لکھ سکنے کا سبب پُوچھوں۔ جو اُردو لکھ سکتے ہیں وُہ ہندی کیوں نہیں لکھ سکتے یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اُردو لکھنے والے ہندی لکھنے کو کوہ ہمالیہ عبُور کرنا کیوں سمجھتے ہیں؟

پانچ سال کی اچھی محنت کے بغیر صحیح اُردو لکھنا نہیں آتی۔ بہت لوگ اتنی مُدت کی محنت کے بعد بھی صحیح اُردو نہیں لکھ سکتے۔ جنکو اُردو لکھنا آتی ہے۔ اُنہیں بھی فیصدی دس صحیح لکھنے کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں۔ نوّے کی املا میں غلطیاں رہتی ہیں۔ اسکا تجربہ شیخ صاحب کو بھی ہوگا۔ مگر ہندی لکھنا ایک مہینے میں آجاتا ہے چھ ماہ میں خاصہ ربط ہو جاتا ہے اور ایک سال کی مشق میں صاف اور صحیح ہندی لکھی جا سکتی ہے۔ اتنی سہل چیز آفت کیوں معلوم ہوتی ہے؟ اُس کے سیکھنے کی طرف

توجّہ کیوں نہیں کی جاتی؟

ہندی اُردو قریب قریب ایک ہیں۔ دونوں میں فرق اسی قدر ہے کہ ایک دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے اور دُوسری فارسی حروف میں۔ ابھی لکھا گیا ہے کہ دیوناگری حروف کا سیکھنا بہت آسان ہے۔ مَیں ۱۸۹۰ء میں کوہ نُور لکھتا تھا۔ اُس سے پہلے مجھے ہندی سے لکھنے کا کچھ ربط نہ تھا۔ اُسی سال فروری میں کوہ نور چھوڑ گیا اور جُون میں کالا کانکر کے روزانہ ہندی اخبار کے ایڈیٹروں میں شامل ہوا۔ مَیں جاتے ہی ایسی ہندی لکھنے لگا کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ ایک سال پہلے یہ صرف اُردو جانتا تھا۔ ہندی کا نام تک نہیں۔

صدیاں گذر گئیں مگر افسوس مُسلمان لوگ اب تک ہندوؤں کے لٹریچر سے ناواقف ہیں۔ نہ جانے کب تک یہ ناواقفیت کا سلسلہ جاری رہیگا۔ مگر یہ یاد رہے کہ جب تک مُسلمان اِس مُلک کی زبانوں سے ناواقف رہینگے۔ اُن کے لٹریچر کی ترقی محدود رہیگی۔ اُردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کی ہے۔ اُردو ہندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر مُسلمانوں نے دوسری زبانوں سے جو اس مُلک میں بولی جاتی ہیں ناواقف رہکر اُردو کو اپنی زبان اور ہندی کو ہوّا کی قسم کی کوئی دوسری شے سمجھ رکھا ہے۔

اِسوقت ہندوستان میں چار زبانوں کو خاصکر ترقّی ہے۔ ہندی[1] ۔ مرہٹی۔ گجراتی اور بنگلہ۔ اِن میں سے بنگلہ نے بہت تھوڑے عرصہ میں بہت بھاری ترقی کی ہے۔ مرہٹی گجراتی کا نمبر اُس کے بعد ہے اور سب سے اخیر نمبر ہے ہندی کا۔ ہندی کی ترقی صرف بیس سال سے ہورہی ہے۔ باقی تین کی عمر کچھ زیادہ ہے۔ اُردو ہندی یعنی برج بھاشا سے نکلی۔ اور اُس کا اچھا زمانہ سو سال سے ہے۔ مگر اُس نے ترقی کتنی کی مَیں خود نہیں کہنا چاہتا۔ دوسروں کی زبانی سُننا چاہتا ہُوں۔ موجُودہ ہندی اُردو سے تیار ہُوئی ہے۔ اِسکی بُنیاد اُردو کے ساتھ ہی پڑی تھی مگر آگے چل کر یہ پیچھے رہگئی اُردو کو سرکاری سہارا ملگیا۔

[1] کیا ہندی کو خاصکر ترقی والی زبانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور کیا اُردو بالکل ترقی نہیں کر رہی۔ کہ اسکا ذکر بھی اس ضمن میں نہ آسکتا (ایڈیٹر)

میر امن کی کتاب باغ و بہار اور للو کوی کا پریم ساگر ایک سال کے آگے پیچھے بنے تھے مگر اس کے بعد اردو لٹریچر کو ترقی ہوئی اور ہندی کو نہیں - یعنی فارسی حروف میں اسی زبان کی عزت ہوئی اور ناگری میں نہیں - مگر اب بیس سال سے ہندی بہت ترقی کر رہی ہے - اگر یہ ترقی بیس سال اور جاری رہی تو اردو سے ہندی بہت آگے ہو جائیگی - وجہ یہ کہ ہندی کے طرفدار اردو جانتے ہیں - بنگلہ مرہٹی اور گجراتی جانتے ہیں[1] اور ان زبانوں کے جاننے کے سبب سے انگریزی میں بھی وہ اردو والوں سے تیز ہیں[2] - اردو والے خالی اردو فارسی میں اٹکے ہوئے ہیں یا بہت زور مارتے ہیں تو انگریزی سے کچھ مدد لیتے ہیں - انکی تعداد بھی ابھی کم ہے -

تعجب ہو کہ اردو والے ہندوستان کی کسی زبان سے واقف نہیں اور نہ ان کے لٹریچر کی انکو کچھ خبر ہے - مگر دوسری زبانوں والے انکی ترقی کی خوب طرح خبر رکھتے ہیں[3] - وہ خوب جانتے ہیں کہ اردو والے کتنے پانی میں ہیں - الہ آباد سے پرواسی نام کا ایک بنگلہ زبان کا ماہوار رسالہ نکلتا ہے - اس کا تیسرا سال شروع ہے - اس عرصہ ہی میں اس نے ہزاروں خریدار حاصل کیے ہیں وہ اپنی موجودہ جلد کے نویں نمبر میں "موجودہ اردو لٹریچر" کے عنوان سے اردو رسائل کا جو ریویو کرتا ہے وہ ہر ایک اردو داں اور اردو کے خیر خواہ کے پڑھنے کے لائق ہے - اس کا ترجمہ نیچے دیا جاتا ہے -

" اردو اور ہندی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں - ایک ہی زبان کے دو ایڈیشن ہیں پہلے میں فارسی عربی الفاظ زیادہ ہیں - دوسرے میں سنسکرت اور مقامی - قواعد دونوں کے قریب قریب ایک - مگر لٹریچر الگ الگ ہے - لکھنے والے اور پڑھنے والے الگ الگ ہیں - رسم الخط الگ الگ -

[1] ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے (ایڈیٹر) [2] اس کی منطق سمجھ میں نہیں آئی - [3] جیسا کہ آگے چلکر خود ہی معلوم ہو جائیگا - مگر اسمیں شک نہیں کہ جتنی خبر وہ رکھتے ہیں یہ بھی غنیمت ہے - کیونکہ اردو والے فی الحقیقت ہندی کی ترقی سے اسقدر بھی باخبر نہیں (امتحنے)

ہندی اُردو کی ماں ہے ۔ جب شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو ہندی فارسی اور عربی کے میل سے اُردو پیدا ہوئی ۔ عمر قریب تین سو سال ہے ۔ اُردو کے معنے ہیں لشکر ۔ مغل عرب اور تُرک سپاہیوں سے اس ملک کے باشندوں کی اس دوغلی زبان میں خرید و فروخت کی باتیں ہوتی تھیں ۔

ماں سے بیٹی کا پیار بالکل نہیں ہے ۔ بیٹی[۵۱] ماں کا گلا دبا کر مار ڈالنے کو ہمیشہ مستعد رہتی ہے ۔ مُسلمانی زمانہ میں اُردو کا بڑا زور تھا ۔ انگریزی حکومت میں بھی بہت برسوں تک اس کی بڑھی چڑھی رہی ۔ بنگال کی عدالتوں میں بھی وُہ ایک وقت جاری تھی ۔ عام طور پر اُردو مُسلمانوں لالہ لوگوں (ہندوستانی کالیستھوں) اور اِن صُوبجات کے کشمیری پنڈتوں کی زبان ہے ۔ پچھلے دو گروہ کے لوگوں نے مسلمانوں سے خوب ربط ضبط بڑھایا تھا اور انکی رسم و رواج کی بھی خوب نقل کی تھی ۔ اُردو عدالتی زبان اور ہمارے مالکوں کی بہت پیاری ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی چاپلوس زبان ہندوستان میں اور نہیں ہے ۔ انگریزی کی طرح یہ بھی رلی ہوئی زبان ہے ۔ اِسی سے بہتوں کا خاصکر یورپین کا خیال ہے ۔ کہ اس کی بھی کسی وقت انگریزی کی طرح ترقی ہوگی ۔

اُردو[۵۲] لٹریچر کے معنے عام طور پر مُسلمانی لٹریچر سمجھے جاتے ہیں ۔ کیونکہ گو کائستھ اور کشمیری پنڈتوں کی زبان بھی وُہی ہے مگر اُن کی تصنیفات کو مسلمان لٹریچر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ۔ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ لکھنؤ اور دہلی دو دار الصدور کے سوا دُوسرے مقامات کے مُسلمانوں کی تصنیفات بھی خالص اُردو کا درجہ نہیں پاتیں[۵۳] ۔ ان دو جگہ کے اُردو لکھنے والے ہی بے عیب اُردو کے چشمے سمجھے جاتے ہیں ۔ اُردو میں ہندو مصنفوں کی حالت ویسی ہی ہے جیسی انگریزی میں اُن لوگوں کی جو انگریز نہیں ہیں[۵۴] ۔ معلوم ہوتا ہے

---

[۵۱] ہماری رائے یہ ہے کہ نہ بیٹی کو ماں کے مخالف ہونا چاہیئے اور نہ ماں کو بیٹی کا خاتمہ کرنیکی فکر میں رہنا چاہیئے ۔ [۵۲] اسی غلطی سے تو ساری غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں ۔ [۵۳] اس خیال میں اب کچھ تبدیلی اور اصلاح ہوتی جاتی ہے ۔ [۵۴] اہل نظر کے نزدیک ایسا نہیں ۔ عوام کا کیا اعتبار ۔

کہ ایک ناول نویس کشمیری برہمن رتن ناتھ در کے سوا مسلمان لوگ کسی ہندو مصنف کی اُردو کو اُردو نہیں سمجھتے۔

قومی لٹریچر قوم کی زندگی پر پوری طرح منحصر ہے۔ وہ قومی زندگی کا سایہ ہوتا ہے۔ جس قوم کی اندرونی ترقی جتنی زیادہ ہوتی ہے اُس کی علمی ترقی بھی ویسی ہی اعلیٰ ہوتی ہے۔ اور اُس کا لٹریچر بھی ویسا ہی ترقی یافتہ ہوتا ہے۔

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ علمی ترقی میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اور اُس کے مسلمان باشندے تعلیم کی طرف سے بہت بے پروا ہیں۔ جب اُن کی تعلیم کی یہ حالت ہے تو دماغی یا اندرونی ترقی اُن میں کہاں سے آویگی؟ کچھ عرصہ تک تعلیم کسی قوم کی رگ رگ میں پیوست ہوئے بغیر اُس میں دماغی ترقی نہیں دکھائی دے سکتی۔

سال گذشتہ کی اُردو کتابوں کی رپورٹ دیکھنے سے ہی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اُردو علم ادب کی کیا حالت ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ۷۵۴ کتابیں شائع ہوئیں۔ اُن میں سے ۱۳۱ مشترکہ کاروبار کرنے والی کمپنیوں اور دیسی ریاستوں کی سالانہ رپورٹ یا قیمتوں کی فہرستیں ہیں۔ ۸۸ نظم کی کتابیں۔ بنگالی اڈیٹر نظم کے مارے بہت پریشان ہوتے ہیں وہ اس زیادتی کو سنکر تعجب کرینگے۔ ان صوبجات میں جو شخص دو چار اُردو فارسی کی کتابیں پڑھ جاتا ہے وہی شاعر ہو جاتا ہے۔ شاعری[۱] ادھر ایک طرح کا مرض ہے۔ خیریت اتنی ہی ہے کہ جتنی شاعری ہوتی ہے وہ سب چھپنے نہیں پاتی۔ اُس کا سواں حصہ بھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوتا ہے۔ ناٹک اور کہانیوں کی ۴۴ کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر اُن میں سے ایک بھی ناٹک یا ناول کہلانے کے لائق نہیں سب ردی میں پھینکنے کے لائق ہیں۔ باقی کتابیں زیادہ تر سکولوں میں پڑھائی جانے والی ہیں یا پرانی کتابیں پھر سے طبع ہوئی ہیں۔ اور جو کچھ ہیں وہ بھی قابل ذکر نہیں ہیں۔

---

[۱] افسوس کہ یہ اعتراض بہت کچھ درست ہے۔

مقررہ کتابوں کی جب یہ حالت ہے تب ماہواری رسالجات کی حالت اور بھی ردّی ہونی چاہیئے۔[1]

ماہوار اُردو رسائل کم نہیں ہیں۔ علم ادب۔ سائنس۔ مذہب۔ قوم۔ تجارت۔ زراعت وغیرہ سب کے ماہوار رسالجات ہیں۔ کمی کسی طرح کی نہیں ہے۔ صرف روئی کپڑے کی کمی ہے۔ اُردو ماہواری کاغذ معمولی طور سے دو قسم پر منقسم ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جنکو ہندو چلاتے ہیں دوسرے وہ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جنکو ہندو چلاتے ہیں اُنکی حالت بہت ہی خراب ہے[2]۔ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں[3] وہ کچھ اچھی حالت میں ہیں۔

کچھ ماہوار رسالے خاص خاص فرقوں کے ہیں۔ جیسے کشمیری درپن کشمیری پنڈتوں کا ہیرا اور آریہ درپن آریہ سماجیوں کا۔ آثار جدید[4]۔ اُردوئے مُعلّٰی[5] علیگڈھ کے مسلمانوں کے۔ یہ سب قومی اور مذہبی پرچے ہیں۔

[1] جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ ماہوار رسائل بحیثیت مجموعی آج کل اچھی حالت میں ہیں۔ [2] لکھنے والے نے شاید منشی نوبت رائے صاحب کے خدنگِ نظر اور منشی دیا نرائن نگم کے رسالہ زمانہ کو نہیں دیکھا۔ [3] اب یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کوئی خالص علمی رسالہ اردو میں محض ہندوؤں یا محض مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایڈیٹر ہندو ہو یا مسلمان۔ مضمون نگاروں میں دونوں جماعتوں کے قائم مقام موجود ہونے لگے ہیں۔ [4] آثار جدید۔ اس نام کا کوئی رسالہ ہم نے نہیں دیکھا۔ ہاں ایک رسالہ عصرِ جدید نکلتا ہے۔ مگر وہ علیگڈھ سے نہیں۔ میرٹھ سے۔ اور اپنے ڈھنگ کا نہایت ضروری اور مفید رسالہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہندی دان دوست نے جو اُردو میں بھی دیرینہ مشق رکھتے ہیں۔ اسی کے نام کو ہندی میں لکھا ہونے کی وجہ سے آثار جدید پڑھ لیا ہے اور باوجود واقف کار ہونے کے اتنا نہیں سوچا کہ "آثارِ جدید" ایک ناممکن خیال ہے۔ آثار کہتے ہیں پرانی چیزوں کی نشانیوں کو اور وہ جدید نہیں ہو سکتے۔ یہ اور اسی قسم کی غلطیاں ہیں جو اُردو الفاظ کے ناگری حروف میں ادا ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُردو والے اپنے پرانے رسمِ خط کو جاری رکھنے پر مجبور ہیں۔ نہ کہ کسی قسم کا تعصّب۔ حال میں ہمارے ہاں ایک معزز ہندی رسالے کے دفتر سے ایک پیکٹ آیا۔ اُس پر انگریزی میں لکھا تھا۔ مجنن۔ [5] اُردوئے معلّٰی۔ کچھ مسلمانوں سے مخصوص نہیں۔ علم ادب کا رسالہ ہے۔ اس لئے عام دلچسپی کی چیز ہے۔ مذہبی رسالوں کے ضمن میں تو بالکل نہیں آسکتا۔ کیا محض اس لئے کہ علیگڈھ سے نکلتا ہے۔ اسے قومی اور مذہبی کہہ دیا گیا ہے؟ اگر ایسا ہوا ہے تو "خوب کھوج خبر" رکھنے کا بیّن ثبوت ہے۔ (ایڈیٹر)۔

علم ادب کے جو دو چار پرچے ہیں اُن میں مخزن اور آزاد[ا] قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں لاہور سے نکلتے ہیں۔ آزاد کے ایڈیٹر ہندو بشن سہائے ہیں۔ موسم بسنت۔ سخن شیریں وغیرہ کی ڈھنگ کے دو دو ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے کے مضامین اور لودیانہ میں پانی کی کل کی ضرورت اور کوئل وغیرہ نظموں سے اس کے چالیس صفحے پُر رہتے ہیں اُس کی لمبائی چوڑائی ساہتیہ* کے موافق ہے۔ مخزن کی بھی ویسی ہی شکل ہے۔ اڈیٹر عبدالقادر بی۔اے ہیں۔ وُہ انگریزی ہفتہ وار اخبار ابزرور[۲] کے بھی اڈیٹر ہیں۔ حال میں بارسٹر ہونے اور ایڈیٹری کے متعلق ضروری باتوں سے واقف ہونے کے لئے ولایت گئے ہیں[۳]۔ یہ رسالہ غنیمت ہے۔ مگر تاہم بنگال کے تیسرے درجہ کے ماہوار رسالوں کی بھی برابر نہیں ہے۔ اس کے ۵۶ صفحوں میں ایسی کوئی چیز دیکھنے میں نہ آئی جس سے تلاش علمیت یا خوض عیاں ہوتی ہو۔

مسلمانوں کی تاریخی مشغولیت ایک زمانہ میں بہت کچھ ظاہر ہوئی تھی۔ اب بھی ہند کے کتنے ہی امیروں کے دفتروں میں کتنی ہی تاریخی کتابیں کاغذات قبالے وغیرہ دبے پڑے ہیں۔ وُہ بیشمار ہیں۔ اور باتوں میں ہاتھ نہ ڈال کر اگر مسلمان لوگ اپنے موجودہ لٹریچر کے ذریعہ ان سب باتوں کو ذرا تلاش و تفتیش کے ساتھ لکھنے کی کوشش کریں تو قوم اور مُلک کا بہت کچھ فایدہ ہوسکتا ہے۔ مگر افسوس ادھر اُنکی نظر ذرا بھی نہیں ہے۔

اِس مُلک کے تعلیم یافتہ مُسلمان جو کچھ لکھتے ہیں وُہ اُسی پُرانے زمانہ کے سکیٹر اور ٹیلر کا نمونہ ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر دلگداز نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے۔ مذکورہ بالا نمونہ پر لکھنے سے اُس کا بڑا نام ہوا تھا۔ مگر وُہ بھی بہت دن نہ چلا۔

---

[۱] جی ہاں۔ ان دونو رسالوں کا ایک ساتھ ذکر کرنے سے ہی سخن فہمی عالم بالا معلوم ہوگئی۔ اس کے بعد ظاہر ہے۔ جو وقعت اس قول کی ہوسکتی ہے۔ کہ یہ بنگالہ کے تیسرے درجہ کے رسالوں کے برابر بھی نہیں۔ افسوس کہ اس بارہ میں زیادہ لکھنا ہمارے اپنے مُنہ سے زیب نہیں دیتا۔ [۲] ابزرور ہفتہ میں دو دفعہ چھپتا ہے۔ [۳] ابھی گئے نہیں۔ جانے کو تھے۔ بعض اسباب سے رُک گئے۔ غالباً اس سال جائینگے۔

* بنگلہ زبان کا ایک ماہوار رسالہ جو کلکتہ سے شائع ہوتا ہے ۱۲

لٹریچر کے رسالجات زیادہ تر دو تین سال سے زیادہ عُمر کے نہیں ہیں۔ امداد اور ہمدردی کی کمی سے کوئی ٹھہرنے نہیں پاتا۔ صرف مخزن نے کسی طرح پنجسال[۵۱] پُورے کیے ہیں۔ خریداروں کی تعداد بھی شاید کسی کی دو سو[۵۲] سے زیادہ نہیں ہے۔

عورتوں کے لئے لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا۔ پہلے اُس میں مسلمان عورتیں بہت شوق سے لکھتی تھیں مگر اب اُس کا بھی حال اچھا نہیں[۵۳] ہے۔

خواہش تھی اُردو موجُودہ لٹریچر کا کچھ نمونہ دیتے مگر تلاش سے دینے کے لائق کچھ ملا نہیں ایسی کوئی بات اُردو علم ادب میں نہ ملی جو دلچسپ یا کچھ سکھانے والی ہو۔[۵۴]

جس اُردو کو "لنگوا فرنکا" کہ کر بہت فخر کیا جاتا ہے اُس کے ماہوار علم ادب کی یہ بُری حالت کیُوں ہے؟ سبب معلوم کرنے کے لئے بہت دُور جانا نہ ہوگا۔ لکھنے والوں پڑھنے والوں اور تنقید کی کمی اس کا سبب ہے۔ اسی سے زبان بھی چُست نہیں ہوتی ہے۔ اور نہ اس میں پھُرتی آتی ہے۔ خالی عبارت کی رنگینی سے کیا ہو سکتا ہے۔ کچھ خیال بھی ہونا چاہیے۔ تاریخ فلسفہ سائنس اور دوسرے ضروری ضروری علوم کی باتوں کو ادا کر دینے کی زبان میں طاقت ہونا چاہیے۔ یہ بات ابھی اُردو کو حاصل نہیں ہے۔ زبان کے حساب سے وُہ بہت نیچے درجہ میں ہے۔ بنگلہ۔ مرہٹی گجراتی وغیرہ ہندوستان کی دُوسری مشہور زبانوں کی برابر ہونے میں ابھی اُردو کو بہت کچھ تنقید تحریر اور وقت کی ضرورت ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اس طرف بالکل متوجہ نہیں ہیں۔ وُہ نہ اُردو لکھنے والے ہیں نہ پڑھنے والے اور نہ خریدار[۵۵] اگرچہ دو ایک ایم۔ اے۔ بی۔ اے۔ لوگوں کے نام لکھنے والوں

---

۵۱ ابھی تین سال پُورے کر کے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ ۵۲ ایک زمانہ میں یہ سچ تھا۔ مگر اب بالکل غلط ہے اور لکھنے والے کی ناواقفیت پر دال ہے۔ بہت سے اُردو رسالے پانچ پانچ چھ چھ سو کی اشاعت رکھتے ہیں اور مخزن کی اشاعت اب ایک ہزار سے اُوپر ہے۔ ۵۳ تہذیبِ نسواں برابر خاصہ اچھا چل رہا ہے۔ ۵۴ آپ کی منصف مزاجی سے تو یہ اُمید ہی تھی۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے قابل دوست بالکن صاحب نے کیونکر اس بیان کو بلا تصحیح رہنے دیا۔ کیا وہ بھی ان بنگالی مضمون نگار صاحب کے ہم خیال ہیں۔ ۵۵ ہمارے ایک ہزار خریداروں اور اس سے سہ چند یا چہار چند ناظرین میں کم از کم پچاس فیصدی انگریزی خواں ہیں۔ اور مضمون نگاروں میں کم از کم ساٹھ فیصدی +

میں نظر پڑنے لگے ہیں مگر وُہ سمندر میں ایک بوند کے موافق ہیں۔ اُردو کی ترقی میں ایک اَور بھی روک آپڑی ہے وُہ یہ ہے کہ صُوبجاتِ متحدہ آگرہ اور اودھ کے ہندوؤں میں جُوں جُوں قومی خیال پیدا ہوگا۔ تُوں تُوں وُہ اُردو کو چھوڑ کر ہندی کے طرفدار ہونگے۔ اُردو اور دیوناگری حروف کے مباحثہ سے یہ بات عیاں ہوچکی ہے۔ ابھی سے ہندوؤں کی لکھی عبارتوں میں سنسکرت الفاظ زیادہ ہونے لگے ہیں۔ اُردو کچھ دِن میں مسلمانوں ہی میں محدود ہوجائیگی۔ اور اُس کی ترقی بھی مسلمانوں کی قومی ترقی پر منحصر[51] ہوجائیگی"۔

مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ ایک بوڑھے تجربہ کار بنگالی عالم کی اس تنقید سے اُردو والوں کے کان کھُلیں گے۔ گو اس تحریر میں ایک آدھ[52] بات کسیقدر غلط ہے۔ مگر ایک بنگالی کا اُردو کی نسبت اس قدر واقفیت رکھنا ہزار آفرین کے قابل ہے۔ جس رسالہ میں یہ تنقید نکلی ہو وُہ الٰہ آباد سے شائع ہونے پر بھی کلکتہ میں طبع ہوتا ہے۔ ہزار ڈیڑھ ہزار بلکہ اُس سے زیادہ میلوں کے فاصلہ پر بیٹھ کر غیر زبان والوں کا اُردو کی طرف اتنا خیال رکھنا قابلِ غور ہے۔ ہمارے اُردو دان دوست کیا کہتے ہیں۔ کہ وُہ ہندی بھی نہیں سیکھ سکتے[53]؟

اگر نہیں سیکھ سکتے تو ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ وُہ اُردو کی خاطر خواہ ترقی بھی نہیں کرسکتے۔ بنگالی لوگ اُنکے موجودہ لٹریچر کے اعلےٰ حصّے کو اپنے لٹریچر کے مقابلہ میں تھرڈ کلاس بمشکل سمجھتے ہیں +

بال مکند گپتا (کلکتہ)

---

[51] ہم اسکے قائل نہیں۔ اور شوق سے اُس زمانہ کے منتظر ہیں۔ جب دونوں قومیں مل کر اپنے مشترکہ لٹریچر کی ترقی کی کوشش کرینگی۔ اور خوش ہیں کہ ایسی کوششوں کا آغاز ہوگیا ہے۔ [52] شاید ایک آدھ سے زیادہ۔ [53] باوجودیکہ بنگالی رسالے کی واقفیت عامہ میں کئی نقص نکلے ہیں اور جو نتائج اس واقفیت کی بنا پر ہمارے لائق دوست نے نکالے ہیں وہ بھی کسی قدر ناقص ہوگئے ہیں تاہم ہمیں انکی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اُردو کے ہوا خواہوں کو خواہ وُہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ اگر وہ اُردو لٹریچر کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہندی سیکھنے کے لئے وقت نکالنا چاہئے۔ ایسا کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ یہ جو ہمیں لکھا گیا تھا۔ کہ مَیں اگر ہندی لکھ سکتا تو معاوضہ میں آپکے اخبار کے لئے لکھ بھیجتا"۔ اس سے ایک امرِ واقعہ کا اظہار مقصود تھا۔ کہ اب تک کوئی موقعہ ناگری حروف سیکھنے کا نہیں ملا۔ نہ یہ کہ ہم اسے ایک لاینحل مشکل سمجھتے ہیں +

بحرِ ظلمات

خدا ہی جانتا ہے۔ جس رنج سے نظر اپریل کے مخزن کے لئے مسودات انتخاب کرتے وقت اس مضمون پر پڑی۔ یہ ہمارے مرحوم دوست سید شریف حسین صاحب کی یادگار ہے ع نوشتہ بماند سیاہ بر سفید۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے۔ کیا لائق آدمی موت کے بیرحم ہاتھ نے ہم سے قبل از وقت چھین لیا۔ علمِ جغرافیہ کی خشک معلومات کو دلچسپ بنانا انہیں کا کام تھا۔ اب ہم ایسے مضمون کس سے لکھوائینگے :-

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پھر عود کر آئے اور آجکل کے حکما بحر الکاہل میں اُس زمانہ کے معجزہ کو جو اسوقت رودِ نیل میں ہوا تھا اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ لیں جسکے باور کرنے میں انکو کلام ہے اور جسکی سائنس کی مدد سے انواع و اقسام کی تاویلیں کیجاتی ہیں۔ تو دُنیا بھر ایک ایسا حیرت انگیز اور موثر نظارہ دیکھیگی۔ جسکا مثل کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ کون ایسا سنگدل ہوگا جو اپنی دایۂ مشفقہ یا مادرِ مہربان کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر کہ اُسکے جسم میں بڑے بڑے کاری گھاؤ پڑے ہُوئے ہیں جنکا اندمال ممکن نہیں۔ آہ زخم بھی ایسے زخم کہ جنمیں سے پسلیاں اور تمام پنجر صاف صاف نظر آرہا ہے۔ ایک آہِ عالم سوز بھر کر اپنے آنسوؤں سے اُن زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے باز رہے۔ یہ سین عجب حیرت انگیز سین ہوگا کہیں پیشِ نظارہ مُہیب و پُر خطر غار ہونگے۔ جنکی تاریکی تاریکی گورِ گنہگاران پر خندہ زن ہوگی اور جن کے عمق دریافت کرنے میں طائرِ نگاہ خیرہ و خجل ہوگا۔ کہیں پہاڑ نظر آئینگے جو فرزندانِ ناخلف کی طرح اپنی مادرِ گرامی کے سینہ پر پاؤں گاڑے کھڑے ہونگے۔ الغرض ہماری نظروں کے سامنے پہاڑوں وادیوں سطحات مرتفع اور میدانوں کا ایک سلسلۂ نامتناہی اپنے دفتر کے اوراقِ ناخواندہ کھولدیگا۔ جسکی عظمت و شان پر دُنیائے بالا کے بڑا اعظم رشک

کھا ئینگے۔ بحر ظلمات جنوبی کا حال تو چنداں معلوم نہیں مگر آفرین ہے ہمت مردانہ پر ان انگریزوں اور امریکہ والوں کی جنہوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے شمالی حصے کے حالات دریافت کئے۔ بحر تحقیق کے ان بیباک شناوروں اور منچلے دل داروں نے چپہ چپہ سمندر کی پیمایش کر کے اس کے کل حالات حوالۂ قلم کر دیئے ہیں اور ایسے ایسے نادر نقشے تیار کئے ہیں جنکے خطوط کی کشش میں فصاحت لوٹتی ہے اور جنکی رنگ آمیزیوں پر بلاغت ہزار جان سے نثار ہوتی ہے۔

آؤ ہم بھی ذرا ان حالات پر نظر غائر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان میں کس قدر دلچسپی ہے۔ ظلمات کے شمالی بیسن میں نیو فونڈلینڈ سے لیکر آئرلینڈ تک ایک عظیم الشان سمندری میدان ہے۔ آئرلینڈ کے ساحل سے جانب غرب اس میدان کی ابتدا ہے۔ یہ میدان سمندر کی سطح سے دو سو گز نیچے واقع ہے۔ اسی سطح مرتفع پر جزائر برطانیہ واقع ہیں جسکی آب و ہوا پر اس سطح مرتفع کی آغوش شفقت نے ایک بین اثر ڈال رکھا ہے۔ جزائر برطانیہ اور آیسلینڈ کے ادھر سے سطح سمندر سے بہت نیچے ایک نہایت سرد پانی کی رَو بارہ مہینہ خط استوا کی طرف بہتی رہتی ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ $\frac{3}{4}$ میل کی گہرائی پر اس رَو میں اس قدر خنکی ہے کہ اُسکا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے دو درجہ نیچا رہتا ہے اسی سرد رَو کے مدمقابل ایک گرم رَو خط استوا سے قطبین کی طرف جاتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہ رَو سطح سمندر پر اپنا سفر طے کرتی ہے۔ اب تو شاید تمہاری سمجھ میں بھی آگیا ہوگا کہ اس سطح مرتفع کے کس قدر کثیر احسانات جزائر برطانیہ پر ہیں سرد رو کی تھپیڑیں خود کھاتی ہے اور اُسکی سرد مہری سے مادر مہربان کی طرح جزائر برطانیہ کو بچاتی ہے۔ ادھر خط استوا کی گرم رَو انکی ساحلوں کو نہلا کر اُنکی آب و ہوا کو خوشگوار و معتدل کرتی رہتی ہے۔

اس سطح مرتفع کے وسط سے ایک عظیم الشان سمندری ترا عظم جسکا دَور جنوبی امریکہ کے لگ بھگ ہے۔ جنوب کے سمت پھیلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور ایک مسافت بعیدہ طے کر کے

بعد ایک مسافرِ راہ گم کردہ کی طرح مغربی سمت کو ہو لیتا ہے یہی رقبہ بحر ظلمات شمالی کا وسطی بیسن کہلاتا ہے۔

اس وسطی بر اعظم کے دونوں پہلوؤں میں دو فراخ اور عمیق وادی واقع ہیں۔ جس قدر جنوب کی طرف چلتے جاؤگے یہ دونوں وادی ایک دوسرے سے قریب ہوتے جائینگے۔ یہانتک کہ جزائر غرب الہند اور کیپ ورڈ کے درمیان وسط بحر ظلمات میں یہ دونوں وادی دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح ملکر ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں وادیوں کی گہرائی میں اختلاف ہے۔ مغربی وادی زیادہ گہرا ہے۔ بحر ظلمات کا سب سے زیادہ عمیق حصہ اسی وادی میں نیویارک سے ۱۵۰۰ میل جانب شرق واقع ہے۔

آؤ ہم ذرا کی ذرا اس تعر تاریک کی سیر کریں جس سے زیادہ گہری شاید روئے زمین پر کوئی جگہ نہ ہوگی۔ العظمۃ للہ خیال کرتے ہوئے دم گھٹتا ہے۔ اس سیر کے لئے ہم کو سطح آب سے سات میل اترنا پڑیگا وہاں پہنچکر چاروں طرف عظیم الشان پہاڑ دکھائی دینگے۔ جنکی چوٹیاں گوش سحاب سے سرگوشیاں کرتی ہونگی۔ جنوب و مغرب کے طرف جزائر برمیوڈا اس اس قدر بلندی پر واقع ہونگے کہ کوہ ایلپس کی نردبان پر نصف کوہ اینڈیز کی نردبان لگائی جائے تب جاکر کہیں انکو پا پائیں گے۔ شمال و مشرق کی طرف جزائر ازورس سر بفلک دکھائی دینگے۔ اے ہمالیہ تیری عظمت اور تیری رفعت خاک میں مل گئی اے مونٹ بلینک تیری بلندی پر بحر اوکاہل کی پستی نے پانی پھیر دیا اگر خدا تجھ کو اٹھا کر اس جگہ رکھ دے تو تیری چوٹی کی تلاش میں ہم کو میلوں غوطہ لگانا پڑیگا تب جاکر کہیں ہاتھ آئیگی۔

یہ دونوں وادی نئی اور پرانی دنیا کی طرف بتدریج بلند ہوتے چلے گئے ہیں۔ مشرقی وادی بلند ہوتا ہوتا یورپ اور افریقہ کے مغربی ساحلوں سے بغلگیر ہوکر مڈیرا کیپ ورڈ اور جزائر کیزی کے بلند ساحلوں سے ہم آغوش ہوتا کوہ ٹنیریف کی چوٹی پر جا بوسہ دیتا ہے جو سمندر کی سطح سے قریباً سوا دو میل بلند ہے۔

محققینِ فرنگ نے تہِ بحرِ ظلمات کی تہ سے مٹی نکالکر خوردبین سے دیکھی اور معلوم کیا کہ اُس کی تہ پر بے شمار ننھے ننھے گھونگھے مکڑی کے جالے کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ ان میں ریت یا کنکر کا کوئی جُزو نہیں ملتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر ایک سناٹے کا عالم ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کرۂ ہوائی میں ایک خاص بلندی سے اُوپر سکون و محویت کا عالم ہے اُسی طرح سمندروں میں بھی ایک خاص گہرائی سے نیچے یہی کیفیت ہے۔ تہِ عُمق اُن سمندری طوفانوں اور تلاطمِ امواج سے بالکل ناآشنا ہے جو ہر سال ہزاروں ناخداؤں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

شاید یہ ننھے ننھے گھونگے اور سیپ وہ ننھی ننھی مخلوقات ہو جو سمندر کی تہ کو آباد کیے ہوئے ہے۔ وہی انکا مولد ہے۔ اور وہی انکا مسکن اور آخر کار وہی ایک دن انکا مزار بنجاتا ہے۔ اسی ننھی ننھی مخلوقات سے پہاڑوں کے تودے اور میدانوں کی زمینیں بنجاتی ہیں۔ زلزلے ان میدانوں اور پہاڑوں کو قعرِ تاریک سے اُٹھا کر سطحِ آب سے بلند کر دیتے ہیں اور ایک زمانہ میں وہ انسان کا مسکن ہو جاتے ہیں۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیرِ قدمت ہزار جان است

سیّد شریف حسین بی۔ اے (مرحوم)

زرتشت نامہ۔ مولوی خلیل الرحمن صاحب کی قابلیت علمی اور تلاش کا نتیجہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں زرتشت کے حالات اور اس کے مذہب کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے سرمایہ کے لئے ایسی کتابیں باعثِ ناز ہیں۔ خدا بھلا کرے مطبع رفاہ عام لاہور کے علم دوست مالک مولوی سیّد ممتاز علی صاحب کا جنکی توجہ ہمیشہ اردو علم ادب کے ذخیرہ کے بڑھانے کی طرف مبذول رہتی ہے اور جنکے ہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ (قیمت عمر)

سوانح عمری

(نمبر ۲)

ایک مقدس قول ہے۔ "اِنّ الحسنات یُذھبن السّیّئات" یعنے نیکیاں برائیوں کو لیجاتی ہیں۔ اِس اصول کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ بعض خاص انسانوں کی خاص خوبیاں باوجود قلیل المقدار ہونے کے بھی کثیر المقدار برائیوں پر فائق اور برتر ہیں۔ ایک نیکی بہت سی برائیوں کا مقابلہ کرتی اور اپنی فضیلت دکھاتی ہے۔ اِس اصول کو اگر صحیح مانا جاوے تو اکثر سوانح عمریاں عجائبات اور تجلّیات سے خالی نہ ہونگی۔

گو کسی لائف میں متوّہ بالشان واقعات سوائے خاص خاص حالات یا کسی ایک واقعہ کے نہ پائے جاتے ہوں اور ایک خاص شخص کی ساری زندگی کو ہی غیر معمولی زندگی نہ کہا جا سکتا ہو۔ لیکن چند خاص واقعات اور کیفیات یا تجلّیات کا ایک شخص کی ذات میں پایا جانا جو اُسکو بلحاظ اپنی خصوصیات کے اوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سوانح عمری کے غیر معمولی ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ مختلف اشخاص اور ناموروں کی سوانح عمریوں کے دیکھنے سے اس رائے کا قائم کرنا مشکل نہیں ہے۔ کہ بڑے بڑے ناموروں کی سوانح عمریوں میں بھی چند ہی خاص اور موٹے موٹے واقعات ہوا کرتے ہیں۔ باقی دیگر چھوٹے موٹے واقعات کو ضمنی طور پر ایک سلسلے میں درج کیا جاتا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ نقادنگاہیں خاص خاص واقعات پر ہی پڑتی ہیں۔ اور

ﮯ اس مضمون کا پہلا حصہ گذشتہ فروری کے رسالے میں درج ہو چکا ہے۔ سلسلہ کے لئے وہ پرچہ ملاحظہ ہو۔ گو جن صاحبان کے سامنے وہ پرچہ نہ ہو۔ اُنکے لئے بھی یہ مضمون دلچسپی سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس خوبی سے لکھا گیا ہے کہ جو شخص صرف اسے پڑھے۔ اُسے بھی اس کے عمدہ خیالات سے فائدہ ہوگا۔ (ایڈیٹر)

دُور بین لوگ ممیّز سانحات کو ہی دیکھتے ہیں۔ لیکن جو باتیں ایک سلسلے میں ضمناً بھی معمولاً لکھی جاتی ہیں۔ اکثر طبیعتیں اُن کو بھی اخذ کرتی ہیں۔ اگر اعلےٰ قوتیں اخذ کرنے میں بھی اعلےٰ ہیں۔ تو متوسط قوتیں متوسط درجے پر آخذ ہیں۔ یہ شرط لگانا کہ ہر ایک سوانح عمری میں سرے سے لیکر اخیر تک چیدہ چیدہ واقعات اور منتخب سانحات ہی ہوں سوانح عمری کو محدود کر دینا ہے۔ یہ منشا نہیں کہ کل رطب ویابس ہی بھر دیا جاوے۔ لیکن یہ بھی مدّعا نہیں کہ انتخاب کرتے کرتے محض چند واقعات کو ہی باقی رہنے دیا جاوے۔

بے شک سوانح عمریوں میں واقعات کا انتخاب ایک مقدم کام ہے۔ لیکن ایک بڑے واقعہ کے سلسلے کے لحاظ سے دلچسپ معمولی واقعات بھی بلحاظ اپنی کسی خصوصیت کے درج کئے جاتے ہیں۔ اگر سلسلہ توڑ کر انہیں چھوڑ دیا جائے تو بڑے بڑے واقعات کا مزہ بھی جاتا رہتا ہے۔ اکثر سوانح عمریوں میں ایسے سانحات بھی درج ہیں جو در اصل غیر معمولی نہیں ہیں۔ مگر چونکہ ان میں ایک خصوصیت ہے۔ اسواسطے انہیں درج کیا جاتا ہے۔

قیصرہ ہند آنجہانی کی لائف میں اس واقعہ کو اکثر لیا گیا ہے۔ کہ ملکہ معظمہ ایک گاؤں میں گئیں اور ایک بوڑھی عورت کے ساتھ نہایت ہی خوش خلقی اور مروّت سے پیش آئیں اور اُسے کوئی تحفہ بھی عطا کیا یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ دُنیا میں صدہا لوگوں سے ایسے واقعات روزمرہ وقوع میں آتے ہیں کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن جب باعتبار حیثیت سلطنت اور قُدرتِ حکومت اسکو دیکھا جاوے تو اس میں بھی ایک خصوصیت نکلتی ہے

بعض اوقات دُنیا میں عام اصُولوں کو چھوڑ کر نسبتی معیار سے نیکیوں اور بدیوں کا وزن کیا جاتا ہے۔ اور اس معیار سے ایک فعل جو ایک خاص آدمی کرتا ہے بمقابلہ ایک عام آدمی کے یا تو زیادہ تر توجہ کے قابل ہوجاتا ہے۔ اور یا اس پر کوئی خیال ہی نہیں کرتا۔

بقول ایک عربی سوانح نویس کے سوانح عمری کا لکھنا ایک سراپا کہنا ہے۔ اگر سراپا نویس صرف سر ہی کا ذکر کرکے باقی اعضا چھوڑ دے تو اُسے سراپا نہیں کہا جاوے گا جیسے ایک سراپا میں سلسلے کے لحاظ سے مناسب دائرے میں چلنا پڑتا ہے۔ ایسے ہی سوانح عُمری کے لکھنے میں غیر معمولی اور بعض معمولی دلچسپ واقعات کو بھی بلحاظ نسبتی معیار کے لیا جاتا ہے۔ ہر سوانح عُمری کے تین حصے ہوتے ہیں۔

ا۔ خاص اور بڑے بڑے واقعات۔

ب۔ معمولی اور عام سانحات باعتبار نسبتی معیار۔

ج۔ نیک اور بد حالات۔

نکتہ چین نگاہیں داغوں اور دھبّوں کو ایک سہولت سے پالیتی ہیں اور انکی طبیعت اُکتا جاتی ہے اور دق ہو کر ایک سوانح عُمری کا مطالعہ چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ اُن طبائع کا کام ہے جو جلد باز اور کم اندیش ہیں۔ انجام بین اور دُور اندیش طبیعتیں جانتی ہیں کہ کوئی انسان انسان ہو کر اضطراری سہو و خطا اور لغزش سے خالی نہیں۔ اور ہر ایک سہو و خطا بلحاظ حالات کے تاویل کیا جاسکتا ہے۔ اور ایک خاص انسان کی چند معمولی یا ابتدائی غلطیاں اس کی محترم نیکیوں اور خوبیوں سے وزن میں زیادہ نہیں ہیں۔

ابن خلدون اپنی ایک برگزیدہ تصنیف میں ایک موقعہ پر لکھتا ہے:۔

لوگ بدیوں کے انتخاب میں ایسے جلد باز ہیں کہ اچھائیوں اور نیکیوں کو باوجود جاننے کے بھول ہی جاتے ہیں۔ نیکی کا وزن بُرائی کے وزن سے کم خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ نیکی کرنا بہ نسبت بُرائی کرنے کے زیادہ تر مشکل ہے۔ جو عمل مشکل رکھتا ہے قاعدے کے رُو سے اُسکا وزن زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ بیشک بہت کم لوگ نیکیوں اور بُرائیوں کا منصفانہ موازنہ کرتے ہیں۔ اور اس غلطی سے وُہ احقاق حق سے رہ جاتے ہیں۔ سوانح عُمریاں کن لوگوں کی لکھی جاتی ہیں۔ جو

دوسروں کی نگاہوں میں ایک عجیب الفطرت انسان ہوں اور انکی زندگی کے چند واقعات انہیں اوروں کی زندگیوں سے بہ لحاظ غیر معمولی ہونے کے ممتاز کرتے ہوں۔ ان حالات میں ہمیں سب سے پہلے انہی خاص واقعات کو دیکھنا چاہیئے۔ جو ایک شخص کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ جو واقعات معمولی ہیں۔ انہیں معمولی نگاہوں سے دیکھا جاوے مگر انہیں نظرانداز کرنا درست نہیں۔ مولانا حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں۔

"۱۸۴۲ء میں جبکہ دہلی کالج ایک نئے اصول پر قائم کیا گیا تو مرزا غالب کو بھی مسٹر ٹامسن سیکرٹیری گورنمنٹ ہند نے بلایا اور چاہا کہ انہیں مدرس فارسی مقرر کیا جائے۔ مرزا صاحب پالکی میں سوار ہو کر سکرٹری صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ مگر صاحب سکرٹری اطلاع پانے پر بھی باہر نہ آئے۔ جب مرزا صاحب باوجود انتظار کے بھی اندر نہ گئے تو صاحب بہادر آخر باہر آئے۔ اور مرزا صاحب کا عندیہ معلوم کر کے کہا جب آپ دربار میں آوینگے تو آپ کا بدستورِ معمول استقبال کیا جاویگا۔ لیکن اسوقت تو آپ نوکری کے لئے آئے ہیں وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اسواسطے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو۔ نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب بہادر نے کہا میں قاعدے سے مجبور ہوں۔ اس پر مرزا صاحب یہ کہہ کر چلے آئے۔ مجھے خدمت سے معاف رکھا جائے۔"

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ لیکن باوجود ضرورت اور تنگ حالی کے مرزا صاحب کا ایسا جواب دینا اور اپنی عزت آپ کرنا ایک خاص واقعہ تھا۔ اور اس خیال سے بھی کہ ہمارے اسلاف اور بزرگانِ قوم کو اپنی عزت آپ کرنے کا یہانتک خیال رہتا تھا قابلِ ذکر کرنے کے تھا۔

فردوسی کی لائف میں شاہنامہ کے واسطے سلطان محمود کی پہلی دلجوئی اور پھر پچھلا طریق عمل اور اُس پر فردوسی کی بے اعتنائی اور چلے جانا اور پھر محمود کا پریشان ہو کر زرِ موعودہ کا فردوسی کے پاس بھیجنا ایک عجب اخلاقی سانحہ ہے۔ جس سے دونو کی دلی حالت اور کمزوری اور استقلال کی زبردست شہادت ملتی ہے اور پڑھنے والا انسان اُس سے ایک علمی سبق لے سکتا ہے۔ گو دنیا میں ایسے ایسے واقعات روز گزرتے ہیں۔ مگر ہر واقعہ میں محمود اور فردوسی تو نہیں ہوتا۔

جو شخص بمقابلہ رُتبے اور ابنائے جنس کے اپنی زندگی کو خاص اور دلچسپ اور غیر معمولی چند واقعات سے ممتاز کرتا ہے وُہ مُلک اور قوم پر احسانِ عظیم کرتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُس کی چند معمولی اغلاط سے متاثر ہو کر خوبیوں سے بھی انکار اور کفرانِ نعمت کیا جاوے۔

ایک دلسوز شخص کا کسی دُکھیا کی پُر درد حالت پر آنسو بہانا باوجود اس کے کہ وُہ اپنی ذات میں چند لغزشیں بھی رکھتا ہے۔ ایک درد رسیدہ شخص کے واسطے بہر حال موجبِ شکریہ ہے۔ جو شخص ایک شارع عام میں ایک سایہ دار درخت لگاتا ہے۔ جس سے آیند روند اور رہ گذروں کو گرمی کے موسم میں آرام ملتا ہے۔ وہ بہر حال شکریے کے قابل ہے۔ گو وُہ اپنی ذات میں چند سُقم بھی رکھتا ہو۔

اگر کسی شخص کی زندگی ہمیں عُمدہ اور نیک سبق دیتی ہے اور ہم اُس سے کوئی غیر معمولی سبق لے سکتے ہیں تو اُسکی چند لغزشوں کی وجہ سے اُسے نگاہوں سے گرا دینا انصاف کے خلاف ہے۔

ہر ایک زندگی دُوسروں کو ختم ہو کر سبق دیتی ہے۔ ہر سانحہ دُنیا میں وجُود پذیر ہو کر دُوسرے ابنائے جنس کے لئے رہنما بنتا ہے۔ مختلف سوانح سے ایک شخص کے چند سانحات کو سلسلہ وار جمع کر لینے کا نام ہی سوانح عُمری ہے۔ بعض لوگ معترض ہیں کہ کیوں ایک شخص کی سوانح عُمری میں اُس کی بعض لغزشیں لکھی جاتی ہیں اور کیوں اُس کی چند کمزوریوں کا نوٹس لیا گیا ہے اور بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ سوانح عُمری اُسکو کہا جا سکتا ہے کہ جس میں

نیکیوں کے مقابلے میں بُرائیوں کا نقشہ بھی دکھایا گیا ہو۔ جس سوانح عُمری میں بُرائیاں نہ ہوں وُہ تو مدح سرائی ہو۔ یہ دونوں قصّے نتائج کے اعتبار سے کسی قدر مہمل ہیں۔ ایسی نکتہ چینیاں اسی حالت میں کیجاتی ہیں کہ جب تک سوانح عمری کے اغراض سے ناواقفیت ہو۔ سوانح عُمری کیوں لکھی جاتی ہو؟ اسواسطے کہ اور لوگ ایک ممتاز شخص اور خاص آدمی کے خاص اور برگزیدہ حالات اور کوائف سے متأثر ہوکر خود بھی ویسا بننے کی کوشش کریں۔ اس امر کے اثبات کے واسطے کہ انسان اپنے مساعی اور حوصلہ وہمّت سے ایسے ایسے مدارج طے کرسکتا ہے اور اُس کی طبیعت پُر بزدلی کم ہمّتی استقلال کہاں تک مؤثر ہیں۔ اِسواسطے کہ دُنیا میں رہکر ایسی ایسی ضرورتیں اور ایسی ایسی خاصیتیں انسان کو پیش آسکتی ہیں۔ اِسواسطے کہ فلاں مُلک اور فلاں قوم میں اِس اِس قماش کے لوگ گزرے ہیں۔ اِس غرض کے لئے کہ وُہ کونسی ایک ممتاز اور اعلیٰ طاقت ہو جو انسان کے ارادوں میں ایک تغیرعظیم ڈالتی اور اُس کے دل ودماغ کو اُن باتوں اور اُن واقعات سے آشنا کرتی ہے جو خود اُس کے بھی خواب وخیال میں نہیں تھے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جس شخص کی سوانح عُمری لکھی جاتی ہے وہ ایک طرح سے دُنیا بھر میں اپنے حالات کے اعتبار سے نشانہ بنجاتا ہے۔

اگر کسی سوانح عُمری کے لکھنے والا مُطلقاً کمزوریوں کو چھوڑ ہی دیوے اور اُن کا ذکر تک نہ کرے تو یہ بھی ایک نُقص ہے۔ نکتہ چینی سے باقی واقعات اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتے ہیں۔

جو نکتہ چینی باحفاظ فضائل کیجاتی ہے وُہ دراصل فضائل کا صدقہ ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کل بُرائیوں اور کل لغزشوں یا کمزوریوں کو ہی دکھانا چاہیئے وُہ بھی غلطی پر ہیں۔ نیکی کے واسطے توہم دلائل لاسکتے ہیں۔ لیکن بُرائی کے واسطے ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ شاید اضطراری طور پر سرزد ہوئی ہو۔ یا اس میں مبالغہ ہی کیا گیا ہو اس لئے ضروری نہیں ہے۔ کہ وُہ بُرائیاں اور وُہ کمزوریاں بھی حوالہ قلم ہوں۔ جو اس قبیل

سے ہوں۔ اور اگر ایسی بُرائیوں یا کمزوریوں کو لکھا جاوے تو سوانح عمری کا اثر اور لطف جاتا رہیگا۔ طبیعتیں یکساں نہیں ہیں۔ ان کا اکثر حصّہ بجائے خود کمزور ہے۔

جس شخص کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے۔ وہ

ا۔ ایک خاص یا ممتاز شخص ہوتا ہے۔ بالحاظ درجہ کے یا بلحاظ اپنے خاص واقعات کے۔

ب۔ اُس کے خیال تقریبًا سندی ہیں یا بطور سند کے لئے جاتے ہیں۔

ج۔ لوگ اُنہیں خاص نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ خواہ بلحاظ کسی ذاتی خوبی یا ذاتی لطافت اور عمدگی کے۔ کمزور طبیعتیں بُرائیوں اور کمزوریوں کو بھی ایک مستند لائف میں لکھا دیکھ کر سند میں لینگی۔ اور اس سے اخلاق پر سخت بُرا اثر پڑیگا۔ جو اغراض سوانح عمری کے صریح خلاف ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی ابتدائی عُمر میں بدروش کذّاب وغیرہ تھا اور بعد میں وُہ ایک مشہور نامور ریفارمر بن گیا۔ اگر ایک سوانح نویس انہیں سے چند اضطراری بُرائیوں کو حوالۂ قلم نہیں کرتا ہے یا عام طور پر لکھ جاتا ہے۔ تو اس کی سوانح عمری کو نامکمل نہیں کہا جاویگا۔ سوانح عمری اسواسطے نہیں لکھی جاتی کہ لوگوں کو ڈاکو۔ چور۔ کذّاب وغیرہ بنایا جاوے۔ اگر یہ اغراض ہیں تو البتّہ پھر ہر ایک بُرائی یا کمزوری کو پوست کندہ لکھنا چاہئے۔ اور اگر سوانح عمری سے اچھے فضائل کا اظہار یا پیدا کرنا ہے تو پھر ہر ایک ایسی بُرائی اور فاش بدی کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ جو اضطراری ہے اور دُوسروں پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ صرف وہی کمزوریاں اور غلطیاں بیان کیجاسکتی ہیں جن کے بیان اور تحریر سے ناظرین اور سامعین پر بُرا اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسی کمزوریاں بھی نہیں پیدا ہونی چاہئیں۔

ابن رشد ایک دفعہ ایک مجمع میں اپنے ایک خاص شاگرد کے اوصاف بیان کر رہا تھا ایک دُوسرے شاگرد نے بڑھ کر کہا "وُہ تو شرابی بھی تھا"۔ ابن رشد نے جواب میں کہا "میں اس کے وہ اوصاف بیان کرتا ہُوں جو قابل اخذ ہیں۔ اگر میخواری قابل تقلید

ہوتی تو میں اُسے بھی بیان کرتا"۔

جو لوگ نیکی پسند ہیں وہ نیکیاں ہی سنتے ہیں۔ بدیوں پر اُنکی نظر نہیں پڑتی۔ ایک فلاسفر سے ایک دفعہ پوچھا گیا تھا کہ کون سی سوانح عمریاں یا کونسے واقعاتِ زندگی قابل پڑھنے کے ہیں۔ فلاسفر نے جواب میں کہا "کوئی سوانح عمری محض اس وجہ سے قابل احترام نہیں ہے کہ اسکا ہیرو خاص طور پر ذی رتبہ یا اعلےٰ درجے پر ہونے کی وجہ سے مشہور اور معروف تھا۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اُس کے واقعاتِ زندگی ایک دوسرے سے ممتاز اور سبق دہ ہیں۔ اور پہلے واقعات اور پچھلے کوائف میں ایک ایسا نمایاں فرق ہے جو ایسے شخص کی ساری زندگی کو دلچسپ اور حیرت خیز یا کچھ نہ کچھ غیر معمولی بناتا ہے اور دوسرے افراد کو اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ انسانی زندگی کے متواج سمندر میں کس کس قسم کی موجیں اور جوار بھاٹا آتے ہیں۔ اور کشتیٔ زندگی کو کس کس ساحلِ مقصود اور کنارۂ نامحدود پر لیجاتے اور لگاتے ہیں"۔

واقعی اکثر بڑے بڑے آدمیوں کی زندگیاں بلحاظ اُن کے ابتدائی اور مسلّمہ درجہ کے ضرور اس قابل ہیں کہ دُوسرے افراد اُنکی طرف توجہ کریں لیکن اُن میں کوئی ایسی دلچسپی اور کشش نہیں ہوتی جو غیر معمولی اور حیرت خیز واقعات کے اعتبار سے انسان کو اپنی طرف متوجہ کرے۔

تمام زندگیوں میں وُہی زندگیاں دلچسپی اور انتخاب کے قابل ہیں جو اپنے ابتدائی اور آخری حالات اور سانحات کے لحاظ سے اپنی ذات میں مقناطیسی جوہر رکھتی ہیں۔ اور جن سے انسان کو قدرتی تصرفات اور انسانی استقلال کا سبق ملتا ہے۔

بعض متوسط درجے یا ادنےٰ رُتبے کے انسانوں کی زندگیاں ایسی غیر معمولی اور حیرت خیز ہیں کہ بڑے بڑے گھرانوں میں بھی اُنکا ثانی نہیں ملتا۔ اُن سے بیراز کھلتا ہے اور اس پر روشنی پڑتی ہے کہ قدرت نے دُنیا کے اسفل پردوں لو نامعلوم

وجہوں میں بھی کس کس قسم کے حیران کرنے والے دل و دماغ پیدا کئے ہیں۔ ایسے خاص یا ممتاز دماغوں سے اس اس قسم کی شعاعیں اور کرنیں نکلتی ہیں اور انکی ذوات میں اس قسم کا تحمل تدبّر حزم و احتیاط پایا جاتا ہے۔ جس کا بڑے بڑے سندی دماغوں میں عُشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔

کسی خاص شخص کا مذہب اور اُس کی زندگی کے حالات اُسکا فلسفہ اُسکی تصنیفات اُس کے لطائف اُس کے مصائب اُس کی کامیابیاں اس کی حرفت اُس کی ہنرمندی اُس کی لغزشیں ہمیں اس بات کی خبر دیتی ہیں کہ اُس نے کیونکر زندگی بسر کی اور اُس پر کیا کچھ گذری اور اُس کی طبیعت۔ استقلال۔ ہمّت اور حوصلے کا کیا کچھ حال رہا۔ اُن کوائف سے صرف اُسی خاص شخص کے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بھی کہ اُس زمانے میں اُس قوم کے کیا خیالات اور حالات تھے۔ جن میں سے وہ شخص بھی تھا۔ جب تک ہم کسی شخص یا اشخاص یا افرادِ قوم کی حالتِ ماضیہ کو دریافت نہ کرلیں۔ اُسوقت تک کوئی موجودہ حالت بھی ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہی ایک ضرورت ہے جو ہمیں علمی خیال سے تاریخ اور سوانح عُمری کی طرف بالخصوص رجوع دلاتی ہے*

مرزا سُلطان احمد

گرمی

کیسی شدت کی ہی گرمی - یا الٰہی الاماں
اور تپش کیسی کہ ہی جاندار جس سے نیم جاں

کس غضب کی روز و شب ہوتی ہی بارش آگ کی
پھٹ گیا ہی غالباً کوئی پہاڑ آتش فشاں

پانی پیتے پیتے استسقا نہ ہو جائے کہیں
العطش ہی ہر بشر کے آج کل وردِ زباں

حشر کے دن ہوگی اس سے بھی زیادہ کیا تپش
اس سے بھی بڑھ کر کے کیا جاں سوز ہوگا وہ سماں

انقلاب آیا عناصر میں ہے شاید آج کل
یا سوا نیزہ پہ سورج آگیا ہے - ناگہاں

سیر کہسار

دُنیا کا کوئی جغرافیہ نہیں بتا سکتا کہ پہاڑوں کا حیرت انگیز سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہنچ رہا ہے۔ عرب کے شعرا رجیم لبنان دقطن کو اپنے قلم کے جولانگاہ بنا رہے ہیں۔ اور ہم ہمالہ اور شملہ کے خوشنما مناظر سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ مگر اس عظیم الشان سلسلہ کی ندرت بتا رہی ہے کہ ان اجسام محیط کا قبضہ کائنات کے غیر متناہی حدود تک ہے اور ایک زبردست قدرت نے یہ دلفریب (اگزبیش) دکھایا ہے۔ اِس لئے چشم بصیرت کو رنگارنگ شاہدوں میں کامیابی حاصل ہے۔ صرف یہی نہیں کہ پہاڑ موالید ثلاثہ کے معدن ہیں۔ یا آب خوشگوار کے رُوح افزا چشمے یا گلہائے خوشرنگ وشاداب کے دلفریب مرقعے۔ اس کے علاوہ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر نیچر کی نیرنگیاں دلاویز و تعجب ناک سبزے دکھاتی ہیں ۔ جہاں سبزہ کا فرش زمردیں نیلگون آسمان کا پرتو نظر آتا ہے۔ وہاں چھوٹے چھوٹے مختلف اللّون واوضاع پھولوں نے ان رُومی قالینوں پر گلکاریاں دکھائی ہیں۔ شعرائے نازک خیال قوّتِ متخیلہ کی مدد سے اور مصوّران سحر کار قوت مصوّرہ کے معلومات سے کیسی ہی مدد لیں مگر اس منظر کا اثر کامل صرف مشاہدہ ہی پر منحصر ہے اور یہی مشاہدات اس سچّے فلسفہ قدرت کی شہادتِ عینی ہیں۔ میری آنکھوں نے یہ تماشا دیکھا ہے جو نیچر کی قدرتِ کاملہ کا نمونہ ہے۔ میں نے اکثر اُن چوٹیوں کی سیر کی ہے جہاں گلہائے رنگارنگ کی بوقلمونی سے رنگینیٔ خیالات کا سبق ملتا ہے۔ جہاں مُرغانِ خوش الحان کے اقسام متنوعہ اپنے خالق حقیقی کی حمد وثنا میں زمزمہ سنجی کرتے ہیں۔ اور جہاں قطار در قطار درختوں کا سلسلہ قلّہ کوہ سے دامنِ صحرا تک ایک باقاعدہ لشکر کی طرح صف بستہ نشیب کی جانب اُترتا چلا جاتا ہے۔ اور جہاں رُوح افزا چشموں کی روانی بربط وسرود کی سُریلی آوازوں کو بیقدر بناتی ہے۔ اور جہاں آفتاب کی آخری

شعاعیں کسی حسین معشوق کے ڈھلتے ہوئے جوبن کی طرح الوداع کہتی ہیں۔ جہاں ابر کے مختلف الاوضاع ٹکڑے شفق کے ارغوانی رنگ میں غوطے کھا کھا کر نکھرتے ہیں۔ اِس موالید ثلثہ کے معدن میں بہت سے (کیمکل) ذخیرے بھی موجود ہیں جنکو ناواقف انسان ناچیز نباتات سمجھکر بے دردی سے پامال کرتے ہیں۔ یہی اجسام حجری اپنے سینوں میں اجرام بیش بہا کا خزانہ چھپائے ہوتے ہیں۔

جس طرح ہم اپنے مسکونہ مکانات کی آرائش کو ایک خاص وقت پر جدت پسند طبیعت کے اقتضا کے موافق بدلتے رہتے ہیں یا حسب موقع ترمیم کرتے ہیں۔ اسی طرح قدرت کا زبردست ہاتھ ان مقاموں کی ترمیم و تجدید میں مصروف ہے۔ اور اس تراش خراش کے لئے پرہیبت آلات سے کام لیتا ہے۔ بجلیاں گر گر کر علم ریاضی کے اشکال مختلفہ کا نمونہ دکھاتی ہیں۔ پہاڑ کا کوئی زاویہ قائمہ منفرجہ بنجاتا ہے۔ اور کوئی شکل مستطیل منحرف الاضلاع ہو جاتی ہے۔

زلزلہ خوفناک گھاٹیوں کی پُرہول غاروں کو وزنی پتھروں میں پاٹ کر مسطح کر دیتا ہے یا یُوں کہئے کہ سطحہ مقعر کو محدب بنا دیتا ہے۔

طُوفانی تہلکۂ عظیم کی روک تھام کو پہاڑوں کی قدرتی دیواریں قلعہ[۱] دربند اور حصین ذوالقرنین سے زیادہ مستحکم و استوار ہیں۔ جو دیوار فضل یا سدّ عقبہ[۲] بن یحییٰ برمکی کی طرح سینہ سپر ہیں۔ یہی وُہ مقام ہے جہاں نظامِ ارضی و سماوی میں (کمپٹیشن) ہوتا ہے۔ اجرام فلکی کے نورانی جسم مادہ حسن کے پھیلاؤ کے لئے پہاڑی سطحوں کو ایک عالی ظرف مرکز سمجھتے ہیں۔ جہاں خوبصورت چاند کی دلفریب روشنی پتھروں کے غیر مسلسل زینوں کے ذریعہ سے دامنِ صحرا تک اٹھکھیلیاں کرتی اُترتی چلی جاتی ہے۔ آفتاب کا گُرد نورانی جب اپنی تمام قوت صرف کرنے کے بعد قریب شام پہاڑ کی گھاٹیوں میں داخل ہوتا ہے (قلّۂ کوہ سے دیکھنے والے کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اس پہاڑ میں غروب ہو رہا ہے) تو اُس کے

[۱] تقویم البلدان۔ [۲] مقدمہ ابن خلدون۔

ٹمٹماتے ہوئے چہرہ کی ٹھنڈی شعاعیں جھٹپٹے وقت کے اُٹھنے والے بخاراتِ ارضی میں مخل ہوکر عجیب عجیب اشکال کا خوفناک نظارہ پیش کرتی ہیں۔ میں نے سمندر کے بیچ میں ایک پہاڑ پر قریبِ شام یہ تماشا بچشم خود دیکھا ہے۔ کہ حدِ نظر کے ایک معتدبہ فاصلہ پر اجسامِ بخاری نے بلند ہوکر ایک شکل ہیولانی پیدا کی۔ جو رفتہ رفتہ مجسّم نظر آنے لگی۔ اب خواہ اس حسن مشاہدہ کو خلّاقیٔ واہمہ تصوّر کرو یا قدرتِ قوّتِ متخیلہ۔ وُہ انقلاب و حوادث جنکا بیان ہم اُوپر کر چکے ہیں بغیر علل و اسباب ظہور پذیر نہیں ہو سکتے اور ترتیب اسباب کے لئے کسی سبب کی ضرورت ہے۔ پس یہ خیالات منّزکی ذاتِ وحدانیت کی جانب رجوع دلانے والے ہیں اور بیشک یہ نظارے ایک پاک ہستی قدیم کی الوہیّت کی دلیل مدّل ہیں۔ اور کتاب مقدّس اس دلیل پر شاہد ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ دیکھو ان پہاڑوں میں مخلوقاتِ عالم کے لئے سامانِ زندگی فراہم ہے۔ وَجَعَلْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِھِمْ اور دوسری آیۂ پاک میں کتاب مقدّس آسمانی کا اشارہ اس اجمال کی تفصیل کر رہا ہے۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ۔ ممکن ہے کہ ایک فقیر گرسنہ بستی اور آبادیوں میں دریوزہ گری کرے۔ اور اس کی آواز کسی خداترس کے کان تک نہ جائے اور ایک وقت محدود تک قوت نہ حاصل ہونے کی وجہ سے بھُوک کا جاں گسل صدمہ اس غریب کو ہلاکت کی خوفناک منزل تک پہنچا دے۔ مگر کوہستان کا دسترخوان وسیع ہمیشہ غربت نصیب حاجتمندوں کے لئے بے روک ٹوک بچھا ہوا ہے اور اجسام حجریہ میں نشوونما پانے والے درختان مسافرنواز اپنی باردار شاخوں کے دستِ فیّاضی کو بڑی عالی ہمّتی سے اُنکی جانب بڑھائے ہُوئے ہیں +

احسن لکھنوی۔ زنجبیٔ

ایک پُرانی دیوار

رات کے دو بجے جبکہ اُسوقت کا اُداس چاند اُدھر مغرب کی طرف جھکا جا رہا تھا۔ اور ایک ٹھوٹھے درخت کی چند سوکھی ٹہنیاں اُسکو رخصت کر رہی تھیں۔ ہوا بھیانک رفتار سے چل رہی تھی اور چند پُرانے تاڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سے سناٹا بڑھ رہا تھا! میں اُس گھڑی اکیلا ایک پُرانی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ جس نے میری طفلی دیکھی تھی! آہ آج اُس میں کتنا فرق تھا! خیال پچھلی باتوں کو یاد دلاتا تھا اور عبرت موجودہ سماں دکھلا رہی تھی! اُسوقت کی ڈھلتی چاندنی نے اُس کی بیکسی کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ میری آنکھیں بھر آئیں اور بچپن کا سارا زمانہ سامنے آگیا۔ مگر ہاں اُسی مٹے مٹے طرح سے جس طرح ایک ڈبڈبائی آنکھ سے نظارہ ہو!! رات کے اکیلے پن نے اِس درجہ محو کر دیا کہ موجودہ حالت بالکل بھول گئی اور خیال ہی خیال میں اُس گذرے زمانے میں پہنچ گئے۔ جو حقیقت میں اب پھر کبھی نہ آئیگا!!

یہ دیوار جس کے اسوقت ہم سامنے کھڑے ہیں۔ بستی کی بہت پُرانی دیواروں میں سے ہے۔ زمانہ اس کے آگے گذر گیا۔ ہائے کسی وقت میں یہ جگہ کیا تھی اور اب کیا ہے! ان دنوں آبادی تھی آج ویرانہ ہے۔ کل مکانات تھے آج کھنڈر ہے۔ مجھے اسکا نقشہ بھولا نہیں ہے۔ اِدھر آنگن تھا اُدھر دالان تھا۔ یہاں پر سائبان تھا وہاں پر کوٹھری تھی۔ اِدھر باورچیخانہ تھا اُدھر کو خلوت تھی! ہائے سب مٹ گیا! اس جگہ وہی خلوت تھی جہاں سے یہ پُرانے تاڑ نظر آیا کرتے تھے۔ یہاں اکثر ہم گرمیوں میں شام کو بیٹھے ہوتے تھے۔ چڑیاں دیوار کی کنگنی[1] پر آ بیٹھتیں اور اندھیرا ہونے تک چہچہایا کرتیں۔ کوٹھے کے اُوپر فاختہ کا گھونسلا تھا جو میری بڑی پیاری تھی۔ دوپہر

[1] کارنس۔

سناٹی گھڑیوں میں ہم اُس کی دردبھری آواز گھنٹوں سُنا کرتے تھے - ہائے وُہ فاختہ بھی تو اب مرنا گئی ہوگی ! افسوس اگر ہم کو اس کے چند پر بھی ملجاتے تو ہم اُن کو اپنے پاس رکھتے !!

ہاں - وہ دالان جسمیں ہم گرمیوں کی دوپہر میں سویا کرتے تھے - اُسی کی یہ ایک دیوار رہ گئی ہے - ہائے یہاں کیسا لُطف تھا - راتوں کو خوبصورت لیمپ جلا کرتا تھا اور یہاں کے اُجلے اُجلے فرش پر ہم لوٹا کرتے تھے - ہمیں خوب یاد ہے - اُن خوش دنوں میں جب ہم خوش رہتے تھے تو اے دیوار تجھ پر خوشی ظاہر ہوتی تھی - بیشک تجھے میرے گھر بھر سے محبت تھی - میری خوشی میں تجھ خوشی ہوتی تھی اور میرے رنج میں تجھے غم ہوتا تھا - اُن دنوں کے ایک ساون میں جبکہ میرا بھائی مرا تھا - ہمیں خوب یاد ہے کہ میرا سارا گھر غمگین ہوگیا تھا - ہم ایک گھڑی چارپائی پر پڑے رہے تھے تو اے دیوار اُسوقت تجھ پر اُداسی چھا گئی تھی !! اُن جیٹھ بیساکھ کے دنوں میں جبکہ گرم اور تُند ہوا کی وجہ سے ہم سب لوگ پریشان سے رہا کرتے تھے اُسوقت تجھ پر بھی ایک قسم کی پریشانی معلوم ہوتی تھی !!۔

آے میری پُرانی دیوار - وُہ زمانہ کیا ہوا ؟ وُہ دن اب پھر نہیں آسکتے ؟ میرا بچپن مجھے پھر نہیں مل سکتا ؟ وُہ خوشنما چاندنی رات جس میں ہم کھیلا کرتے تھے پھر ویسی نہیں آسکتی ؟ اے اُسوقت کے ڈوبتے ہُوئے چاند تجھ میں اب ویسی روشنی نہ رہی ؟ اے اسی جگہ کے تارو تم نے بھی آنکھیں بدل لیں ؟ وُہ نگاہیں کیا ہوئیں - جس سے تم مجھے بچپن میں دیکھا کرتے تھے ؟ اے ہَوا کے جھونکو ! تم بھی مجھے اب لڑکپن کی سی نیند نہیں سُلا سکتے ؟ آہ یہ نہ سمجھے تھے کہ بچپن کی سب چیزیں بدل جائینگی - بھائی بہن دوست آشنا سب کی صُورتوں میں فرق آگیا - سب کا خیال جُدا جُدا ہوگیا تو پھر تو کیوں نہ بدلتی؟ تیری اتنی ہی رفاقت بہت ہے کہ اسوقت تک تو ہم سے جُدا نہ ہوئی ! گرچہ تو خود بیکسی

میں ہے اور تجھ پر بڑھاپا آگیا لیکن ہمیں یقین ہے کہ تو اپنے جی سے بُری نہیں -
آج بھی کچھ دیر کے لئے سہ پہر کے وقت اپنے سایہ میں بٹھانیکو موجود ہے - وُہ چھوٹے
چھوٹے خوبصورت پتھر جنپر میں دیوانہ تھا - وُہ نکیلی ٹھیکریاں جو مجھ سے اکثر نوک کی ل
کرتی تھیں - آج ان سب کا کوئی پُوچھنے والا نہیں - لیکن اَے میری باوفا دیوار تو نے آ
بھی اُنکا ساتھ نہیں چھوڑا - اِس لئے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وُہ آج بھی تیرے سایہ میں
پڑے ہیں -

آہ - اے دیوار کیا یہ میرا خیال سچ ہو کہ تو مجھے بھی بھُولی نہ ہوگی؟ کیونکر یقین کر
ہاں جی تو یہی چاہتا تھا کہ تو بھی مجھے بھولی نہ ہو - شاید نہ بھولی ہو! مگر میرے برتاؤ
تجھے ضرور یہ خیال ہوتا ہوگا کہ مَیں تجھے بھُول گیا - میری تیری جُدائی میں مُدت گذ
زمانہ ہوگیا - ہم دُور رہے - رنجور رہے - لیکن اَے میری قدیم رفیق "تیرے خیال سے
غافل نہیں رہے"! بچپن کا زمانہ جب جب یاد آیا تیرے خیال کے ساتھ یاد آیا - میر
لڑکپن کے دن تیرے ہی گود میں گذرے - مجھے پاؤں پاؤں چلنا تجھی نے سکھا
جب میری دایہ مجھے چھوڑ دیتی تھی تو مَیں تیرے ہی سہارے کھڑا ہوجاتا اور چلنا سیکھ
ہائے وُہ بات عمر بھر یاد رہیگی کہ جب کبھی میں روٹھ جاتا یا میرے حسب خواہ کوئی چیز نہ مل
اور مَیں رو دیتا تو اے دیوار اکثر تجھ سے آ لگ جاتا اور لوگوں کی طرف سے منہ پھیر کر
غمزدہ گال کو تجھ سے ملائے رکھتا - تو مجھے خوب یاد ہے کہ تو مجھے لپٹائے رکھتی اور
میرے آنسو پُونچھتی - جب اَور بڑا ہوا اور گیند کھیلنا سیکھا تو اُسوقت کی باتیں بھی مجھ
خوب یاد ہیں - جب پانی برستا ہوتا اور میرے ساتھی میرے ساتھ کھیلنے کو نہ آسکے
تو اُسوقت مَیں تجھ سے کھیلتا - مَیں تجھے گیند دیتا اور تو مجھے گیند دیتی - مَیں تیر
طرف پھینکتا - اور تو میری طرف پھینکتی!! ہائے! طفلی! یہ نہ سمجھا تھا کہ تو اسقدر
جلد گذر جائیگی! اور اگر تو گذر بھی گئی تھی، تو اے کاش یہ دیوار ویسی ہی رہتی - ما

لہ رنگین پھر نہ آتا۔ اور اس طرح پاؤں پاؤں چلنے کے لئے اس کے سہارے کی ضرورت ہوتی۔ لیکن بڑھاپا تو آتا اور اس سے تکیہ لگانے کی حاجت ہوتی ! ہائے ! میری قدیم رفیق۔ میں دیکھتا ہوں کہ تو اب بہت ہی چند دنوں کی مہمان ہے۔ غم سے تو نڈھال ہو گئی اور مارے صدمے کے بیٹھی جا رہی ہے !

یہ تو ایک اتفاق تھا کہ یہاں آ گئے۔ نہیں معلوم کہ پھر آنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ میری قدیم دیوار۔ میں نے تو اب بہت آہیں بھریں اور دل غمگین ہو گیا۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ لے تیرا خدا حافظ !!!

جب میں چپ ہو گیا تو نہایت عبرت ناک آواز میں۔ دیوار نے اپنی زبان بے زبانی میں یہ کہا کہ :۔

"بیٹا ! میری عمر تو اب پوری ہو چکی۔ شائد تمہیں دیکھنا اب پھر نصیب نہ ہو میری ایک وصیت ہے اسے یاد رکھنا۔ یہ کچھ تم کو فائدہ دیگی۔"

"بیٹا ! ہم کو جب اس جگہ پھر کھڑا نہ پاؤ اور اس کے عوض میں میرا ڈھیر ہو تو نادانوں کی طرح سے ہم پر ہو کر گذر نہ جانا۔ گرچہ میں تو نہ رہونگی۔ لیکن "عبرت" کو چھوڑے جاتی ہوں اس سے بے رخی نہ کرنا۔ اس سے اکثر ملنا اور اس کی باتوں کو توجہ سے سننا۔ بیٹا ! "عبرت" کی صحبت بڑی پاک صحبت ہے۔ خدا کے نیک بندوں کو ہمیشہ اس کے ساتھ دیکھو گے۔ بیٹا ! بڑھاپے کی وجہ سے اب ہم سے زیادہ بولا نہیں جاتا۔ بس میری نصیحت یاد رکھنا اور عبرت کا ساتھ نہ چھوڑنا کہ یہ سب سے بڑی نصیحت ہے۔ جا تیرا اللہ نگہبان !!!"

علی محمود (از بانکی پور)

دستار

ٹوپی پر جو مضمون لکھا جا چکا ہے۔ اُسے پڑھ کر ایک نقّادِ سخن نے یہ رائے لکھی ہے:- "بہت سی ٹوپیاں ملاحظہ سے رہ گئیں۔ عمامے پر بھی نظر ہونی چاہیے تھی"۔ بیشک کئی ٹوپیاں ابھی منتظرِ توجہ ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ اُنکی پُرسش کا بھی کوئی دن آ جائے۔ سرِدست۔ دستار۔ سے دو دو باتیں ہو جائیں۔ خدا جانے الفاظ میں تاثیر کہاں سے آجاتی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اِس سے آگاہ نہ ہوں۔ لیکن میرا یہ ایمان ہے۔ کہ بعض لفظ بنے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ معزز معلوم ہوں۔ اور بعض ایسے خفیف ہوتے ہیں۔ کہ نظر میں نہ جچیں۔ شاید کوئی صاحب کہیں کہ محض پُرانے اور دیرسے دلنشین شدہ خیالات سے کہتے ہو۔ مگر میرے ذہن میں۔ لفظِ دستار باوجود زمانہ کی ناقدر شناسی کے کانوں کو معزز معلوم ہوتا ہے اور "ٹوپی" باوجودیکہ قبولِ عام کا طُرّہ اس کے سر پر ہے۔ کچھ ہلکی سی چیز نظر آتی ہے۔ "دستار" کسی زبان میں اس کا نام لو۔ ایک متانت اور ثقاہت کا بوجھ سنبھالے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔ پگڑی ہی کو دیکھئے۔ تعدادِ حروف اور وزن تو وہی ہے۔ جو ٹوپی کا۔ مگر اُس سے کسی قدر بھاری بھرکم ہے۔ اِس کے تلفظ میں بھی ایک قسم کی گرانی ہے۔ اور یہ گرانی کچھ لفظی ہی نہیں۔ قیمت میں بھی پگڑی ٹوپی سے گراں قدر ہے۔ ململ کی سادہ یا بیلدار ٹوپی چند آنوں میں ملے۔ تو پگڑی چند روپیوں میں۔ ٹوپی اگر طلائی کام کی۔ یا سلمے کی۔ یا لیسدار لو تو معمولی پانچ سات روپے میں۔ لیکن پگڑی اگر ریشمی یا زرکار یا اور کسی طرح کے تکلف والی ڈھونڈو تو بیس روپے سے لیکر سو روپیہ تک کی۔ کسی بامذاق آدمی کے سامنے اس کا عربی نام لیجئے "عمامہ"۔ دیکھئے کتنی وقعت اُس کے دل میں پیدا

ہوتی ہے۔ اوّل تو عمامہ خود معتبر چیز ہے۔ دُوسرے معتبروں کی صحبت میں معتبر بنگیا ہے۔ جب اس کا ذکر سنو۔ کسی بزرگ کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ کچھ نہ ہو تو زاہد یا شیخ۔ گویا اُس کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

دیکھنا محفلِ رنداں میں نہ آنا اے شیخ
یہ وُہ محفل ہے۔ کہ عمامہ اُچھل جاتا ہے

اِس شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ صاحبِ عمامہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک عمامہ عزیز ترین یا معزز ترین مقبوضاتِ ذاتی ہے۔ جس کے متعلق خوف دلانے سے گویا اُس کے شریکِ محفل ہونے کا احتمال بھی نہیں رہیگا۔ اِسی طرح ایک اَور رند مشرب حضرت فارسی میں فرماتے ہیں۔ ؎

در کوئے مُغاں زاہد رہ نیست تکلف را
گیرم کہ تو گنجیدی عمامہ نمے گنجد

یہاں عمامہ زاہد کا مِلک قرار دیا گیا ہے اور اُسکا رُعب اس درجہ ہے کہ مجمعِ رنداں اس سے گھبراتا ہے۔ اور اس لئے چاہتا ہے کہ عمامہ اُنکے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اسکو ایک ایسی بڑی چیز قرار دیتا ہے کہ خود زاہد سما جائے تو سما جائے مگر عمامہ کے لئے گنجائش کہاں۔ دستار کی فضیلت اِسی سے ظاہر ہے کہ دستارِ فضیلت کا یہ ایک جزو ہے۔ پگڑی کی توقیر میں اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ اب تک ہمارے دیہات میں سر پہ پگڑی ہونا سرداری کی علامت ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ محض پُرانے توہمات اور قدیم رواج ہیں۔ بلکہ ٹوپی پوش حکمران خود پگڑی کے قدر دان ہیں۔ عدالتوں اور دفاترِ سرکاری کا ایک اَن لکھا قانون ہے۔ کہ لوگ پگڑی باندھ کر آئیں۔ کلکتہ میں بنگالی لوگ جو ٹوپی اور پگڑی دونوں کی قید سے آزاد ہیں۔ اور قدرت کی بنائی ہُوئی کھوپری اور اُس پر روغنِ نارجیل سے تر بتر کنگھی کئے ہُوئے بالوں کو کافی زینت سمجھتے ہیں۔ عدالت کی کُرسی پر بیٹھتے

وقت ایک گول سی بندھی بندھائی پگڑی سر پر دھر لیتے ہیں۔ وُہی نشانِ حکومت ہے اور وُہی تمغائے لیاقت۔ گھر گئے اور پگڑی اُتار کر رکھدی۔ گویا ججی یا منصفی سے سبکدوش ہُوئے اور گھر پر سیدھے سادے نرے پُرے بنگالی بن کے آرام اور بیفکری سے بیٹھ گئے۔ اِدھر صوبجات متحدہ کی جانب چلے آیئے اور آپ دیکھینگے کہ پنڈت جی ہیں تو اپنی گھُٹی ہُوئی پگڑی پر نازاں ہیں۔ اور سیٹھ جی مہاراج کو اگر کوئی چیز گماشتوں۔ دلالوں اور عام بیوپاریوں سے ممتاز کرتی ہے تو گلابی رنگ کی ایک ذراسی پگڑی ہے جسے کالبوت پر رکھ کر باندھتے رہنا بعض غریب لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے۔ اور مولوی صاحب کا تو کیا ہی کہنا۔ اُنکا عمّامہ تو مولویّت کا ایک جُزوِ ضروری ہے۔ جنوب ہو یا شمال۔ ہند ہو یا سند۔ کشمیر ہو یا میسور۔ مولوی صاحب کا عمّامہ موجُود ہے۔ تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ دو شعر اکثر مولوی صاحبان کے لئے موزون معلوم ہوتے ہیں:-

دیتا جاروب سرِ خاک ہے جامہ اُن کا ۔۔۔ چھتریاں سر پہ لگائے ہے عمامہ اُن کا
سر پہ دستارِ فضیلت کی بہت بھاری ہے ۔۔۔ پیٹ اُن کا تو کُتب خانہ کی الماری ہے

جنوبی ہندوستان کو دیکھو۔ تو اہلِ مدراس نے پگڑی کی قدر پہچانی ہے یعنی اِس درجہ تک کہ جُوتے کو بھی اُتار پھینکا ہے۔ عجب مزا آتا ہے جب کسی پُرانے ڈھنگ کے مدراسی کو دیکھیں۔ کوٹ بھی ہے۔ پتلون بھی۔ کالر بھی۔ ٹائی بھی۔ سر پر دوپٹّہ بنارسی تیس چالیس روپیہ کا بندھا ہُوا ہے۔ مگر پاؤں پر نظر ڈالو تو جرابوں کے تکلّف سے بھی فارغ ہیں۔ اچھے اچھے معزّز ننگے پاؤں ریت پر یوں دوڑے پھرتے ہیں۔ کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اہلِ بمبئی کا تو کیا کہنا۔ اُنہوں نے تو عمّامہ کو اپنی اصلی خُوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ مرہٹوں کی پگڑی بھی ایک خاص بانکپن رکھتی ہے۔ مگر اس کے نیچے مُنڈے ہُوئے سر کی نمائش اِسے کسی قدر بدزیب بنا دیتی ہے۔ مگر بمبئی کے مُسلمانوں کی خوبصُورت عبائیں۔ اُن پر لمبی لمبی قبائیں اور سروں پر خوشنما

اور قیمتی عربی عمامے - انکے تمول - اعتبار اور اعزاز کی مجازی علامتیں ہیں - کاش یہ عمامے ساتھ علمی فضیلت بھی لئے ہوتے - پھر تو ہم مسلمانانِ بمبئی کو دُوسرے مقامات کے لوگوں کے لیئے نمونے کے طور پر پیش کر دیتے - پارسیوں کا لباس سر بھی درحقیقت ایک قسم کی بندھی بندھائی پگڑی ہے - اور وُہ اس قدر بلند - دیرپا اور مضبوط ہوتی ہے - کہ زبانِ حال سے یہ کہتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی قوموں کی لاج اسی پگڑی نے رکھی ہوئی ہے - وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں آئیں تو پگڑی ایک خاص سپاہیانہ ٹھاٹھ بدلتی ہے - تصویریں ہوں تو دکھائیں - کہ فوجی جوان کس آن بان سے پیچدار دوپٹے زیب سر کرکے اتراتے پھرتے ہیں - کج کلاہی کی بجائے کج دستاری سے کام لیا جاتا ہے - ایک طرف پگڑی کے پیچ کان سے دُور اُوپر کی طرف بھاگتے جاتے ہیں اور دوسری طرف کان کو ڈھانپ کر رخسار کے ایک حصّے کو بھی گھیرے ہُوئے ہیں - ایک طرف پہاڑ کی چوٹی ہے تو دُوسری طرف وادی غرض پگڑی کیا ہے نشیب و فرازِ عالم کی تصویر ہے - اس پگڑی میں ایک چیز ایسی ہے جسکے دکھانے سے عکسی تصویر بھی قاصر ہے - یعنے اس کے خوشنما رنگ - معلوم ہوتا ہے - وردی میجر صاحب نے قوس قزح آسمان سے چھین کر سر پر لپیٹ لی ہے -

یُوں تو ہندوستان کے ہر حصّے میں دستار کسی نہ کسی صُورت میں موجود ہے - مگر ہمارا پنجاب تو اس کا گھر ہے - یہاں اس کی بن آئی ہے - جتنی بڑی ہو اتنے ہی آپ امیر - اتنے ہی معتبر - چھوٹی سی پگڑی باندہ کر کوئی باہر نکلے تو کہتے ہیں - ارے میاں یہ کیا لنگوٹی سی سر پر باندہ رکھی ہے - بہاولپور - ملتان - ڈیرہ جات - ان اطراف میں تو پُورا تھان سر پر دھر لیتے ہیں - اور اس پر کچھ قانع نہیں - اگر اور بڑے تھان ولایت سے بنکر آنے لگیں تو اس نواح میں بڑے گاہک ہیں - ان پگڑیوں میں ایک خوبی ہے - ان کے پیچ ایسے عجیب ہوتے ہیں کہ گویا بے قاعدگی میں باقاعدگی بیٹھی ہوئی

ہے ۔ بظاہر کوئی کدھر گیا ہے اور کوئی کدھر ۔ اور ایک شخص کی بندش دُوسرے سے
نہیں ملتی ۔ بیچ دیوانے معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر اُن کی دیوانگی میں بھی ایک "ترتیب"
ہوتی ہے ۔ بڑے شہروں میں اور خصوصاً پنجاب کی ریاستوں کے دارالخلافوں میں
رنگارنگ کی پگڑیاں عجب بہار دکھاتی ہیں ۔ سرحد پنجاب میں پگڑی کو زیادہ وزن دار
بنانے کے لئے ایک خاصہ بوجھل کُلہ (جو چھوٹے پیمانے پر ایک مصر کا مینار ہوتا ہے مخروطی)
جزوِ دستار قرار دیا گیا ہے اور اس کی ساخت میں بہت محنت صرف کی جاتی ہے ۔
اِس زمانہ میں زندگی کے مختلف صیغوں میں ان دستار بند پنجابیوں نے نام پیدا کیا ہے
اور اِس ناموری کے ساتھ باہر دستار کی بھی ناموری بڑھ چلی ہے ۔ کیا ہوا ۔ اگر بنگالہ
کے لوگ اِسے اُتار کر پھینکنے پر آمادہ رہتے ہیں اور صوبجاتِ متحدہ کے لوگوں نے
ٹوپی کو ترجیح دے رکھی ہے اور بمبئی مدراس والے دستار وقتِ ضرورت پہنتے ہیں
جب تک پنجاب کے دم میں دم ہے ۔ پگڑی کا بھرم کُھلنے نہیں پائیگا ۔ بلکہ اَور
لوگ بھی اِس کا دم بھرنے لگیں تو عجب نہیں ۔ کیا اُنہیں معلوم نہیں ۔ کہ پنجاب میں
سب سے زیادہ خصوصیت اِسے سکھوں کی قوم سے ہے (انکے لمبے بال کسی
اَور لباس میں سنبھالے ہی نہیں جا سکتے) اور سرکار دولتمدار کی نظر میں سب سے
منظورِ نظر قوم اس وقت سکھوں کی ہے ۔ جو دستار کی فضیلت سے اب تک مُنکر
تھے اور اس کی بزرگی میں شک رکھتے تھے ۔ انکے لئے یہ دلیل قطعی ہونی چاہئے ۔
کہ سکھوں کے سر پر پگڑی ہے اور اُس پگڑی پر لاٹ کرزن بہادر کا ہاتھ ہے +

اِکرام

ساگھو کا کُندا

کون ہے جس کی نظر لکڑی کے کُندے پر کبھی نہ پڑی ہو۔ مگر ان ہزاروں دیکھنے والوں میں کتنے ہیں۔ جنھوں نے اس معمولی چیز کو چشمِ عبرت نگر سے دیکھا ہو۔ اور جن کے دل پر اس نہایت عام نظارے کا ایسا گہرا اثر ہوا ہو۔ جیسا کہ ایک غور کرنے والے شاعر کی طبیعت پر ہوتا ہے۔ حافظ سید فضل حق صاحب آزاد رئیسِ عظیم آباد سہل ممتنع لکھنے میں مشتاق ہیں۔ انھوں نے مندرجہ ذیل نظم میں صرف خوبیٔ تحریر سے ایک کُندۂ ناتراش کو سامانِ دلچسپی اور ذریعۂ نصیحت بنا دیا ہے۔ اس پر زبان کی سلاست نہایت دلکش ہے:۔

جس طرح کار آمد اور اشیا میں اک لکڑی بھی ہے
تجھ کو اے لکڑی کے کُندے کچھ خبر اپنی بھی ہے

کس میں کس دیس کس جنگل میں تھا کس بن میں تھا
ایسی آن بن کیا ہوئی اس بن سے تو جس بن میں تھا

شان بھتی ہے عظیم الشان تھا تیرا نہال
تیری شاخ و بن سے تھی بن کی جڑی ہوئی نہال

بن ترے بن کی بنی باتیں ہیں بگڑی سر بسر
فخر تھا جنگل کو اب تک تیری اونچی ذات پر

گرچہ ہوں سرمایۂ فخر اور بھی ہمسن ترے
پر کہاں جنگل میں گو جنگل ہوں انکو بن ترے

گرچہ برگد کو بزرگی سے یہاں کہتے ہیں بر
تیرا فرماں بردہ ہے اور تو ہے سلطان الشجر

گرچہ سو باتوں میں تیرا ہمسر ہے ساگوان
پر نہ نکلا قسمتوں سے وہ بھی تجھ سا بھاگوان

دیتے ہیں تیرے فضائل کا پتہ پتے ترے
پہلے ہر کمان چڑھتا ہے یہاں متّے ترے

جوڑے ہیں دستِ ضرورت نے یہ باہم تختے تنگ
ہے یہ کم ظرفی جو دونوں کو ترے سمجھیں سبک

تیرے آگے دون کی لیگا بھلا ہر نخل کیا
پھانٹ کو کھن کو تری تعلیم میں آ ہر دخل کیا

دست بستہ شیشم استادہ ہے بہر دست بوس
عجز سے دنداں نکالے ہے سراپا آبنوس

تیرے آگے تنتنی پھر توں کی کیونکر سے چلے
. لاکھ آسن آسنا جوڑے تو ہے آسن تلے

ریت بڑے چت پٹ میں یا تیرا سلیپٹ پٹ پڑے
یہ کبھی ممکن نہیں تجھ سے کہ تو پلٹ پڑے

اتفاقاً یون اگر سارل نہ تو اکسار ہو
ریلوے لائن کو سلی کا وہیں آزار ہو

منزلِ مقصود کی ہوتی ہے تجھ سے تربیت
کاٹھ کے جتنے ہیں پل انکو ہے تجھ سے تقویت

کھوپری ہو جائے پل بھر میں پلوں کی پلپلی
گر نہ روکے ڈھاستیاں مینڈھونکی تیری پردلی

سنتے ہیں سو سو برس پر بھی نہ تو کیسر سڑا
یا کھڑا ہے یا پڑا ہے یا گڑا جو بھر سڑا

لکڑیاں جتنی ہیں انمیں فرد ہے یکتا ہے تو
تجھ کو لکڑی کیا کہیں لکڑی نہیں لوہا ہے تو

نام اس سول کا چمکا ترے اقبال سے
نیرِ اقبال خود چمکا ترا نیپال سے

بال اڑاتی ہیں چھتیں گھر کی ترے شہتیر پر
کیوں نہ آتے طائرِ آرام کندی جوڑ کر

کند کیا ہو۔ ہو بھی باؤ تند سرگرم ستیز
کند ہیں دیمک کے بھی چلتے ہوئے دندان تیز

تجھ کو گذرے ہونگے کیا جانے یہاں کتنی برس
پھر بھی دم تجھ میں جوانی کے ہیں اے عیسیٰ نفس

کیا عجب ہو عیسوی سن سے بھی تیرا سن بڑا
تو رہا بھارت کے آگے سے بھی ہو یوں ہی کھڑا

بجلیوں کے گھن اٹھانا آندھیوں کو ٹالنا
حسن کو قدرت کے سانچے میں سراپا ڈھالنا

طائروں کو تجھ سے ملتا ہوگا لطف شہر میں
لطف بھی ایسا ترا کم حسن پھر بالا نشیں

چہچہے ہوتے رہے ہونگے تری شاخوں میں بھی
وہم بھی آتا نہ ہوگا تجھ کو اس دن کا کبھی

سایہ گستر تھا پڑا سائے میں ہی خود آج تو
آہ ہر زخمِ حوادث کا ہے آج آماج تو

جس طرح سر بفلک تھا آج ہی سر بزمیں
ڈر تو یہ ہے سر پر اب آرا نہ چل جائے کہیں

وہ سماں وہ رنگ وہ نقشہ وہ خاکا کیا ہوا
اس گھنے جنگل میں کس نے تجھ کو تاکا کیا ہوا

کون سا تھا وہ بڑے قد کا بلا کا آدمی
ٹانگ کے نیچے سے یوں جس نے نکالا تجھ کو بھی

ٹانگ لیتے ہی وہ سارا رنگ تیرا اڑ گیا
چار ہی ٹانگوں میں بس جو رنگ تیرا اڑ گیا

بیجگر بیجان ہے بیرنگ ہے بیدل ہے تو
اب تو اک بھاری سی۔ چھاتی پر زمین کی سل ہے تو

کچھ خطا تیری سمجھ میں اور تو آتی نہیں
راستی اس چرخ کجرو کو مگر بھاتی نہیں

پہر نہ ہو آزارِ گردوں سے دلِ افسردہ ترا
آج بھی بھاری ہے زندوں پر یہاں مُردہ ترا

اس خرابی میں تری ۔ تعمیر اک مضمر بھی ہے
تیرے رگ ریشے میں آخر اک چھپا جوہر بھی ہے

بے ثمر یا با ثمر موضوع یا مہمل ہے تو
جوہرِ ذاتی سے گویا اک سراپا پھل ہے تو

تو نے دیکھا کب ہے پاشِ دانش کا رنگ ڈھنگ
تو وُہ ہو جائے گا آئینہ کہ آئینہ ہو دنگ

صبر سے کچھ اور دن چوٹیں اُٹھاتا رہ یہاں
ہے کنول تجھ کو کھلانا زخم کھاتا رہ یہاں

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را از کردگار
ہر زماں جانے دگر باشد ۔ بداں اے ہوشیار

شاد رہ اے رہروِ راہِ فنا دلشاد رہ
بھُول جا سب رنج و غم دکھ درد سے آزاد رہ

تجھ سے چھوٹا ہے اگر جنگل کہ تھا تیرا وطن
تجھ سے کھیلنے کو یہاں ہے آپ اِک طرفہ چمن

میز ۔ کرسی کی بہاریں تو دکھائیگا یہاں
پھر چھپر کھٹ میں حسینوں کو سلائیگا یہاں

دل نہ لوٹیگا بھلا کس طرح اِک معشوق کا
جب سنگار آئینہ ہوگا تو کسی معشوق کا

بنکے کولے بھی اگر نکلی تری جاندار چھال
سینکنے جائینگی گلرویوں کے پھولوں سے وہ گال

آگے آگے کیا ہو کیا جانے کوئی تیرا مآل
رُستن حستانہ کا کیا تجھ سے پوشیدہ ہے حال

وُہ بھی لکڑی اور تو بھی اے زہے دادارِ جہاں
جس نے اے ساکھو! یہ تیری ساکھ باندھی ہے یہاں

جسکو اُس معبودِ مطلق کی نہیں مطلق تلاش
ہیزمِ دوزخ بلاشک ہے وہ کندہ ناتراش

اس بیاں میں بس یہی بہتر نہ اب تندی کروں
مغز کندی ہے اگر اس پر بھی میں کندی کروں — [illegible]

سلسلۂ تصاویر میں ایک تصویر ایڈیٹر کی بھی تھی ۔ آج اُس کی باری آگئی ہے ۔ کیونکہ اَور کوئی تصویر ابھی تیار نہیں ۔ ورنہ سب کے بعد وہ ناظرین کی خدمت میں حاضر ہوتی ۔ باقی تصاویر جُوں جُوں تیار ہوتی جائینگی ۔ ہدیہ ناظرین کی جائینگی ۔ یہ تصویر اکثر احباب کے اصرار سے اس سلسلہ میں شامل کی گئی ہے ۔ ورنہ طبعی میلان اس کی اشاعت کے خلاف متقاضی تھا ۔ (ایڈیٹر)

بمبئی

پچھلے سال دسمبر میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا۔ اس تقریب سے ہمارے قابل دوست محمد ظفر علیخاں صاحب بی۔اے نے ایک لاجواب نظم لکھی تھی۔ جو وہاں بہت پسند کی گئی تھی۔ اس کا ایک بند جو سرتاجِ امصارِ ہند یعنے بلدۂ بمبئی کی شان میں تھا۔ خصوصیت سے پُرزور تھا۔ وہ اور ایک اور بند جو اُس مجلس کے اصل مدعا سے متعلق ہے۔ ہمیں چھاپنے کے لئے عنایت کئے گئے ہیں اور شکریے کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں:۔

کہئے تجھے معدنِ لعل و گہر بمبئی — کہئے تجھے مخزنِ نقرہ و زر بمبئی
حسن میں تو بے مثال تیری لوا بے عدیل — سب سے الگ ہے تری شوکت و فر بمبئی
ماہِ زمرد کے گرد ہالہ ہے سیم مذاب — تیرے سواحل نہیں بحر سے تر بمبئی
تیری تجارت ہوئی ملک کی حاجت روا — جاہ و تجمل کا تو بن گئی گھر بمبئی
خاتمِ حشمت ہے تو علم ہے تیرا نگیں — تو ہے لگن اور تری شمعِ ہنر بمبئی
گوشۂ چشم اک ترا بخت کو کردے رسا — روکشِ اکسیر ہے تیری نظر بمبئی
کہتے ہیں فتح و ظفر کا ہے وسیلہ سفر — رشکِ سفر ہے مگر تیرا حضر بمبئی
ہو ملک الموت بھی تجھ سے نہ کیوں ڈرا — مظہرِ شانِ خدا تو ہے مگر بمبئی
تجھ کو اُجاڑا کیا لاکھ وہ طاعون سے — اُتنا ہی تو نے دیا شہر کو بھر بمبئی
کھینچتی چلی آتی ہے گوشۂ عالم سے خلق — تجھ میں ہے مخفی کوئی خاص اثر بمبئی
ناک ہر اور ناک بھی موم کی جاتی ہے مُڑ — موڑا دلِ خلق کو تُو نے جدھر بمبئی
ہم کو بھی لائی یہاں کھینچ کے تیری کشش — ورنہ علیگڑھ کہاں اور کدھر بمبئی

مفلس و نادار ہیں دوسرے ملکوں میں ہم
تو نے تونگر کیا ہم کو مگر بمبئی

پارسی و برہمن ہی نہیں منعم یہاں
ہم پہ بھی وا ہے ترے فیض کا در بمبئی

اُمتِ احمد کی آج بنتی ہے تو دستگیر
ہو گئی تجھ پر حرام نارِ سقر بمبئی

کل کی ہمیں آئی یاد بھولی ہوئی داستاں
آج جو تیرا سنا غلغلۂ عز و شاں

چاہیے دنیا کے ساتھ قوم کو دیں بھی ضرور
خانۂ بے سقف میں رہتے نہیں ذی شعور

علم وہ بے سود ہے دیں سے ہوا جو الگ
عقل وہ بے کار ہے آ گیا جس میں فتور

علم بلا دین کے گل ہے نہیں جس میں بو
یا مے گلرنگ ہے جس میں نہیں ہے سرور

بادۂ سائنس کے خم ہیں لنڈھائے عبث
نشۂ توحید میں گر نہ ہوئی قوم چور

کیلر و نیوٹن کے گر سیکھ کے کیا فائدہ
مصطفوی راز سے جب رہے ادراک دور

علم دکھا جاتا ہے عقل کو جھلکی سی ایک
باعثِ تنویرِ ذہن بسکہ ہے مذہب کا نور

اُمتِ ختمِ رسل سب میں سرافراز تھی
دل میں رہا دین کے جوش کا جب تک وفور

دیں ہی نے بخشی انہیں قیصر و کسریٰ کی شان
راحلہ جن کا تھا اونٹ زاد تھا جن کا کھجور

دین سے جیوں ہی مگر ہم نے کنارا کیا
مٹ گئی عظمت تمام مٹ گیا سارا غرور

پہنچے ہیں اس حال کو اپنے ہی ہاتھوں سے ہم
اس میں کسی دوسرے کا نہیں کچھ بھی قصور

لیکن اگر اب بھی ہم جائیں ذرا سا سنبھل
ہم کو یقیں ہے کہ ہم اب بھی بڑھینگے ضرور

رکھتے ہیں سر میں دماغ گرچہ پڑا ہو وہ سست
رکھتے ہیں پہلو میں دل گرچہ وہ ہے ناصبور

صبح کا بھولا اگر شام کو آ جائے گھر
منزلِ مقصود سے اسکو سمجھئے نہ دور

اوجِ ترقی پہ پھر ہم کو پہنچنا ہے گر
ہے یہی لازم کہ ہوں حاضرِ دیں کے حضور

درس میں گر فلسفے کے ہوں مباحث شریک
فقہ و حدیثِ رسول کے بھی ہوں نکتے ضرور

پورے نہ لیکن کبھی ہونگے مقاصد یہ دو
قوم کی خود جب تک ایک یونیورسٹی نہ ہو

ظفر علی خاں

بلبلِ شیدا

بیٹھنا پہلوئے گل میں تجھے بھایا بلبل
نکہتِ عشق کو کیا تو نے بھی پایا بلبل

گل کی صورت پہ جو یوں لوٹ ہوئی جاتی ہے
سچ بتا اس میں تجھے کیا نظر آیا بلبل

شوق تیرا سا اگر اسکو نہیں ہے تو نہ ہو
گل نے سر تو ہے ترے آگے جھکایا بلبل

ہاں مزے خوب اڑا حسنِ رخِ جاناں کے
تو نے محبوب کی امیدوں سے پایا بلبل

گل ترا تجھ سے جدا ہو نہ گھڑی بھر کیلئے
ابرِ رحمت ترے سر پہ رہے چھایا بلبل

نہ مراد اپنی وہ پائے جو تجھے قید کرے
جان سے اپنی وہ جائے جو تجھے صید کرے

آہ! معلوم ہے بلبل تجھے الفت کیا ہے؟
آتشِ عشق ہے کیا سوزِ محبت کیا ہے

کس طرح یہ دلِ غمناک دعا کرتا ہے
کس طرح رات بسر ہوتی ہے فرقت کیا ہے

کس طرح جھوٹی امیدوں پہ جیا کرتے ہیں
دل بتاتا ہے کیا خواہشِ وصلت کیا ہے

شب و روز اور سدا ایک طرح کا مذکور
ہر گھڑی اور تصور یہ مصیبت کیا ہے

ستم و جور اٹھانے کا یہ کیسا دستور
رنج و غم کھانے کی بیہودہ یہ عادت کیا ہے

ہائے کہتے ہیں جسے عشق بلا ہے کیسی
کھنچے سے جاتے ہیں جسکو یہ جفا ہے کیسی

میں بھی ہوں تیری طرح حسن کا مارا بلبل
تیری پیارا سا ہے اک میرا بھی پیارا بلبل

ہو بہو ہے یہی صورت یہی سیرت اسکی
یہی نقشہ ہے یہی طرز دلارا بلبل

دید گل سے تجھے سیری نہیں جیسے ہوتی
میرا گل بھی مری آنکھوں کا ہے تارا بلبل

وصلِ محبوب ترے دل کی تمنا ہے اگر
زندگی کا ہے وہ میری بھی سہارا بلبل

تو فراقِ ستم آزاد سے گھبراتی ہے   ہائے مجھ کو بھی نہیں ہے وہ گوارا بلبل

ہمہ تن آہ و فغاں نالہ و شیون ہوں میں!
عندلیبِ چمن وادیِ ایمن ہوں میں!

ہم بھی اک باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی   ہائے کس لطف و مسرت میں تھی آباد کبھی
رات دن چین سے آرام سے ہوتی تھی بسر   اپنی قسمت میں تھی کاہیکو یہ فریاد کبھی
ہائے وہ صحنِ چمن ہائے سماں وہ دلکش   دل تڑپتا ہے تو آتے ہیں مزے یاد کبھی
اب تو یہ قید ہے اور آٹھ پہر کا کڑھنا   ہم کو کیا یاد کہ آزاد تھے اور شاد کبھی
آہ اے ذوقِ نظر تو نے پھنسایا ہم کو   دلِ پُر غم کو نہ بھولیگی یہ بیداد کبھی

آرزو ہے کہ رہائی کہیں اب تو پائیں
کھول صیاد بس اب در کو کہ اُڑ کر جائیں

بس کر اے چرخ نہیں ضبط کا یارا ہم کو   پھیر دے جلد کہیں عیش ہمارا ہم کو
پھونک دے آتشِ اندوہِ فراقِ محبوب   نہیں اس طرح کا جینا تو گوارا ہم کو
تجھ سے بھی ساتھ نبھایا نہ گیا دیدۂ تر   ایک لے دے کے تھا بس تیرا سہارا ہم کو
مدد اے جذبۂ عشقِ صنمِ خوش انداز   آرزوہائے ملاقات نے مارا ہم کو
بڑھ چلا درد۔ نہیں صبر کی طاقت اصلا   اب تو مرنے کے سوا کچھ نہیں چارا ہم کو

مضطرب قلب ہے تکلیف ہی پڑتی نہیں کل
دے صدا جلد بس اب تو کہیں داعیِ اجل

سید نذیر حسین

لکیر کا فقیر

اک مجمع ثقات میں میرا گذر ہوا
انگریزی دانوں پر تھے وہ سب ہو رہے خفا

ارشاد اک طرف سے ہوا مجھ کو دیکھ کر
انگریزی پڑھنے والوں پہ حضرت بھی ہیں فدا!

اور لطف یہ کہ جانتے خود خاک بھی نہیں
پر روشنی نئی کا ہو حضرت کو چاندنا

روزے کے نام سے چڑھیں کہدیں نماز کو
بھوکا نہیں ہماری عبادت کا کچھ خدا

فطرہ نہ خمس۔ اور نہ مساکین پروری
انکی بلا سے بھوکے ہیں گر خویش و اقربا

حج کا خیال اور نہ زیارات کی امنگ
شوق حدیث اور نہ قرآں سے واسطہ

ذکر فضائل نبوی ہو اگر کہیں
یہ دل سے۔ انسے دل کہے چل بھاگ ہو کھڑا!

واقف تو۔ لوتھر و بطرس سو ٹھیک ٹھیک
پر ہے پتہ نجف کا۔ نہ معلوم کربلا!

لنڈن کا ذکر کیجے نظر چپے چپے پر
پر یہ خبر نہیں ہے کہ کعبہ کدھر رہا!

ہو مجلس عزا تو کہیں سر میں درد ہے
اور سر کے بل چلیں جو ہوں لیکچر کسی جگہ!

خود دعوتیں اڑائیں ڈنر اور ٹفن چکھیں
موتے کے واسطے کہیں بے سود فاتحہ!

مسجد شہید ہو تو حرج انکا کچھ نہیں
ہوتا رہے کھنڈر ہو اگر گھر امام کا

پر پاس آبرو ہو۔ نہ عزت کا کچھ خیال
خود مانگتے پھریں جو بنانا ہو مدرسہ!!

نظمیں سنانے کے لئے حاضر سٹیج پر!
لکھا سلام و مجرا کبھی اور نہ مرثیہ!

جب ایسی پود پیدا لگی ہونے قوم میں
فرمائیے کہ قوم کو کیا اسنے فائدہ؟

اگلی سی وضع اور نہ اگلی سی گفتگو
وہ خلق وہ مروت و الفت نہ وہ وفا!

اور مبلغ لیاقت علمی نہ پوچھئے
قلمی کھلے۔ کتاب جو دیں ہم کوئی دکھا

مکتوب فارسی جو کبھی ہم نے تھے پڑھے
انمیں سے ایک لفظ کے معنے تو دیں بتا!

ہم کو قبالہ جاتِ زمانِ گذشتہ سے — پڑھکر یہ ایک آدھ کا سمجھا نہیں مُدعا
اِس عیب کے سوا کہ سخن انہیں بنائے — انگریزی ہی پڑھنے سے نہیں کچھ اور فائدہ
جس وقت ختم کر چکے وعظ اپنا وُہ بزرگ — اک صدمہ پہنچا اور میں کھسیانا سا ہوا
صدمہ تو اس لئے کہ خیالات اپنے یہ! — کھسیانا یُوں کہ تو یہاں کیوں آیا تھا بھلا
مَیں اپنے واسطے تو نہ کچھ بولتا۔ مگر — تعلیم یافتوں کو بھی جب مجھ سا کہہ دیا
پہلے تو سوجھی تُرکی بہ تُرکی جواب کی — لیکن ادب سے ضبط کیا اور چُپ رہا
پھر مَیں نے خوب غور کی انکی سپیچ پر — اور دل ہی دل میں کرنے لگا خود ہی فیصلہ
ثابت ہُوا کہ یہ نہیں تعلیم کا اثر — دراصل ہے قصور۔ ہماری ہی عقل کا
تعلیم ہو مکمل و باقاعدہ اگر — تب دیکھ لیں کہ آپ ہیں کس درد کی دوا
لیڈر ہمیں ہوں قوم کے ہم ہی رفارمر — اور قوم بھی سمجھنے لگے اپنا پیشوا
یہ سوچ کر مَیں انکے چھپانیکو شرم ہو — گو دل میں رو رہا تھا بظاہر میں ہنس پڑا
اور عرض اس طرح سے کیا ہیر پھیر کر — بالفرض ایک مچھلی ہے اور ایک نیولا
جنگل ملا ہوا ہے اسے رہنے کے لئے — اسکا ہمیشہ کام ہے دریا میں تیرنا
طوفانِ آب گر کوئی آجائے فی المثل — مچھلی تو ڈوبے اور نہ ہو غرق نیولا
فرمایئے ہے کس کے لئے شرم کا مقام؟ — اور مرتبہ بلند ہُوا کس کا مشفقا؟
ایرانی کو نہ سمجھے تو کیا پر ہے جائے شرم — ہندوستانی کو۔ جو نہ اُردو ہو جانتا!
یہ اس لئے کہ اُردو میں انگریزی آملی — جس طرح پہلے فارسی کا اس میں دخل تھا
اعداستے بڑھ کے ہوگئی یہ جزوِ زندگی — جب جُزو ہی نہ ہو تو مزہ زندگی کا کیا؟
اور اس کے سر ہیں آپ جو الزام تھوپتے — انگریزی عاجزہ کی نہیں اس میں کچھ خطا
یاراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست" — ہے شورِ بوم کا۔ کہ قصور اس غریب کا؟
للہ چھوڑ دیجئے یہ بھیڑیا دہاں — اب بھیڑ چال کا وُہ زمانہ نہیں رہا

سید علمدار حسین

موت کی گھڑی

درختوں سے پتوں کے جھڑنیکا موقعہ
شگوفوں کا شاخوں پہ سڑنیکا موقعہ
ہے بادِ شمالی کے چلنے کا موقعہ
ستاروں کے جوبن کے ڈھلنے کا موقعہ

ترا وقت اے موت کوئی کہیں ہے
نہیں ہے نہیں ہے نہیں ہی نہیں ہے

کیا کرتے ہیں دن کو دُنیا کے دھندے
سرِ شام یاروں سے ملتے ہیں بندے
ہوا کرتی ہے رات کو خوابِ راحت
صدائے دعا پنجگانہ عبادت

تو ہی شاہِ شاہنشہانِ زمیں ہے
یہ تیرے لئے سب چناں اور چنیں ہے

نوازش علیخان (مرحوم) شاہجہانپوری

دین و دُنیا

(ایک مطائبہ)

منشی موتا لک پرشاد صاحب طالب بنارسی ۔ جو حضرت داغ مدظلہ کے مشہور تلامذہ میں ہیں اور اپنی سلیس زبان کے ۔ ایک نہایت پُرمضمون نظم عنایت کرتے ہیں جس میں ہندوستان کی موجودہ سوسائٹی کے شوقِ تقلیدِ یورپ کی ہنسی اُڑائی ہے ۔ ہمیں یقین ہے

کہ یہ نظم دلچسپی سے پڑھی جائیگی۔ اور جناب طالب کا کلام اسکے بعد اس قدر مقبول ہوگا۔ کہ ہمیں ہر مہینے اُنکی خدمت میں تقاضا کرنا پڑیگا:۔

قیدِ ہستی میں جبکہ ہم آئے — سو طرح کے ۔ لئے اَلم آئے
آنکھیں کھولیں تو یہ سماں دیکھا — نقشِ حیرت جہاں تہاں دیکھا
آپا دھاپی کا اِک زمانہ تھا — کیا دوعملی کا آشیانہ تھا
کوئی اپنے اُدھیڑ بن میں تھا — کوئی ساز و طرب کی دُھن میں تھا
صلح میں کوئی جنگ میں کوئی — راگ میں کوئی رنگ میں کوئی
ہر بشر فیلسوف بنتا تھا — خود بخود بیوقوف بنتا تھا
ایک کو ایک کی نہیں پروا — تھی ہی گویا نہیں کہیں پروا
جل رہے تھے جگہ جگہ چولہے — بارہ گھر تھے تو سترہ چولہے
رنگ پایا جو یہ زمانے کا — ڈھنگ پایا نہ دِل لگانے کا
دین پر ہم نے دھر لیا دِل کو — دُور دُنیا سے کر لیا دِل کو
لیکن اِس میں بھی ایسی اُلجھن تھی — راہ سیدھی چلن کی دشمن تھی
تار پر تار زُلف کی مانند — پیچ خمدار زُلف کی مانند
چار یاری پہ کوئی مرتا تھا — دم کوئی پنجتن کا بھرتا تھا
کوئی تثلیث کا قلم زن تھا — * کوئی نقشِ دُوئی کا دشمن تھا
کہیں کعبہ کا ۔ دَیر کا جھگڑا — کہیں آپس کے بَیر کا جھگڑا
کہیں اسلام کے خلاف ملے — کہیں اصنام کے خلاف ملے
ایک کہتا تھا وُہ حرم میں ہے — ایک کہتا تھا ۔ تم میں ہم میں ہے
ایک کہتا تھا کوئی چیز نہیں — ہمیں ہم ہیں تمہیں تمیز نہیں؟
کوئی برہمو تھا آریا کوئی — کوئی مومن ۔ مداریا[1] کوئی

[1] مدار شاہ کا پیرو فقیر ۱۲

کوئی رغبت حرم کی رکھتا تھا　　کوئی نیت ارم کی رکھتا تھا
ایک رستے پہ کوئی چال نہیں　　یکسوئی کا کہیں خیال نہیں
کس کو سچ کس کو جھوٹ جانیں ہم　　کس کو مانیں کسے نہ مانیں ہم
ایسے جھگڑوں سے اور گھبرائے　　راہِ دنیا پہ پھر چلے آئے
بیج بویا نہالِ دنیا کا　　سمجھے دنیا کو کھیت عقبیٰ کا
دین کا دوسروں پہ رکھ کے مدار　　بن گئے ہم غریب دنیا دار
اپنے دیسی علوم سیکھے سب　　نحو منطق نجوم سیکھے سب
اپنی ہی قوم کا شعار لیا　　زیبِ سر کے لئے ۔ عمامہ دیا
ربط کنٹھے کو تھا گریباں سے　　چاک کو سلسلہ تھا داماں سے
جو بزرگوں سے پائی تھی پگڑی　　ہم نے ماتھے چڑھائی تھی پگڑی !!
طرزِ نو سے ہوا نہ اصلا بند　　وضعِ اجداد کا رہا پابند
لیکن اس راہ میں نہ پاس ہوا　　اس طریقے سے ناسپاس ہوا
کوئی کہتا تھا جاہلِ مطلق　　کوئی کہتا تھا مولوی احمق
راہ لی ہم نے نامرادی کی　　اور یہ غم لیا کہ شادی کی
ایک تو اپنی جان بھاری تھی　　اس پہ بیوی خدا کی ماری تھی
بیوی کیسی ؟ خیال کی آزاد　　تھی تو بیوی ۔ مگر میری استاد
پردے پردے میں وہ نکلتی تھی　　ساتھ گھونگھٹ نکالے چلتی تھی
جس طرف دونوں کے جاتے تھے　　انگلیاں لوگ ادھر اٹھاتے تھے
بولیاں کوئی بولتا تھا کھڑا　　کوئی نظروں میں تولتا تھا کھڑا
جو نئی روشنی پہ مرتے تھے　　حل کے لاحول مجھ پہ کرتے تھے
کہتے تھے کوئی کیوں یہ چل کھیلے　　اب زمانہ وہ ہے کہ کھل کھیلے

سات پردوں میں ہو تو باہر آئے | آنکھ ہو تو نگاہ بنکر آئے
چاند کو ابر میں نہ ڈالے کوئی | اب نہ گھونگٹ کبھی نکالے کوئی
حاضری پہ چلے ٹفن پہ چلے | ساتھ بیوی بھی اب فیشن پہ چلے
بات بیوی نے جب یہ سن پائی | اپنی گانے کی خوب دھن پائی
بولی تیور بدل کے ہم سے - واہ! | ہے تمہاری نگوڑی اچھی راہ
تم رواجِ کہن پہ بھول گئے! | رسمِ جدت کی راہ بھول گئے؟
چھوڑ دو آج سے پرانی چال | کام آتا نہیں پرانا مال
خلق کو ہے نیا چلن ہی پسند | مے نہیں یہ کہ ہو کہن ہی پسند
قاعدہ ہے یہی زمانے کا | کون مشتاق ہے پرانے کا؟
آدمی ہو گیا پرانا جب | بن گیا موت کا نشانا تب
میرا اب سے نہ یہ چلن ہوگا | میں نئی ہوں نیا فیشن ہوگا
بخت کی طرح میں نہ سوؤنگی | شمع کی طرح میں نہ روؤنگی
میں نئی روشنی میں چمکونگی | میں سوسائٹی میں چلکے دمکونگی
مرے گھونگٹ نکالنے والی | ناس ہو - برقع ڈالنے والی
گہنا زیور زوال ہے جی کا | سر کا ٹیکا کلنک کا ٹیکا!
نیچی نظروں سے یہ الم کھینچا | اونچی چوٹی دکھاتی ہے نیچا
اب نہ کاکل بناؤں گی زنہار | مار کاکل یہ ہو خدا کی مار
مانگ چوٹی پہ اب ضمیر نہیں | ان لکیروں کی میں فقیر نہیں
پاؤں پڑنے نہ دوں چھڑے کو اب | ماروں پاپوش پر کڑے کو اب
تو چھڑی لوگوں میں چھڑے نے کیا | نرم ہم کو اسی کڑے نے کیا
اب تو بالے بلائے جان سی ہے | طوق ہے یا گلے کی پھانسی ہے

پالا مارے نگوڑی بالی میں
آگ لگ جائے میری جلتی میں

موئے تعویذ کا تو دیکھو طور
منہ پہ کچھ اور دل میں ہے کچھ اور!

ناک کا۔ نتھ کا ساتھ کیوں رکھوں
حسن کو اپنے ناتھ کیوں رکھوں؟

اب جو پاؤنگی کان کی مچھلی۔
کھا ہی جاؤنگی کان کی مچھلی

یہ کہاں کا موا پتوڑا ہے؟
آنت شیطاں کی ہے کہ تاڑا ہے!

اپنی سوتن پہ نہیں چلن اچھے
اس سے تو پھر بھی ہیں بٹن اچھے

چیر ڈالوں گی لہنگے ساڑی کو
یہ پہناؤ کسی اناڑی کو

دیکھوں نہ بتاہے چرخ کیونکر پیچ
پانوں سے مل کے پھینک دوں سرپیچ

حلقہ غم بناؤں چھلے کو
اب انگوٹھا دکھاؤں چھلے کو

چوہے ونتی نہ پھینکدوں کیوں میں
بھیگی بلی بنی رہوں کیوں میں

داد مردانگی کی اب دونگی
چوڑیاں اب تو میں نہ پہنونگی

اب نہ گھر میں آنے پائے حنا
خون کر ڈالوں گی جو لائے حنا!!

دھکدھکی گھونٹتی گلا ہے اب
بچھڑا ہی پنجرہ بلا ہے اب

تاروں کی طرح موتیاں ٹوٹیں
چاند سورج پہ آسماں ٹوٹیں

ہاں قسم ہے خدائے پاک کی اب
مجھ کو کانٹا ہے کیل ناک کی اب

چولی انگیا سے کوئی کام نہیں
کارسٹ اب نہ لوں تو نام نہیں

کیجیے دوڑ دھوپ وقت آیا
میری خاطر منگائیے سایا

پاؤں کے موزے اب نہ بھولوں گی
بوٹ بنواؤں گی میں تسمو لونگی

گھاگری اب نہ خاک پہنوں گی
میں تو صاحب فراک پہنونگی

سر پہ چادر نہ پاؤں میں لتری
ویل منہ پر ہو۔ ہات میں چھتری

ص صاد کے کل الفاظ زیورات کے نام ہیں۔

بخت چمکے گا مثلِ افشاں اب — مہر ہوگا غدار تاباں اب
اب نہ ہرگز ڈرونگی میں تم سے — اُلٹا پونچھی کرونگی میں تم سے
سُن کے باتیں یہ ۔ اپنی بی بی سے — میں بھی ہارا تھا بدنصیبی سے
یعنے اِس وضع میں بُری گت تھی — آبرو تھی نہ اِس میں عزت تھی
جو کہ انگریزی وضع رکھتے تھے — حلوے مانڈے مزے سے چکھتے تھے
ہر طریقے میں پیش پیش تھے وُہ — کم تھے ہم آبرو میں ۔ بیش تھے وُہ
ہم جہاں جاکے پہنچے ۔ بار ہُوئے — بَن کے گل بھی گئے تو خار ہوئے
کہیں آئی بلا سے ٹالے گئے — کسی دربار سے نکالے گئے
آخر اس رنگ سے بہ تنگ آکر — مِیر صاحب سے بن گئے مسٹر
کوٹ پتلون ڈانٹ کر نکلے — ہیٹ اور بُری چھانٹ کر نکلے
پھر تو ہم کو بھی لوگ جان گئے — اور بیوی کو ہم بھی مان گئے
دونوں عالم سے ہات اُٹھا بیٹھے — اُس صنم کی گلی میں جا بیٹھے
لوگ دیر و حرم کو پُوجتے ہیں — ہم مِس کے قدم کو پُوجتے ہیں۔
دین و دنیا سے واسطہ نہ رہا — خوب طالب کسی نے ہی یہ کہا

ما مقیمانِ کوئے دلداریم
رُخ بدنیا و دیں نمے آریم

[illegible]

غزل

اگست ۱۹۰۶ء میں نیرنگ و اعجاز کو بہمراہی جناب ایڈیٹر مخزن بہ تقریب جلسہ حمایت اردو لکھنؤ جانے اور وہاں مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی خاص مہمان نوازی سے بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ ملا - ذیل کی غزل کا اہم حصہ واپسی پر لکھا گیا تھا - مگر ایک گونہ تامل کی وجہ سے یہ غزل آج تک نیرنگ و اعجاز ہی تک رہی - اب بمصداق ؎ حیف بر جان سخن گر بسخن داں نرسد - آخر کار اعجاز صاحب کو اس کی اشاعت پر مجبور کیا گیا - چنانچہ اب مصنف سے نظر ثانی کرا کر ہدیۂ احباب کی جاتی ہے - (نیرنگ)

خندہ زن ہے یاس میرا شوقِ ساماں دیکھ کر
مسکرا دیتی ہے حسرت دل کے ارماں دیکھ کر

رحم کر صیاد رہنے دے قفس ہی میں مجھے
بال و پر یاد آ گئے صحنِ گلستاں دیکھ کر

یہ کہیں پردہ تکلّمہائے پنہاں کا نہ ہو
دل دھڑکتا ہے تبسّمہائے پنہاں دیکھ کر

کیسے ذرّے - شوقِ نظارہ کی آنکھیں بن گئے
اپنے کوچے میں قدم رکھیو مری جاں دیکھ کر

گرمیاں آخر دلِ اُلفت کی ٹھنڈی پڑ گئیں
زہر پر یہ سرد مہری ہائے یاراں دیکھ کر

کب تراشیں یوں زنانِ مصر اپنی انگلیاں
گر نہوں دیوانہ رُوئے ماہِ کنعاں دیکھ کر

پاسبان و حاجب و درباں کی حاجت یاں نہیں
ہوش اُڑ جاتے ہیں وہ حسنِ نگہباں دیکھ کر

بہرِ تاثیرِ فغاں لازم ہے تخفیفِ فغاں
نالہ زن کچھ سیکھ انجامِ نیستاں دیکھ کر

اِسقدر کم مائگی پر خود نمائی کا یہ حال
داغہائے دل ہنسے سروِ چراغاں دیکھ کر

اے زلیخا سوچ تو لینا تھا کچھ انجام کار
پھاڑنا تھا حضرتِ یوسف کا داماں دیکھ کر

یادگارِ صد تمنّا داغِ دل یاد آ گیا
شمعِ افسردہ سرِ گورِ غریباں دیکھ کر

شوقِ گل میں ہر روش پر دوڑتے پھرنا کہاں
تھک گئے ہم وسعتِ صحنِ گلستاں دیکھ کر

جوششِ نظارہ نے گلشن بنائی ہے نگاہ — لکھنؤ دیکھا کہ آئے باغِ رضواں دیکھکر
کیا ہوا اگر کہدیا ہم نے اُسے خُلدِ بریں — وُہ چمن وُہ آب جو وُہ قصر و ایواں دیکھ کر
لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی ساری خوبیاں — آگئیں یاد رہیں حامد علیخاں دیکھ کر
ہو سخن کو ناز جتنا اپنی خوبی پر بجا — وُہ سخن فہم و سخن سنج و سخنداں دیکھ کر
جنّتِ گوش و نظر تھی اسکی بزمِ مختصر — لُطفِ جاں حاصل ہُوا وُہ ساز و ساماں دیکھ کر
خوانِ یغما کا سماں آنکھوں کے آگے پھر گیا — میز پر اُس کی ہجومِ میہماناں دیکھ کر

چشم و دل اعجاز احساں و تماشا دوست ہیں
آئینگے پھر لکھنؤ اور اُس کے اعیاں دیکھکر

اعجاز

منتخباتِ مجروح

اُردو شاعری کے لیئے غالب مرحوم اور انکے معاصرین اور تلامذہ کا زمانہ مدتوں مایۂ ناز رہے گا۔ اُن کے فیضانِ صحبت سے جن طبیعتوں نے جلا پائی اور جن کی شاعری اوجِ کمال کو پہنچی اُن میں میر مہدی مجروح (خدا انہیں مغفرت کرے) نہایت بلند پایہ شمار کیئے گئے ہیں۔ کچھ بہت زمانہ نہیں گذرا کہ اُنکے انتقال پر انہی اوراق میں اظہارِ ملال ہوا تھا۔ جو لوگ انہیں جانتے تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ ایشیائی شاعری کا ایسا صحیح اور منجھا ہوا مذاق کسی طور میں بمشکل نظر آئیگا۔ اور کیونکر نہ ہو۔ بڑے بڑے باکمالوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اُس آسمانِ سخن کے تارے تھے۔ جس پر میر نظام الدین ممنون۔ مفتی صدرالدین خاں۔ آزردہ۔ حکیم مومن خاں مومن۔ شیخ ابراہیم ذوق۔ نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہ۔ نواب

ضیاء الدین خان نیّر اور نواب علاء الدین خاں علائی جیسے مشاق سخنوروں کے نام آج چمک رہے ہیں۔ ان لوگوں کی ہمنشینی بے مذاق لوگوں کو بامذاق بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اور اُن کی تاثیر کی مثالیں دہلی میں اب تک موجود ہیں۔ پس اس شخص کے لئے جو قدرت سے طبع رسا اور شیریں سخنی حصّے میں لیکر آیا ہو۔ یہ صحبتیں پارس ہی ہونی چاہئیں تھیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اُن کے دیوان مظہر معانی کے حصّہ ابتدائی سے چند منتخب اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اہلِ نظر دیکھ سکیں کہ میر مجروح کی شاعری کس تہہ کی تھی:۔

جنّت و کوثر و طوبےٰ و قصور و انہار　　کچھ نہیں مانگتا وُہ جو کہ ہے خواہاں تیرا
مایۂ نُطق زباں ہے سو عطا ہے تیری　　کونسے منہہ سے ہو مجروح ثنا خواں تیرا

ثنا و حمدِ ایزد ہو رقم کیا　　ہمارا ناطقہ کیا اور ہم کیا
مجھے درپیش ہے توصیفِ وحدت　　مرکب سے کروں اسکو رقم کیا
ترحم طالبِ طاعت نہیں ہے　　مرا محتاج ہے اس کا کرم کیا

حاضر ہو جب خودی تو حضوری کہاں سے ہو　　ہم ہو گئے ہیں آپ ہی باعث حجاب کا

ہے بہت کہنہ ورنہ کہتے ہم　　فرش ہے آسمان محمدؐ کا
دیکھ سکتا ہے ہم کو دوزخ میں　　کب دلِ مہربان محمدؐ کا

رحمت بہانہ جُو ہے گنہگار کے لئے　　بخشش ہے واں جواب لبِ عذر خواہ کا

کوئی آسماں کیا سوا ہوگیا ۔۔۔ کہ افزوں نزولِ بلا ہوگیا
وہ جاتے ہیں دامن بچائے ہوئے ۔۔۔ تجھے جرأتِ شوق کیا ہوگیا
ڈرو نالۂ حسرت آلود سے ۔۔۔ غضب ہوگیا گر رسا ہوگیا
نہ ہلنے دیا پھر صیاد نے ۔۔۔ رہا قید میں گو رہا ہوگیا
ہیں اس تند خو سے یہ گستاخیاں ۔۔۔ تمھیں تم کو مجروح کیا ہوگیا

کہتے ہیں کونسا مطلب تجھے کہنا ہوگا ۔۔۔ اور ہوا بھی تو کوئی شکوہ بیجا ہوگا
سخت مضطر دلِ ہنگامہ طلب ہے یارب ۔۔۔ آج ہی کیوں نہ وہ ہو جائے جو فردا ہوگا
تا کجا یہ دلِ بے شرم نہ ہوگا گستاخ ۔۔۔ جب کہ ہر ناز ترا حوصلہ فرسا ہوگا
صبح گو ہو شبِ وعدہ مگر آنا کیسا ۔۔۔ ابھی وہ بننے سنورنے میں خود آرا ہوگا
آہ جس درد کے انجام میں پھٹتا ہے جگر ۔۔۔ پھر وہ آغاز میں فرمایئے کیسا ہوگا
نہ تو دنیا ہی میسر ہے نہ دیں کے اسباب ۔۔۔ ہائے مجروح کہاں تیرا ٹھکانا ہوگا

طلب کیسی بلانا کیا وہاں خود جا پہنچتے ہیں ۔۔۔ اگر عالم یہی چندے رہا بے اختیاری کا
کبھی چشمِ خمار آلود کی مستی نہیں دیکھی ۔۔۔ بجا ہے حضرتِ ناصح کو دعویٰ ہوشیاری کا
بھلا کیا ایسی رونی شکل پاس آکر کوئی بیٹھے ۔۔۔ اُٹھے آخر وہ جھنجلا کر بُرا ہو اشکباری کا
ہر اک شے کا ہے اندازہ مگر پایاں نہیں ہرگز ۔۔۔ تری غفلت شعاری کا مری امیدواری کا
زبس آنکھوں میں رنگت چھا رہی ہے لالہ و گل کی ۔۔۔ خزاں میں لطف آتا ہے ہمیں فصلِ بہاری کا
کبھی سر پاؤں پر رکھنا کبھی قربان کر اٹھنا ۔۔۔ ہمیں تھوڑا سا ڈھب آتا تو ہے مطلب براری کا
چھپا کل گوشۂ میخانہ میں مجروح نے دیکھا ۔۔۔ یونہی شہرہ سنا تھا شیخ کی پرہیزگاری کا

محفل طرازیاں وہ کہاں اب تو کام ہے — گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
ساقی کی چشم مست کا گردور ہے یہی — زاہد کو آج کل ہی ہیں مے خوار دیکھنا
ہے قہر یا کہ مہر کوئی یہ بھی ڈھنگ ہے — سو بار منھ کو پھیرنا سو بار دیکھنا
ظاہر ہے یہ کہ جاذبِ شبنم ہے آفتاب — کافی ہمیں ہے یار کا ایک بار دیکھنا

کیا شکایت کریں رقیبوں کی — وہ ہی جب ہم سے آشنا نہ ہوا
یاس اس درجہ ہو گئی ہے کہ اب — وصل بھی آرزو فزا نہ ہوا
کام آئی شکر لبی اُن کی — جب مرا لب ملا جدا نہ ہوا
ظلم بیجا ہیں اس کے سب لیکن — کون یہ کہہ سکے بجا نہ ہوا
ہم بھی پابندِ وضع تھے کتنے — مر گئے اُن سے پر گلا نہ ہوا
اس کے تمکینِ ناز سے مجروح — لطف کچھ چھیڑ چھاڑ کا نہ ہوا

بے در مجھ کو روز کے جانے نے کر دیا — اخلاص رفتہ رفتہ بڑھانا ضرور تھا
مجروح حالِ بد کو چھپاتا رہا سدا — مفلس ضرور تھا یہ نہایت غیور تھا

یہ دل لگی کا بھید نہ کھل جائے اور پر — اُس کی طرف نہ بزم میں ہمراز دیکھنا

کچھ عرضِ تمنا میں نہ شکوہ ستم کا تھا — میں نے تو کیا کہا تھا اور آپ نے کیا جانا
چلمن کا الٹ جانا ظاہر کا بہانہ ہے — اسکو تو بہر صورت اک جلوہ دکھا جانا
مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پہ — اے حضرتِ من تم نے دل بھی نہ لگا جانا

ہر تمنائے مُردہ ہے زندہ کس کا یہ رُوئے جانفزا دیکھا

لاکھ گو جمع ہیں سامانِ طرب انگیزی گنجِ غم بھی تو نہیں چھوڑ کے جایا جاتا
سوزشِ دل کو تو ہوتا نہیں مطلق آرام گرچہ دریا ہے ان آنکھوں سے بہایا جاتا

ذرا ذرّہ کی تم مقدار دیکھو ہمارا بخشش و کم کیا اور ہم کیا
نہاں ہر شکر میں ہے سو شکایت مگر سمجھیں گے وہ طرزِ رقم کیا
جھپکنا آنکھ کا منزل رساں ہو یہاں سے دُور ہے ملکِ عدم کیا
چھپے سو بار اک بوسہ جو دیکر وہ جانے شیوۂ اہلِ کرم کیا
نہ ملنے کی قسم کھائی تو بولے ارے تو کیا ہے اور تیری قسم کیا

ایذائیں یہ پائیں ہیں مقدور اگر ہوتا مَیں رسمِ تعشق کو دُنیا سے اٹھا دیتا

تصوّرِ رخِ جاناں میں شب یہ حال ہوا کہ رشکِ خوابِ زلیخا مرا خیال ہوا
یہاں کمال کی وقعت کہاں ہو بدر کو دیکھ پھنسا وہ نقص میں جب صاحبِ کمال ہوا
شروعِ شکوۂ اعدا میں اسقدر خفگی یہ ایسی بات تھی کیا جس کا یہ ملال ہوا
اِسی کا نام ہے آنا تمہیں کرو انصاف کہ آکے بیٹھتے ہی جانے کا سوال ہوا

مَیں عاشق ہوں یہ تم بھی جانتے ہو پھر اسکا ہر گھڑی ہے پوچھنا کیا
وفا ہی میں نہ ہو جب اپنے تاثیر پھر اس کی بیوفائی کا گلا کیا
بہارِ باغ رُوح افزا ہے لیکن نشگفتہ ہو دلِ درد آشنا کیا

ضروری تصحیح

مخزن مطبوعہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء جلد ششم نمبر ششم میں خاکسار ہیچمدان کے چند اشعار چھاپے گئے ہیں۔ یوں تو مجھ کو اعتراف ہے کہ انہیں کیا اور میری مشق اور میرے ذخیرۂ اشعار کیا لیکن تاہم یہ اشعار خاکسار کی ابتدائی مشق کے ہیں اور غالباً ان شعروں کو ناظرین کے [illegible] آج [illegible] کلیات سے خارج کر دیا [illegible] چنانچہ یہ اشعار بھی جو چھپے ہیں خاکسار کے کلیات سے [illegible] خارج کر دیے گئے اور بعض میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ اگر خداوند کریم نے فضل و کرم سے دیوان چھپ کر شائع ہو گیا اور شاید [illegible] اب [illegible] چھپے ہیں تو ناظرین خود ملاحظہ فرما لینگے۔ بہرحال بعض اشعار تو اس کے بالکل اصلاح طلب ہیں چنانچہ ذیل کے اشعار کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ ان اشعار میں سے اکثر اس کلیات سے خارج کر دیئے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین عیب پوش تصحیح فرما کر خاکسار کو مرہون منت بے پایاں فرمائینگے۔ والسلام بالوف التحیۃ وصنوف الاکرام

ہیچمرز علی محمد شاد
(از عظیم آباد)

صفحہ	سطر	مصرع ہائے صحیح	صفحہ	سطر	مصرع ہائے صحیح
۵۴	۱۳	ہو [illegible] جو [illegible]	۵۵	۱	نماز ہی اصل میں ہے یہی عبادت اسکو کہتے ہیں
"	۱۵	[illegible]		۲	یہی ہے [illegible] خالق کی اطاعت اسکو کہتے ہیں
"	۱۶	[illegible]	۵۰	۱۱	کاش اس خاک کے اندر ہی یہ پتلا ہوتا
۵۵	۵	[illegible]	۵۰	۶	جواب [illegible] تیری باتوں کا کیا ابھی سے

عرقِ ماءُ اللحم انگوری

اور

درازیِ عمر

یہ امر بانہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاق حسنہ سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے۔ ایک ہی مرض میں مبتلا تھے۔ ضعفِ دماغ اور تاریکیِ چشم۔ سر کا گھومنا۔ چکرانا۔ تھوڑے کام سے دل گھبرانا۔ جس روز دو چار گھنٹے بیٹھ کر کام کرنا پڑے۔ سر درد ہو جاتا۔ بھوک کا بند ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنا۔ اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع مل جاتا تو صبح کو کوفت اعضا شکنی معلوم ہوتا۔ چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا۔ ایک صاحب نے عرقِ ماءُ اللحم کا استعمال شروع کیا۔ اور دوسرے صاحب اور مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے۔ چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ زرد سے سرخ ہو گیا اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو پچکے ہوئے تھے پر ہو کر رنگ چمکنے لگا۔ تو دوسرے مختلف ادویہ کے کھانے والے نے دوست سے تعجب سے پوچھا۔ یار کیا بات ہے۔ تم تو چار بجے کے بعد چھ سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو۔ صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر ہوا خوری کرنے کو تیار۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں عرق ماءُ اللحم انگوری دوا تشنہ ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ سنکر نہ رہ سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیجو۔

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکیٹ ملاحظہ کیجیے جس نے سول سرجنوں اور دوسرے معزز حکما کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔ آٹھ آنہ کا ٹکٹ بھیج دیجیے۔ سارٹیفکیٹ صحت یافتہ اصحاب کے بھیج دیگا۔

قیمت فی بوتل عہ تین بوتل سے کم بوتل سے فی درجن عللہ بذریعہ ریل منگانے میں محصول کی کفایت ہوگی۔ ریلوے اسٹیشن معہ اپنا پتہ صاف لکھیں۔ نہ بذریعہ ڈاک منگوانے میں علاوہ محصول ڈاک پیشگی آنا ضروری ہے۔

پتہ حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور۔ موچی دروازہ لاہور منزل

مخزن

امیر خسرو کا بچپن

نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ یہ ایک مشہور مثل ہے۔ اولوالعزم پرانے کُلیوں کو توڑتے اور نئے کُلیے قائم کرتے ہیں۔ طوطئے ہند (امیر خسرو) کے کمال نے مثل بالا کا عکس آئینہ ہمت میں دیکھا ہے۔ اُنکے واسطے یہ کہنا پڑتا ہے کہ طوطیِ ہند کی آواز نقارخانۂ گردوں میں کون نہیں سنتا۔ جہاں جاؤ اُن کا کمال بلند آوازہ ہے۔ جس طرف کان لگاؤ اُن کا کلام سامعہ نواز ہوتا ہے۔ صوفیا کی مجلس میں حاضر ہو۔ بزم شعرا میں جاؤ۔ پرانے مکتبوں کی طرف جا نکلو۔ موسیقی کے جلسوں میں بیٹھو۔ گیت گانیوالیوں کے پاس سے گزرو۔ لطیفے کہ مکرنیاں وغیرہ سنو ہر جگہ خسرو یا کھسرو کا نام سنوگے۔ زمانہ بدلا تو مذاق بھی بدل گئے۔ ہم کسی باکمال کا نام یا کلام سنتے ہیں تو اس کے حالات کا تفحص اور شوق دل میں پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی بیخبر۔ پیش نظر کتابیں خالی۔ دل کی آرزو دل میں رہجاتی ہے۔ جس طرح ایک تازہ پودا پانی نہ ملنے سے خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ عزیز شوق مدد نہ پہنچنے سے افسردہ ہو کر رہجاتا ہے قیامت یہ ہے کہ جن اہل کمال کے نام مقبولیت کی برکت سے زیادہ روشن ہیں۔ انہیں کے حالات پر تاریکی نے زیادہ پردے ڈالے ہیں۔ امیر خسرو کی مقبولیت مسلم۔ تصوف کی کتابیں پڑھو۔ تذکرے دیکھو۔ معدودے چند واقعات پاؤگے۔ ان واقعات سے

اُس مذاق کی تسکین کی سیری نہ ہوگی جو حال کی سوانح عمریاں دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلاف میں باکمال بھی تھے وقائع نگار بھی۔ پھر یہ کیا غضب ہے کہ ایسے زندہ جاوید کُملا کے حالات لحدِ فنا میں سو رہے ہیں۔ حال یہ ہے کہ گزشتہ تین چار صدیاں ہم پر ایسی گذری ہیں جن میں خیالی و ذہنی مضامین کی حکومت ہمارے دماغوں پر رہی ہے۔ علوم میں معقولات۔ فنون میں شاعری۔ رات دِن انہیں کا چرچا تھا۔ اور ان دونو کو واقعات سے بہت کم مناسبت ہو۔ اس زمانہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصنیف پڑھو اُسکا سرمایہ ناز ذہنی مُوشگافی پاؤ گے۔ جس کے لئے اپنا خیال اور دماغ کافی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعتیں حقائق سے غیر مناسب ہوگئیں۔ مذاق واقعات سے آشنا نہ رہے۔ تاریخی سرمایہ کو طاقِ نسیان میں پڑے پڑے فنا کی دیمک چاٹ گئی۔ خلاصہ یہ کہ پچھلوں نے اگلوں کی کمائی ڈبو دی۔ اور اُسکو ڈبو کر فنِ تاریخ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غنیمت ہے کہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے نام اور کام یورپ نے عرب و عجم کو سُنائے اور دکھائے تب ہم کو یہ خبر ہوئی کہ ہم میں بھی یہ سرمایہ نازش تھا۔ ہندوستان میں بہت سے عُلمائے نامور گزرے ہیں مگر اُنکے حالات میں کوئی تذکرہ یا طبقات کی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگر آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان لکھ کر تھوڑی بہت جان نہ ڈال دیتے تو اُن کا نام بھی زندہ نہ رہتا۔ شعرا کا حال سب سے زیادہ تباہ ہوا۔ یہاں ازل سے نام و نشان سے دشمنی چلی آتی ہے۔ تذکروں میں مسجّع اور مقفّیٰ عبارت بہت۔ نام اور تخلص کی رعایت سے مملو فقرے مسلسل۔ لیکن سلسلۂ واقعات معدوم۔ تذکرۂ حالات مفقود۔ اس ظلمت کدہ میں جب کسی طرف سے روشنی کی کرن آجاتی ہے تو آنکھیں سی کھل جاتی ہیں۔ دل نورِ مسرّت سے روشن ہو جاتا ہے۔

یہ تو مشہور ہے کہ امیر خُسرو کے چار دیوان تھے۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیات۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ ان چاروں کا خلاصہ (دیوان خُسرو کے نام سے) ہندوستان کے

ایک مشہور مطبع نے چھاپا ہے - عبرت کی آنکھیں ان اربعہ عناصر کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں - کلام کو ایسا مسخ کیا ہے کہ اصلی خط و خال کا نشان باقی نہیں - مطبوعہ نسخہ کو کسی صحیح مجموعہ سے ملا کر پڑھئے تو اصلیت جلوہ گر ہو -

• تحفۃ الصغر کا ایک قدیم قلمی نسخہ حال میں میرے ہاتھ آیا ہے - دیباچہ میں مصنف نے اپنی ابتدائی شاعری کے کچھ حالات لکھے ہیں جو بیحد دلچسپ ہیں - "تنہا خوری پسندیدہ نہیں مخزن کے خوانِ نعمت پر اُس کا لُبِ لُباب چُنتا ہوں - ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے - عبارت صنائع بدائع سے مرصع نہ ہوتی تو لفظی ترجمہ پیش کرتا - جس سے حال و قال دونو کا لُطف حاصل ہوتا -

اِس چھوٹے سے دیوان میں ۱۶ برس کی عُمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے - ابتداءً امیر خُسرو کا تخلّص سُلطانی تھا وُہی اِس مجموعہ میں جا بجا نظر آتا ہے - کم کم خسرو بھی ہے - قصیدہ - غزل - رباعی - قطعہ ہر قسم کے کلام پاؤ گے - تصوّف - تغزل - مدح - ظرافت - مفہوم کا بھی ہر رنگ موجود ہے - ہجو نام کو نہیں - اقسامِ کلام کا شمار حسبِ ذیل ہے :- قصائد ۳۴ - ترجیع ۲ - ترکیب بند ۲ - قطعات ۲۳ - غزلیات (غیر مرتب) ۱۸ مثنوی یک - رباعیات ۲۰۵ - قصائد میں بعض قصیدے سُلطان علاؤالدین کی مدح میں ہیں - یہ غالباً الحاقی ہیں اِس لئے کہ سُلطان ممدوح ۶۹۵ھ میں تخت نشین ہوا اور اُسوقت امیر خُسرو کی عُمر ۴۳ برس کی تھی -

خُلاصہ دیباچہ میں جو حالات آپ ابھی پڑھینگے اُنکے سوا یہ دو چار اَور معلوم ہو سکتے ہیں

امیر خسرو* ۶۵۲ھ کو مومن آباد پٹیالی (ضلع ایٹہ ممالک متحدہ) میں پیدا ہوئے - پانچ برس کے تھے کہ دارالکمال دہلی پہنچے - باپ کا سایہ کم سنی میں سر سے اُٹھ گیا - نانا نے

* سالِ پیدائش قران السعدین کے ان اشعار سے واضح ہوتا ہے - آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت - بود ۶۹۸ ششصد و ہشتاد و ہشت - سالِ من از مرزنہ اگر بر رسی - راست بگویم ہمہ شش بود و سی - ۶۹۸ - ۳۶ = ۶۵۲ ہجری -

تربیت کی۔ یاوری طالع دیکھو۔ اُس زمانہ میں حضرت سلطان نظام الدین اولیا کا قیام انکے ننہال میں تھا*۔ انہوں نے لڑکپن میں ہی شرف بیعت حاصل کیا۔ نیز منزلِ سخن کی ہدایت پائی۔ مرشدِ کامل نے آغاز ہی میں یہ گر تلقین فرما دیا تھا۔ "بطرز صفاہانیاں بگو" یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز۔ ابتداءً جو شعر کہتے وُہ حضرت کے ملاحظہ میں پیش کرتے۔ دیوانِ منتہی حضرت نے خود انکو پڑھایا اور اس کے رموز و اشارات ذہن نشین فرمائے۔ اس فیضان نے کلامِ خسرو میں وُہ سوز و گداز پیدا کر دیا کہ آجتک جو سنتا ہے دِل تھام لیتا ہے۔ (یہ حالات سیر الاولیا و سیر العارفین سے ماخوذ ہیں)۔

خلاصۂ دیباچۂ تحفۃ الصغر

بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایتِ ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رُباعی کہنی شروع کی۔ فضلا و علماء روزگار انکو سنکر تعجب کرتے تھے انکے تعجب سے میرا شوق اُبھرتا تھا۔ وُہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم تھا کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثلِ قلم سرنگوں رہتا تھا۔ اور رات کو مطالعہ میں مصروف۔ یہانتک کہ نظر میں دقت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کے امتحان لیتے تھے۔ امتحان سے میرا دِل گرماتا تھا۔ اور دِل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اسوقت تک کوئی اُستاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا۔ قلم کو بے راہ روی سے روکتا۔ نقائص کو دُور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ بس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشقِ سخن کرتا تھا۔ اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔ اسی طرح اہلِ دل

* قدیم دہلی کا ایک دروازہ منڈی دروازہ کے نام سے مشہور تھا اسکے پاس ہی امیر خسرو کے ننہال کا مکان تھا اسکا موقع اب بی بی نور کے مقبرہ کے قریب متصل درگاہ حضرت قطب صاحب ہے ۱۲

کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا - اُستادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا حتّٰی کہ مذاقِ لطفِ کلام و ذوقِ سخن سے آشنا ہوا - انوری و سنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا - جو عمدہ نظم نظر آتی اس کا جواب لکھتا - جس دیوان کا مطالعہ کرتا اُسی کے انداز پر شعر کرتا - ایک عرصہ تک خاقانی کے دامنِ دولت سے لپٹا رہا - جو الفاظ اُسکے کلام میں مغلق تھے اُنکی تعلیق کی (یعنے نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم بمقتضائے نوعمری کما حقہٗ حقائقِ کلام واضح نہیں ہوتے تھے - ہرچند میری ہمّت آسمان پیما تھی لیکن اُستاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی - باایں ہمہ عاقبتہ الامر اُستاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی - چونکہ میرے کلام کا کوئی خاص مرجع نہ تھا ہر اُستاد کے رنگ میں کہتا تھا - اِس لئے اِس مجموعہ میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے -

حاصل کلام میرے والد نے تحصیلِ علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا - یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کے تکرار تھے - میرے اُستاد مولانا سعد الدین خطّاط مشقِ خط کی تاکید کرتے تھے - مَیں اپنی ہی دُھن میں تھا - وُہ پیٹھ پر دُرّے لگاتے مجھ کو زلف و خال کا سَودا تھا - انتہا یہ کہ اُسی سن میں وُہ شعر و غزل کہنے لگا جسکو سنکر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی - ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے اُستاد کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے واسطے بُلایا - مَیں دوات قلم لیکر ہمراہ ہوا - اُس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیز الدین کاکا کلاتی نظر بند تھے - خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے - جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعہ کتاب میں مصروف تھے - اثنائے مطالعہ میں جب وُہ کسی مضمون پر گفتگو کرتے تھے تو اُن کے مُنہ سے موتی جھڑتے اور جواہر آبدار زبان سے نکلتے - میرے اُستاد نے اُن سے کہا کہ یہ میرا ذرا سا شاگرد اس بچپن میں نظم کا بیحد شائق ہے - شعر پڑھتا بھی خوب ہے - کتاب اسکو دیکر امتحان لیجئے

خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھ کو دیکر سنانے کی فرمایش کی۔ میں نے اشعار ترنم آمیز لہجہ میں پڑھنے شروع کیے۔ اس کے اثر سے آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی۔ پھر میرے استاد نے کہا کہ پڑھنا سن لیا اب کوئی بیت پیش کر کے جودت طبع کی آزمائش کیجیے۔ خواجہ ممدوح نے چار غیر متناسب چیزوں کے نام لیکر کہا انکو نظم میں موزون کرو۔ وہ نام مو - بیضہ - خربزہ - تیر تھے۔ میں نے اسے جلسہ میں یہ رباعی موزون کرکے سنائی ؎

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم ست — صد بیضۂ عنبریں برآں موئے ضم ست
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا کہ — چوں خربزہ دندانش درون شکم ست

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی خواجہ نے بہت ہی آفرین فرمائی۔ اور نام پوچھا۔ میں نے کہا خسرو۔ باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا لاچین۔ کہا لاچین ترک خطا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہنجطا ترک ہے۔ دریافت کیا تم درم خریدۂ ناصری[۱] ہو۔ عرض کی سلطانی شمسی[۲] ہوں (سلطانی اشرفی کو کہتے تھے۔ درم خریدہ کی کیسی رعایت ہے)۔ فرمایا چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہے لہٰذا سلطانی اپنا تخلص رکھو۔ اس کے بعد بہت سی باتیں میرے دل بڑھانے کی کیں۔ اور فن کے متعلق بہت سی دقیق باتیں تلقین فرمائیں۔ جنکو میں دل میں رکھتا گیا۔ اس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ سکہ بہت رائج ہے۔ اس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر چونکہ زمانہ لڑکپن کا تھا اس لئے کبھی کلام جمع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ میرا بھائی تاج دین زاہد جس کی باریک بین طبیعت مشاطۂ طرۂ اشعار ہے۔ اُن اشعار کو فراہم کرلیتا تھا۔ اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس

[۱] اشارہ بجانب سلطان ناصرالدین۔ [۲] اشارہ بجانب سلطان شمس الدین شمسی

کی عمر تک کہا اسکا ایک مجموعہ اُس نے بنایا۔ مَیں نے اُسکو دیکھ کر کہا کہ یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔ اُس نے نہ مانا اور فرمائش کی کہ اس کو مسلسل کر دو۔ چنانچہ مَیں نے ہر حصّہ کلام پر ایک شعر اُس کے عنوان کے طور پر کہکر لگا دیا۔ یہ میرا ایجاد ہے۔ مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام تحفۃ الصغر ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہر چند اوراقِ باطل جمع ہیں۔ میدان نشیب فراز سے معمور تھا اور پاؤں میں لنگ تھی۔ مَیں نے بہت چاہا کہ بادپائے قلم کو جنبش نہ کرنے دُوں۔ لیکن دوستوں نے نہ مانا۔ عموماً سب اور خصوصًا بھائی تاج دین برابر مُصر رہے۔ بیس برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلک محبّت میں سرفراز رہا ہُوں۔ اور اخوت کے اثر نے ہم دونو کو بے مبالغہ برادران توام کی مثال بنا دیا ہے۔ خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے۔ ؎

بسکہ جانم یگانہ شد با او   در گمانم کہ این منم یا او

اُسکا مقصود یہ تھا کہ یہ دفتر پریشان کسی شمار میں آجائے۔ مَیں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کرینگے۔ وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) کہ بچپن کا کلام ہے اعتراض نہ کریگا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا۔ مَیں کہتا تھا کہ اِس میں نشتر وگربہ (رطب و یابس) بہت ہے۔ اسکا جواب تھا کہ لوگ اسکو تعویذ بناکر موشک بازو (بازو کی چوہیا) پر باندھینگے۔ غرض برادر موصُوف کے اِصرار سے اس مجمُوعہ کو یارانِ خُوب شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہُوں۔ اُمید ہے کہ بہ طیبِ خاطر قبول فرمائینگے"۔

نظرے خوش گذرے

آپ نے دیباچہ کا خلاصہ مُلاحظہ کیا۔ دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ امیر خسرو کو کشور سخن کا تاجدار کس چیز نے بنایا۔ فطری مناسبت۔ کثرت مطالعہ۔ ولولۂ شوق۔

اصلی سبب تھے۔ سوسائٹی کا قابل ہونا ہمسروں کی چھیڑ چھاڑ۔ بزرگوں کی نقادی شفقت دوست یارانِ ہمدم کی ہمت افزائی۔ ان سے اُن اسباب کو قوت پہنچی۔ اور سب کے مجموعی زور نے تخت خسروی پر جا بٹھایا۔ جب جوہر قابل بنکر دربار سلاطین میں پہنچے تو خان شہید (شاہزادہ محمد سلطان پسر سلطان غیاث الدین بلبن) سے مربی ملے۔ جو خود سخن سنج ونقادِ فن تھے۔ قران السعدین میں امیر خسرو نے اپنی ترقی کا جو گُر لکھا ہے وہ ہر راہرو منزلِ کمال کے واسطے توشہ بن سکتا ہے۔ ہ

ہر چہ ستائش کُندم مرد ہوش — گرچہ بود رہت نیارم بگوش
زانکہ چوزیں فن بغرور اوفتم — ترسم ازیں مرتبہ دُور اوفتم
چرب زبانی نبود سُود مند — طفل بود کش بفریبی بقند
آنکہ شناسندہ ایں گوہر ست — گر ہمہ نفریں کُندم در خورست
وانکہ بتقلید نشست اندریں — نشنوم از خود کُندم آفریں

شروانی (از بھیکن پور ضلع علی گڑھ)

دولت و عزت

زر سے گلِ کاغذ گلِ تر ہو نہیں جاتا — مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا — ہر قطرۂ بے مایہ گہر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر رند کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

دولت نہیں انسان کی کچھ قدر بڑھاتی — دُنیا سے دُنی کام کسی کے نہیں آتی
گو فقر ہو عالی نسبی پر نہیں جاتی — بینا ہیں وہ۔ جو دیکھتے ہیں جو ہر ذاتی

محتاجی سے۔ کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

(منشی احمد علی بی۔ اے)

فارسی سجع سکّوں پر

سلسلہ کے لئے دیکھو رسالہ بابت مارچ ۱۹۰۷ء

اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۶۹ھ - ۱۱۱۸ھ ہجری

اس بادشاہ نے اپنی پچاس سالہ حکومت میں تقریباً سارے ہندوستان پر جس میں دکن بھی شامل ہے۔ قبضہ اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس کے سکے بعض ایسے مقامات میں ڈھلے جہاں اُس سے پہلے اسلامی سکے کبھی رائج نہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک جو جو سکے مل چکے ہیں۔ اُن سے دارالضربوں کی تفصیل یُوں قائم ہوتی ہے :-

اکبرآباد - لاہور - شاہجہان آباد - برہان پور - پٹنہ - سورت - ٹھٹھہ - کابل - اجمیر - مُلتان - نارنول - جوناگڈھ - کمبھت - اٹاوہ - خجستہ بنیاد اورنگ آباد - گولکنڈہ - مچھلی بندر - احمد نگر - بیجاپور - چینا پٹن (مدراس) نصرت آباد - بریلی - لکھنؤ - عالمگیر پور - ظفر پور - ظفر آباد -

مذکورہ شہروں میں سے ضرب کے لحاظ سے شاہجہان آباد دارالخلافہ - اورنگ آباد خجستہ بنیاد - مُلتان دارالامان - اجمیر دارالخیر - لاہور دارالسلطنۃ - بیجاپور دارالظفر - کابل دارالملک اور اکبر آباد مستقر الخلافہ کی شان سے مشرف کیے گئے تھے -

عالمگیر نے اپنے سکہ کی نظم اپنے آپ تصنیف کی تھی - جس کا قصہ مشہور ہے اور وجہ بیان کی جاتی ہے کہ اُس نے دربار کے شعرا نے جو سجع لکھا تھا اُس کو اپنے لیے پسند نہ کیا کہ بُرا شے دستور کے موافق سجع کہنے والے کو انعام اور خلعت

دینا پڑتا جو عالمگیر کی کفایت شعار طبیعت کے خلاف تھا۔ لیکن ہم اس نقل کو باور کرنے میں اس لئے توقف کرتے ہیں کہ جو سجع اورنگ زیب نے اپنے آپ کہا وہ درحقیقت ایسا تھا کہ اس سے بہتر لکھا جانا ممکن نہ تھا۔ وہ سجع سونے اور چاندی کے سکوں کا روپ اس طرح دکھاتا ہے کہ:۔

(۱) سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

(۲) سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اعظم شاہ ۔ سنہ ۱۱۱۹ ہجری

اس کے احمد آباد۔ برہان پور۔ اور خجستہ بنیاد۔ (اورنگ آباد) کے دار الضرب کے ڈھلے ہوئے سکے ملے ہیں۔

اس کی نظم کا ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

(۱) سکہ زد در جہاں بدولت و جاہ
پادشاہ ممالک اعظم شاہ

مرزا کام بخش سنہ ۱۱۱۹-۲۰ ہجری

مغلیہ خاندان کا یہ پہلا شاہزادہ تھا جس نے حیدرآباد دکن کو دار الضرب مقرر کیا۔ اس کے بیجاپور اور حیدرآباد کے سکے دستیاب ہوئے اور سجع یہ تھا۔

(۱) در دکن زد سکہ بر خورشید و ماہ
بادشاہ کام بخش دین پناہ

بہادر شاہ اوّل ۱۱۱۹ سنہ ۲۳ ہجری

اس عہد کے دار الضرب - اکبر آباد - لاہور - شاہجہان آباد - برہان پور عظیم آباد (پٹنہ) سورت - اجمیر - پشاور - خجستہ بنیاد - تسولا پور - اور اجین تھے - نہ کسی اور ضرب کا سکہ نہ کسی پر سجع دیکھنے میں آیا -

برہان پور دار السرور - لاہور دار السلطنت - بیجا پور دار الظفر - اجین دار الفتح - اجمیر مستقر الخلافت - اور اکبر آباد مستقر الملک مشہور تھے -

---

جہاندار شاہ سنہ ۱۱۲۴ ہجری

اکبر آباد - شاہجہان آباد - سورت - اور خجستہ بنیاد کے ضرب شدہ سکے جہاندار کے نام سے رائج ہوئے تھے - اکبر آباد وہی مستقر الملک تھا جیسا کہ بہادر شاہ کے عہد میں سجع بھی تھا -

(۱) بزد سکہ چوں مہر صاحب قِراں
جہاندار شہ بادشاہ جہاں

(۲) در آفاق زد سکہ چوں مہر و ماہ
ابو الفتح غازی جہاندار شاہ

فرخ سیر سنہ ۱۱۲۴-۱۱۳۱ ہجری

سات برس میں ذیل کے مقامات میں سکّہ ڈھالا :-
اکبرآباد (مستقر الملک، ومستقر الخلافہ) لاہور - شاہ جہان آباد - پٹنہ عظیم آباد - سورت - ملتان - گوالیار - اٹاوہ - چیناپٹن (مدراس) بریلی - آرکٹ - کٹک - عظم نگر - امتیاز گڑھ - گوٹی - گنگ پور - مرشد آباد - برہان پور (دار السرور) بیجاپور (دار الظفر) سجع صرف ایک دستیاب ہوا :-

(۱) سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

رفیع الدرجات سنہ ۱۱۳۱ھ

اس سال اکبرآباد - لاہور - شاہجہان آباد - پٹنہ اور معظم آباد کی ضربوں سے سکّے ڈھلے تھے - جن پر رفیع الدرجات کا نام تھا - ایک سجع بھی تھا :-

(۱) زد سکہ بہند با ہزاراں برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

رفیع الدولہ سنہ ۱۱۳۱ھ

سجع غائب ہے لیکن ذیل کی دارالضربوں سے کام لیا گیا تھا -
اکبرآباد - لاہور - شاہجہان آباد - عظیم آباد (پٹنہ) - سورت خجستہ بنیاد - بریلی اور مرشد آباد -

---

نیکوسیر۔ سنہ ۱۱۳۱ ہجری

اس کے زمانہ کے صرف سورت کے سکے دیکھنے میں آئے۔ لیکن سجع کی خبر نہیں۔

ابراہیم۔ سنہ ۱۱۳۲ ہجری

شاہجہان آباد کی ضرب کا سکہ اور ایک سجع بھی موجود ہے۔

(۱) سکہ بر سیم زد اندر جہاں
بفضل محمد ابراہیم شاہ شاہاں

محمد شاہ۔ سنہ ۱۱۳۱ - ۶۱ھ

ہندوستان میں اس بادشاہ کا تسلط خوب تھا جیسا کہ اُس کے عہد کے دار الضربوں کی تفصیل سے ظاہر ہوگا۔

اکبر آباد۔ لاہور۔ شاہجہان آباد۔ عظیم آباد۔ سورت۔ ٹھٹھہ۔ اکبر نگر۔ اودہ۔ کشمیر۔ اٹاوہ۔ خجستہ بنیاد۔ بریلی۔ مرشد آباد۔ گڑہ۔ اجاپور۔ اسلام آباد (چٹ گاؤں) بنارس۔ شاہ آباد۔ سوا جیپور۔ امتیاز گڑہ۔ اور فرخ آباد۔

ہمیں ایک سجع کا پتہ بھی چلا۔ جس کا سنہ تو ۱۱۳۱ نیکوسیر کے زمانہ کا لیکن نام اُس میں محمد شاہ کا ہے۔ اِسی لئے ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

(۱) سکہ زد در جہاں بہ لطفِ اِلٰہ
بادشاہِ زماں محمد شاہ

احمد شاہ ۱۱۶۱ ۶ ہجری

اس کے عہد میں اکبر آباد۔ شاہجہان آباد۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد۔ بنارس۔ احمد نگر۔ فرخ آباد۔ اور مراد آباد۔ دار الضرب قائم کئے گئے تھے۔ سجع کا حال معلوم نہ ہوا۔

عالمگیر ثانی ۱۱۶۷-۷۳ ہجری

اس بادشاہ کے حکم سے اکبر آباد لاہور۔ شاہ جہان آباد۔ مرشد آباد۔ احمد نگر۔ فرخ آباد۔ امتیاز گڑھ۔ اندر پور یا اندور میں سکوں پر ضرب کی گئی۔ سجع بھی تھا۔

(۱) سکہ زد بر ہفت کشور ہمچو تاباں مہر و ماہ
شاہ عزیز الدین عالمگیر غازی بادشاہ

شاہ جہان ثالث ۱۱۷۳ ہجری

شاہ جہان آباد۔ احمد آباد۔ احمد نگر۔ فرخ آباد۔ اندر اپور اور اسلام آباد کے ضرب کے صیغوں نے سکہ ڈھالے تھے۔

شاہ عالم ۱۱۷۳-۱۲۲۱ ہجری

ابھی تک دہلی کے تخت کی حکومت دُور دُور تھی۔ ذیل کے شہروں میں شاہ عالم کے نام کی مہر سکوں پر لگی:۔

اکبر آباد۔ شاہ جہان آباد۔ احمد آباد عظیم آباد۔ سورت۔ مرشد آباد۔ احمد نگر۔ فرخ آباد۔ اٹاوہ۔ بنارس۔ بیجاپور پٹن۔ دل شاد آباد۔ جہانگیر نگر۔ (ڈھاکا) سری نگر۔

لکھنؤ۔ اور نجیب آباد۔

شعر یہ تھا۔ سکہ زد بر ہفت کشور سایۂ فضل اللہ

حامی دینِ محمد شاہ عالم بادشاہ

ضرب فرخ آباد

حامیٔ دینِ محمد سایۂ فضلِ اللہ

سکہ زد در ہفت کشور شاہ عالم بادشاہ

بیدار بخت ۔ سنہ ۱۲۰۳ ہجری

صرف شاہجہان آباد اور احمد آباد کی ضرب کے سکوں کا حال کھلا۔

محمد اکبر ثانی سنہ ۱۲۲۱-۱۲۵۳ ہجری

صرف شاہجہان آباد اس بادشاہ کا دار الضرب تھا۔

بہادر شاہ ثانی سنہ ۱۲۵۳-۱۲۷۵ ہجری

اس آخری برائے نام بادشاہ کا دار الضرب بھی شاہجہان آباد تھا اور یہ اشعار انکے مشہور ہیں:۔

بزر زد سکۂ نصرت طرازی

سراج الدین بہادر شاہ غازی

سکہ زد در جہاں بفیضِ اللہ

شاہ کشورستان بہادر شاہ

اب ہم ہندوستان سے گذر کر ایران پہنچتے ہیں۔ اور اس سلطنت کے جو جو سکے دستیاب ہو چکے ہیں اُن کی نظم سنانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایران کے

خاندانوں کو ہم نے تفصیل کی آسانی کے لئے جُدا کر کے ہر بادشاہ کے نام کے بعد اُس کی تاریخ تخت نشینی بھی لکھدی ہے - ہمارے مضمون میں کوئی صفت ہے تو یہی کہ اسے محض سکّوں کے نقوش کی مدد سے لکھا اور برائے نام تاریخی کتابوں سے واقعات کو ملالیا ہے -

۱ خاندانِ صفوی -

اسمعیل شاہ ثانی ۹۸۴ھ ہجری

(۱) زمشرق تا بمغرب گر امام است
علی وآل او مارا تمام است

عبّاس شاہ ثانی ۱۰۵۲ھ ہجری

(۱) بگیتی سکّہ صاحبقرانی
زد از توفیقِ حق عباس ثانی

(۲) بگیتی آنکہ اکنوں سکّہ زد صاحبقرانی
ز توفیقِ خدا کلب علی عباس ثانی

سلیمان شاہ اوّل ۱۰۷۷ھ ہجری

(۱) زبعد ہستی عبّاس ثانی
صفی زد سکّۂ صاحبقرانی

(۲) بہر تحصیلِ رضای مقتدای انس و جاں
سکّۂ خیرات بر بدر زد سلیمانِ جہاں

(۳) سکۂ مہرِ علی را تا زدم بر نقدِ جاں
گشت از فضلِ خدا محکوم فرمانِ جہاں

سلطان حسین اوّل سنہ ۱۱۰۵ھ

(۱) گشت صاحب سکّہ از توفیقِ ربّ المشرقین
در جہاں کلبِ امیر المومنین سلطان حسین

(۲) زد ز توفیقِ حق بچہرۂ زر
سکّہ سلطان حسینِ دین پرور

سلطان طہماسپ ثانی سنہ ۱۱۳۵ ہجری

(۱) بگیتی سکّہ صاحبقرانی
زد از توفیق حق طہماسپ ثانی

(۲) سکّہ زد طہماسپ ثانی بر زرِ کامل عیار
لافتیٰ الّا علی لاسیف اِلّا ذو الفقار

(۳) از خراسان سکّہ بر زر شد بتوفیقِ خدا
نُصرت و امداد شاہ دین علی موسیٰ رضا

عباس ثالث سنہ ۱۱۴۴ ہجری

(۱) سِکّہ بر زر زد بتوفیق الٰہی در جہاں
ظلّ حق عباس ثالث ثانی صاحبقراں

سلطان حسین ثانی سنہ ۱۱۶۶ ہجری

(۱) دارد ز شاہِ مردان فرمانِ حکمرانی
فرزند شاہ طہماسب سلطان حسین ثانی

سلطان محمد سنہ ۱۱۲۰ ہجری

(۱) بزر زد سکہ از الطاف سرمد
شہِ والا گہر سلطان محمد

ب ۔ خاندانِ داؤد ۔

احمد شاہ سنہ ۱۱۳۹ھ

(۱) سکہ زد بر ہفت کشور چتر زد چوں مہر و ماہ
وارثِ ملکِ سلیماں گشت احمد بادشاہ

سلیمان شاہ ثانی سنہ ۱۱۶۳ ہجری

(۱) زد از لطفِ حق سکۂ کامرانی
شہِ عدل گستر سلیمانِ ثانی

(۲) بر فروز روئے (؟) زمے چوں طلوع مہر و ماہ
وارثِ ملک شد سلیماں بن سادات شاہ

ج ۔ خاندانِ افغانان ۔

محمود شاہ سنہ ۱۱۳۵ ہجری

(۱) سکہ زد از مشرقِ ایراں چو قرصِ آفتاب ۔

شاہ محمودِ جہانگیرِ سیادت انتساب

(۲) فرو رود بزمیں ماہ و آفتابِ منیر
زرشکِ سکّہ محمودِ شاہ عالمگیر

اشرف شاہ ۔ سنہ ۱۱۳۷ ہجری

(۱) بہ اشرفی اثرِ نامِ آں جناب رسید
شرف ز سکّہ اشرف بر آفتاب رسید

(۲) دست زد بر جلالۃ اشرف شاہ
بود تعبیرِ سکّہ دادگشاہ

(۳) زلطفِ شاہِ اشرفِ حق شعار
بزر نقش شد سکّہ چار یار

د ۔ خاندانِ افشاری۔

نادر شاہ ۔ سنہ ۱۱۴۹ ہجری

(۱) سکّہ بر زر کرد نامِ سلطنت را در جہاں
شاہِ شاہاں نادرِ صاحبقراں

(۲) ہست سُلطاں بر سلاطینِ جہاں
شاہِ شاہاں نادرِ صاحبقراں

عادل شاہ ۔ سنہ ۱۱۶۰ ہجری

(۱) گشت رائج بحکم لم یزلی

سکّہ سلطنت بنامِ علی

ابراہیم شاہ ۱۱۹۱ھ

(۱) سکّہ صاحبقرانی زد بتوفیقِ الٰہ
ہمچو خورشیدِ جہاں افروز ابراہیم شاہ

شاہ رُخ ۱۱۶۳ ہجری

(۱) (تبرتا) شاہ رُخ زد سکّہ صاحبقرانی را
(دو) بارہ ا ؟) دولتِ ایراں گرفت سرجوانی را

(۲) سکّہ زد در جہاں بحکمِ خدا
شاہ رُخ کلبِ آستانِ رضا

(۳) سکّہ زد ازسعیِ نادر ثانیِ صاحبقراں
کلبِ سلطانِ خراساں شاہ رخ (شاہِ) جہاں

۳- خاندان زند-

لطف علی خان ۱۲۰۳ ہجری

(۱) گشت زود سکّہ بر زر
لطف علی بن جعفر

س- سلسلۂ سجع علی رضائی-

طہماسپ ثانی ۱۱۳۵ھ و عباس ثالث ۱۱۴۴ھ

(۱) از خراسان سکه بر زر شد بتوفیق خدا
نصرت و امداد شاهِ دیں علی موسیٰ رضا

ابراہیم شاہ ۱۱۶۱ھ

(۱) ز فیضِ حضرت باری و سرنوشتِ قضا
رواج یافت بزر سکۂ امامِ رضا

محمد حسن و آقا محمد ۱۱۶۳ھ

(۱) بزر سکہ از میمنت زد قضا
بنامِ علی بن موسیٰ رضا

ص سلسلہ مہدیہ۔

کریم خاں و آقا محمد

(۱) تا زر و سیم در جہاں باشد
سکۂ صاحب الزماں باشد

کریم خاں۔ ابوالفتح صادق۔ علی مراد۔ و آقا محمد ۱۱۶۳ھ

(۱) شد آفتاب و ماہِ زر و سیم در جہاں
از سکۂ امامِ بحق صاحب الزّماں

آزاد خاں ۔ سنہ ۱۱۶۳ ہجری

(۱) تا کہ آزاد در جہاں باشد
سکۂ صاحب الزماں باشد

آقا محمد سنہ ۱۱۹۳ھ

(۱) تا زر و سیم را نشاں باشد
سکۂ صاحب الزماں باشد

(۲) بر زر و سیم تا نشاں باشد
سکۂ صاحب الزّماں باشد

ط ۔ خاندان قاچار

ناصر الدین شاہ سنہ ۱۲۶۴ ہجری

(۱) ہر شیر دل کہ دشمن شہ را عیاں گرفت
از آفتاب ہمت ما ایں نشاں گرفت

محمد مشرّف الحق (از ایڈن برا)

تم نے کب مانی بھلا میری کہی — تم تو کرتے ہو سدا اپنی کہی
پند گو کی پند ہیں تھا شہد بند — ہم کو کیوں کڑوی لگی میٹھی کہی
اپنی کج فہمی سے ہم سمجھا کئے — بات اُلٹی تم نے جو سیدھی کہی
ناصحا کیوں عشقبازی ہے بُری — واہ وا استاد جی اچھی کہی

بیوی کا انتخاب

(انگریزی سے ترجمہ)

اماں حوا کا آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ عورت مرد کی مونس و رفیق ہونے کے لئے بنائی گئی ہے۔ پس یہ رفیق طریق جس قدر اچھا ہو اسی قدر مرد کی خوش قسمتی سمجھو۔ کیونکہ

زنِ نیک خو سیرت و پارسا ۔۔۔ کند مردِ درویش را پادشاہ

یہ بتلا سکنا کہ آیا فلاں شخص شادی کر کے تباہ ہو جائیگا یا سنبھل جائیگا۔ بہت زیادہ اس کی بیوی پر منحصر ہے۔ دنیا میں کوئی چیز ایک نیک وجہ سے افضل اور نہ ہی کوئی چیز ایک بری بیوی سے بدتر ہے۔

ایک دفعہ امریکہ کے نامور موجد اڈیسن صاحب کو انکے ایک دوست نے صلاح دی کہ امور خانہ داری کو جو باوجود نوکروں کی ایک بڑی تعداد کے اُلجھے پڑے تھے سنوارنے کے لئے شادی کر لیں۔ باوجود نہایت شرمیلے آدمی ہونے کے صاحب موصوف نے اس صلاح کو بہت پسند فرمایا اور کہا کہ کیا تم کوئی ایسی خاتون بتلا سکتے ہو جسکو میں اپنا شریک بنا سکوں۔ دوست نے جواب میں لاپرواہی سے کہا کہ کوئی عورت ہو"۔

لیکن ہماری رائے میں کوئی شخص جو ایسی صلاح پر کام کرے واقعی قابلِ رحم ہے کیونکہ جو کچھ کہ دانا لومڑی نے بیمار شیر سے کہا تھا۔ وہی شادی کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنے "میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے غار میں جانوروں کے گھسنے کے نشان ہیں

لیکن باہر آنے کے نہیں"۔ کسی کو اپنی زندگی کا رفیق بنانے سے پہلے انتخاب میں نہایت احتیاط برتو۔ کیونکہ تب پچھتائے ہوت کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ تاہم یہ بتلا دینا بھی مناسب ہو کہ ایک ایسی بیوی کا تلاش کرنا بھی جو بہمہ اوصاف موصوف ہو ایک امید موہوم ہے خواہ وُہ متلاشی اپنے آپ میں مفصلہ ذیل اشتہار دینے والے کی طرح اسکے شوہر بننے کی قابلیت ہی کیوں نہ پاتا ہو۔

ایک اخبار میں مفصلہ ذیل اشتہار چھپا۔ "ایک نوجوان کو جو ابھی دُنیا میں داخل ہوا ہے ایک سترہ سالہ بیوی کی ضرورت ہے جو ذی عصمت۔ تعلیم یافتہ اور کم از کم پانچہزار روپیہ کی جائداد کی مالکہ ہو۔ قوی الجثہ اور مضبوط الاعضا ہو اور قد میں جُوتے اُتار کر پانچ فٹ چار انچہ ہو۔ بہت لحیم شحیم نہ ہو اور نہ ہی بہت دُبلی پتلی ہو۔ حسین ہو اور اپنے حسن پر مغرور نہ ہو۔ باتونی نہ ہو اور نہ ہی ہمیشہ چُپ چاپ نظر آتی ہو۔ سخاوت پسند ہو اور قیمتی لباس کی حد سے زیادہ شوقین نہ ہو۔ اگرچہ صاف ستھری رہنے کی عادی ہو۔ شوہر سے دل سے محبت کرنے والی ہو اور اسکے راز کسی سے کہنے والی نہ ہو کفایت شعار بھی ہو اور اگر کوئی مصیبت آپڑے تو اُسے خوشی سے سہارنے کی طاقت رکھتی ہو۔ کوئی خاتون جو مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہو اور شادی کی خواہش رکھتی ہو تو ا۔ ب۔ معرفت ک۔ مث سے خط و کتابت کرے"۔

نوٹ درخواست کنندہ کا دعوے ہے کہ وُہ مذکورہ بالاصفات کی بیوی کے خاوند بننے کی قابلیت رکھتا ہے اور ایسی خاتون کا مستحق ہے"۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ وُہی کہاوت ہے کہ ایک بڑھیا نے اپنے نوکر سے کہا کہ میلہ میں سے ایک گائے جوان۔ اصیل۔ خوبصورت۔ سُرخ رنگ۔ مضبوط جسم والی اور بیس روپیہ سے کم قیمت کی خرید لاوے۔ نیز یہ کہ دُودھ آٹھ سیر سے کم نہ دیتی ہو نوکر نے ادب سے عرض کیا کہ حضور ابھی گائے کے لئے تو میلے میں جانے سے

درگاہِ رب العالمین میں دُعا کرنا بہتر ہے۔

جو لوگ کہ روپیہ کے لالچ سے امیر خاندانوں میں شادیاں کرتے ہیں وُہ دراصل اپنے آپ کو اپنی بیوی کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ ہم دراصل انسانی خوشی کا غلط اندازہ کرتے ہیں۔ جو چیز کہ انسان کو خوش بنا سکتی ہے وُہ قناعت ہے دولت نہیں۔ ایک شخص جو ایک کروڑپتی کا مہمان تھا ایک دن اپنے میزبان سے کہنے لگا کہ جناب آپ تو نہایت خوش قسمت آدمی ہونگے۔ اس نے استعجاب سے پُوچھا۔ خوش۔ کیا تمہاری مراد خوشی ہے۔ میرے خیال میں تو ہم کو اپنی باتوں کے سلسلہ ہی کو بدل دینا چاہئے کسی کا قول ہے کہ جس شخص کی بیوی اپنے ساتھ ایک بہت بڑا جہیز لاتی ہے اُس کو ہمیشہ ذلت سے دیکھتی ہے اور اسپر سوار ہوتی ہے۔

ایسی بیوی منتخب کر جو اپنی ذات سے تیرے لئے دولت ہو نہ کہ ایسی جو اپنے ساتھ دولت لاوے۔ ایک شخص نے نہایت فخریہ کہا کہ میری تمام عزت و دولت میرے لئے میری بیوی نے اپنی کفائت شعاری خوش خلقی اور لیاقت سے کمائی ہے۔ جس کو سُن کر اُسکے دوست نے سرد آہ بھری اور کہا کہ میری عزت اور دولت سب میری بیوی نے اپنی فضول خرچی۔ بد خلقی اور نالایقی سے ڈبو دی ہے"۔ وُہ عورت جو کہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا جہیز لاتی ہے اور بعض وقت تو وُہ دُنیا کی طرف سے اس قدر لاعلم ہوتی ہے جیسی لوئس شانزدھم کے دربار کی ایک عورت تھی۔ جس نے یہ سُنکر کہ لوگوں کو روٹی نہیں ملتی یہ کہا تو پھر وُہ کیک بسکٹ کیوں نہیں کھاتے۔

حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر بھی شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جیسے دلکش سے دلکش نظارہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہنے سے ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے ایسے ہی خوبصورت سے خوبصورت چہرہ بھی۔ آج کا حُسن کل ایک معمولی چیز معلوم ہوتا ہے

لیکن حسنِ باطن نہایت سادہ چہرے میں بھی ہمیشہ مانند آفتاب پرتو افگن ہوتا ہے۔ حسنِ باطنی عمر کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اور وقت بجائے اس کے کہ حسنِ ظاہری کی طرح اسکو تباہ کر دے اور جلا دیتا ہے۔ ایک حسین بد دماغ عورت کے خاوند سے زیادہ کوئی شخص قابلِ رحم نہیں۔ تاہم حسن بہمراہی صحت اور حسن باطنی کے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو صرف خوش قسمتوں کا حصہ ہے۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ بے وقوف عورت سے شادی نہ کرو جو کہ تمہارے راز دوسروں کو بتلا کر تمہیں ہدفِ ملامت بنا دے۔ بے وقوف عورت بجائے خاوند کی مددگار ہونے کے اس کی سدِ راہ ہوتی ہے۔ آدمی کی زندگی بدمزاج عورت سے شادی کر کے بے لطف ہو جاتی ہے مگر بے وقوف کے ساتھ دوبھر ہو جاتی ہے۔

عمر کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہے کہ اپنے عقل سے کام لو۔ نہ ہی کسی کم سن سے شادی کرو اور نہ بوڑھی عورت سے۔ کیونکہ شادی کا مقصد ایک دوست کا حاصل کرنا ہے نہ ایک باورچی یا خدمتگار کی تلاش نہیں۔

عورت کے لئے ایک اور ضروری چیز محنت ہے۔ ایک سست عورت اپنے نوکروں کو بھی سست بنا دیتی ہے اور اس سے بڑھ کر اولاد کو سست بنانے کا موجب ہوتی ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ فلاں عورت محنتی ہے یا نہیں تو یہ کہا جائیگا کہ جس عورت میں ایسی عادات پائی جاتی ہوں اکثر محنتی ہوگی۔ مثلاً صبح خیزی۔ تیز قدمی۔ باخلاق گفتگو اور لفظوں کا زبان سے صحیح ادا ہونا وغیرہ وغیرہ۔

فلادلفیا کے ایک نوجوان کا قصہ ہے کہ وہ ایک لڑکی سے شادی کرنی چاہتا تھا جسکی دو بہنیں اور تھیں۔ ایک دفعہ جب وہ اس لڑکی کی ملاقات کو گیا تو اس لڑکی نے اپنی دو بہنوں سے آکر دریافت کیا کہ بہنوں معلوم نہیں ہماری سوئی کہاں ہے۔ یہ سنتے

ہی وُہ شخص فوراً چلا آیا اور پھر کبھی اس لڑکی کا خیال نہ کیا جو ایک سوتی بھی دو بہنوں کی شرکت میں رکھتی تھی۔ اور پھر بھی نہ جانتی تھی کہ وُہ کہاں ہے۔

لڑکی کے عادات و اطوار سے واقف ہونے کے لئے اس کی ماں اور بہنوں کے مزاج سے آگاہی حاصل کرو کیونکہ اسکا مزاج بھی بہت کچھ انہیں جیسا ہونا ضروری ہے۔

برن صاحب مشہور شاعر نے عورت کے اوصاف کو دس حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں سے چار حصّے خوش خلقی کے دو ذکاوت کے ایک خوبصورتی ایک مذاق اور باقی دو تمام اور اوصاف کے ہیں۔

اکثر اشخاص بیوی کے انتخاب کے وقت یہ دریافت کرنیکی کوشش کرتے ہیں کہ آیا وُہ خوبصورت امیر اور پڑھی لکھی ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ دریافت کریں کہ وُہ سمجھدار محنتی اور محبت کرنے والی ہے یا نہیں۔

ہم اپنے مضمون کو سرجان مور کی رائے پر ختم کرتے ہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ میں عورتوں کے گروہ کو سانپوں کے تھیلے سے تشبیہ دونگا۔ جس میں سانپ ہی سانپ ہوں اور صرف دو چار گینڈ مچھلیاں (ایک قسم کی مچھلیاں جو بالکل سانپ سی ہوتی ہیں) ہوں اب ہر شخص کو بڑی احتیاط کرنی چاہئے کہ سانپ کے کاٹنے سے محفوظ رہے اور گینڈ مچھلی کو چن لے۔

عبدالرحمٰن سہواروی (از کوئٹہ)



مُناجات

بن کلام معجز نظام مولانا مرتضےٰ علی علیہ السلام

اَے بزرگی - برتری اور بخشش کے مالک! حمد تیرے ہی لئے ہے - تیرا مرتبہ بہت بلند ہے - تو جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جسے نہیں چاہتا نہیں دیتا - اَے میرے اللہ - تو نے مجھے پیدا کیا اور بڑا کیا تو میری پناہ اور جائے پناہ ہے - راحت و رنج میں تیری ہی طرف مخاطب ہو کر آہ و زاری کرتا ہوں اَے میرے خدُا - اگرچہ میری خطائیں بیحد اور بہت بڑی ہیں مگر تیرا عفو میرے گناہوں سے کہیں برتر اور وسیع ہے - اَے میرے پروردگار - میں نے اپنے سوالِ نفس کو رد نکیا - مگر اب میدانِ خجالت میں سر جھکائے پھر رہا ہوں - اے میرے خدا - تو میری آشفتہ حالی - بینوائی اور محتاجی کو دیکھ رہا ہے اور تو میری در پردہ گریہ و زاری کو بھی سُن رہا ہے - اَے میرے اللہ - تو میری اُمید کو قطع نہ کر - اور میرے دِل کو نہ پھیر کہ مجھے تیری بخشش کی طمع ہے - پروردگارا - تو مجھے اپنے عذاب سے بچا - مَیں عاجز - درماندہ - اسیر ذلیل و خوار ہوں اور تجھ سے خوف رکھتا ہوں - خدایا - جبکہ میرا قبر میں مقام ہو اور زمین خوابگاہ ہو تو اُسوقت مجھے نہ بھول جانا - اَے میرے اللہ - اگر تو ہزار برس مجھ پر عذاب کرے جب بھی میری اُمید کا رشتہ تجھ سے قطع نہ ہوگا - اَے خدا - تو مجھے اپنے عفو کا وہاں مزا چکھا جہاں نہ اولاد کام آئیگی نہ دولت - پروردگارا - اگر مجھ پر تیری نظر نہ ہوگی تو مَیں تباہ ہو جاؤنگا - اور اگر تیری نگاہ ہوگی تو مَیں برباد نہ ہونے پاؤنگا - اَے خدا - اگر تو بُروں کی خطا معاف

نکریگا تو پھر اُن سیہ کاروں کا کون پوچھنے والا ہے۔ جو ہوا و ہوس میں گرفتار ہیں۔ پروردگارا۔ اگر مَیں نے طلب پرہیزگاری میں کمی کی تو مَیں تیرے عفو کے ساتھ ساتھ ہُوں اور ہرگز اُسکا دامن نہ چھوڑونگا۔ اَے خدا۔ اگر میرے گناہ پہاڑ سے زیادہ اور اُس سے بلند ہیں تو عفو تیرا میرے گناہ سے برتر اور بلند تر ہے۔ پروردگارا۔ اگر مَیں نے نادانستگی یا جہالت سے خطا کی تو میری طُولانی اُمید اب تجھ ہی پر آسرا لگائے ہے اور مَیں ہرگز بے صبر نہیں ہُوں۔ اَے میرے خُدا۔ تیرے احسانوں کا ذکر میرے سوزِ جگر کو دُور کرتا ہے اور میرے گناہوں کا بیان جو مجھ سے سرزد ہُوئے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکا دیتا ہے۔ پروردگارا۔ میری لغزشوں پر اعتنا نہ کر اور میرے گناہوں کو مٹا دے کیونکہ مَیں اُن کا خود مُقِر ہُوں۔ ڈرتا ہُوں اور آہ و زاری کرتا ہُوں۔ خداوندا۔ راحت و آرام عطا فرما کیونکہ سوا تیرے بابِ فضل کے اور کس کے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاؤں۔ خدایا اگر تو مجھے نکال دے یا نااُمید کر دے یا رسوا کرے تو پھر کس سے اُمید رکھوں اور کون ہے جو میری شفاعت کریگا۔ اسے پروردگار۔ پھر مجھے کیا چارہ ہوگا اور مَیں کیا کرونگا۔ اَے خُدا۔ جو تیری محبّت کا ذمہ وار ہے وُہ راتوں کو جاگا کرتا۔ تجھ سے راز و نیاز کی باتیں کرتا۔ دُعائیں مانگتا اور غافل سوتا ہے۔ پروردگار میرے۔ تمامی موجودات تیرے فضل کے اُمیدوار ہیں۔ تیری وسیع رحمت سے لَو لگائے ہیں اور جنّت میں اُس کی طمع رکھتے ہیں۔ خداوندا زندگی تمنائیں اور آرزوئیں بہت پیدا کرتی ہے مگر میرے گناہوں کی بُرائی مجھ پر نفرین کرتی ہے۔ الٰہی۔ اگر تو مجھے بخشدے تو تیرے عفو سے میری سمائی ہو جائیگی۔ ورنہ یُوں ہی خاک پر پڑا دُنیا میں ہلاک ہو جاؤنگا۔ پروردگارا

اپنے نبی اور اُس کی اولاد کا صدقہ اور اُن ابرار کا واسطہ جو تیری درگاہ میں رجوع قلب اور عاجزی سے سر جھکاتے ہیں۔ دین محمد میں میرا حشر و نشر ہو۔ وہ محمد جو اپنا مطلب دل تجھ سے بیان کرتا اور تجھ سے بہت ڈرتا ہے۔ اے معبود! اے مالک میرے! مجھے اس کی وسیع شفاعت سے محروم نہ رکھ۔ اس کی شفاعت قابل اجابت ہے۔ اور نیکیاں بھیج جب تک کہ تیرے واحد جاننے والے تجھے پکاریں اور نیکی کرنے والے تیرے در پر راز و نیاز کی باتیں کریں +

سجاد۔ دہلوی عظیم آبادی

مولانا حالی کے ایک شعر پر علیگڈھ کالج کے ایک طباع گریجوایٹ مولوی محمد داؤد مرحوم نے مندرجہ ذیل مصرعے لگائے تھے۔ جن میں تضمین کا حق ادا کر دیا گیا ہے:۔

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں
پہلے یہ دیکھے وہ اُس کام کے ہو بھی شایاں
سُنئے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داور کے یہاں
انکو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

ذیل کا قطعہ بند بھی مرحوم ہی کی طباعی کا نمونہ ہے:۔

سُنکر بیا مبر سے مرا نام یوں کہا
وہ ہی نہ ڈبے پتلے نحیف و نزار سے
معلوم ہے مجھے۔ بڑے اُستاد ہیں جناب
یوں دیکھنے میں سیدھے سے پرہیزگار سے
خود مجھکو تجربہ ہے بس اب کیا بیاں کروں
خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

حفظِ صحت

یہ مضمون ہمارے واجب التکریم دوست لالہ منشی لال صاحب - ایم - اے - سابق سپرنٹنڈنٹ ٹریننگ کالج - لاہور کا عطیہ ہے - ڈاکٹر سائم صاحب کی مشہور ریڈر کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے - لالہ صاحب پرانے دہلی کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں سے اس منتخب گروہ میں ہیں جنہوں نے کالج کے نام کو روشن کیا - اور جس عہدے میں گئے نیک نام ہوئے - یہ خدمات زیادہ تر محکمہ تعلیم میں رہیں - اور پنجاب کی تعلیمی ترقی انکی مساعی کی بیحد مشکور ہے - لالہ منشی لال صاحب علاوہ کمال علمی کے اعلیٰ اخلاق کا ایک نمونہ ہیں اور ایک شیوہ راسخ ان کا یہ ہے کہ حتی الوسع اپنے کام اور اپنی محنت کے اعلان سے پرہیز کریں - یہ طریق اس زمانہ کے روش کے تو خلاف ہے - مگر جن لوگوں کی آنکھیں صاحب موصوف نے دیکھی ہیں انکی وضع میں داخل تھا - اسی لئے انہوں نے جب کبھی کوئی مضمون ہمیں عنایت کیا - باصرار لکھ بھیجا - کہ اُن کے نام کا اظہار نہ کیا جائے صرف م - ل لکھ دیا جائے - آج تک اُن کے ارشاد کی تعمیل کی گئی - مگر ہم تو بعد غور اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علمی مضامین اور تراجم میں ایسے اصحاب کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہے - اس لئے آج ہم نے اس نوٹ کے ذریعے سے انکا نام بلا اجازت ظاہر کر دیا ہے - امید ہے کہ وہ ہماری اس جسارت کو معاف فرما دینگے - اور آیندہ اپنے مضامین کو اپنے دستخط سے مزین فرمایا کریں گے - کیونکہ اُن کے نام کا شائع ہونا ہمارے لئے باعث افتخار ہے :-

(۱) انسان کا فرض ہے کہ اپنی صحت کا خیال رکھے خاصکر اس لئے کہ جسم کا صحیح وسالم ہونا انسان کے فائدہ کے لئے ضروری ہے - یہ مقولہ مدت سے انسان

کی زندگی بسر کرنے کے لئے کامل اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یعنے جسم کا تندرست
ہونا نفس یا ذہن کے صحیح و سالم ہونے کے لئے ضروری ہے۔ علاوہ ازیں بیماری
کے باعث انسان اپنی زندگی کے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ بیماری سے انسان
ضدی، چڑچڑا اور زود رنج ہو جاتا ہے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو فائدہ پہنچانا
تو درکنار بلکہ اُن کے لئے وبال ہو جاتا ہے۔ پس طالب علم کو اپنی صحت کا بڑا خیال
رکھنا چاہیے۔ اگر طالب علم اپنی صحت کی پروا نہ کرے بلکہ اس کے قائم رکھنے
میں کوتاہی کرے تو زندگی اُس کے لئے خوشی کا باعث نہ ہوگی۔ اُس کے مطالعہ
میں ہرج واقع ہوگا۔ اور اگر وہ اپنی طالبعلمی کے زمانہ میں جو کچھ چاہتا ہے حاصل
بھی کر لے وہ آگے دُنیاوی کاروبار میں رہ جائیگا۔ پروفیسر بلیکی صاحب نے
اِس امر پر بہت کچھ زور دیکر لکھا ہے۔ ان کا یہ بیان ہے۔ یہ امر ہر شخص جانتا ہو
کہ طلبا زیادہ تر اپنی صحت کا ہی خیال نہیں رکھتے۔ اور جس قدر کہ طالبعلم زیادہ
شائق ہوگا وہ غالباً اُسی قدر زیادہ اِس بارہ میں خطا کھائیگا۔ اور مثل شتر بے مہار
یا ریل گاڑی کے جسکو کوئی سگنل نہیں دکھایا گیا۔ چلتا چلتا دریا کے ایک مہلک
اور خطرناک کنارے پر آپہنچتا ہے اور اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں
کھڑا ہوں۔ پس جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس مجرب خیال سے کام کرنا
چاہئے کہ عموماً بیٹھ کر کام کرنے سے صحت کو کم و بیش نقصان پہنچتا ہے۔
اور خصوصاً بیٹھ کر کام کرنے کی عادت جبکہ اس کے ساتھ برابر جگر و دماغ سے
کام لیا جاتے صحت کے لئے بہت مضر ہے۔ اور جن کی جسمانی طبیعتیں قدرتی
کمزور ہیں اور پھر وہ اکثر کتابوں کا گڑ کر مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ ان کے قوا صریحاً
کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور انکا جسم زائل ہو جاتا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد جو ایک
پُرانے طالب علم کا تجربہ ہے ہر شخص کو غور کرنا چاہیے کہ اگر وہ ارادتاً و مستقل طور پر

اپنی حفظِ صحت میں کوتاہی کریگا۔ جیسے کہ عُمدہ کاریگر اپنے اوزار کو تیز رکھنے یا عُمدہ سپاہی اپنے بارود کو خشک رکھنے میں کوتاہی کرتا ہے تو وُہ طالب علم اپنا خُون خود اپنی گردن پر لیتا ہے یعنے وُہ مرجائیگا اور اس موت کا ذمہ وار وہ خود ٹھہریگا۔

(۲) شیکسپیر نے ایک ناٹک لکھا ہے جسکا نام ہنری دی فورتھ ہے۔ اس ناٹک میں بادشاہ ہنری چہارم چند درد انگیز اشعار میں اپنی حالت کا اپنی نہایت غریب رعیت کی حالت سے مقابلہ کرتا ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ مجھے راتوں نیند نہیں آتی۔ حالانکہ کمرے مُعطّر ہوتے ہیں اور نہایت قیمتی اور شاندار شامیانے تنے ہوتے ہیں اور میری ہزارہا غریب سے غریب رعایا مزہ سے گہری نیند سوتی ہیں۔ حالانکہ اُن کے بستر بستر استراحت نہیں ہیں بلکہ تکلیف کا گھر ہیں اور جہاں وہ سوتے ہیں وہاں پر مکھیاں اور مچھر بھنبھناتے رہتے ہیں۔ اور یہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اُنہیں لوری کا کام دیتی ہے ایک اَور ناٹک ہنری دی ففتھ میں بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ شاہ ہنری پنجم ایک لاثانی پرزور پُر تاثیر گفتگو میں عظمت سے بیرونی نمود اور خطاب کو یکطرف کر دیتا ہے اور پھر ثابت کرتا ہے کہ وُہ ظاہری شان و شوکت کی رَو جو اس دُنیا کے اُونچے کنارے پر ٹکراتی رہتی ہے۔ ہرگز اُس صحت کی تلافی نہیں کرسکتی جو بادشاہوں کو نصیب نہیں اور غلاموں کو میسر ہے۔ بیرونی نمود یا تکلیف کے ذکر میں ہنری پنجم یہ سوال کرتا ہے کہ اے بیرونی نمود جس حالت میں کہ تجھے فقیروں کی زانو پر پُورا اختیار ہے تو کیا تجھے انکی صحت پر بھی پُورا اختیار ہے یعنے اے بادشاہ فقیر تجھے جھک جھک کر سلامیں کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی سی صحت تجھ میں نہیں ہے۔

اے تو مغرور نیند جو بادشاہ کو آرام دینے میں اس قدر لطائف الحیل سے کام کرتی رہتی ہے۔ ان میں اسے کوئی شئے نہیں جس سے گہری نیند آئے۔ مثلاً

خوشبودار چیزیں۔ عصا۔ رقص وسرود۔ تلوار۔ سونٹا۔ شاہی تاج۔ سونے کے تار اور موتیوں سے جڑی ہوئی پوشاک یعنے زربفت کے کپڑے تافتے وغیرہ۔ بادشاہ کا لمبا چوڑا خطاب۔ جس تخت پر کہ بادشاہ بیٹھتا ہے۔ شان وشوکت کی رو جو اس دنیا کے اونچے کنارے پر ٹکراتی رہتی ہے۔ نہایت ہی شاندار بیرونی نمود اور ظاہری زرق برق کا تکلف۔ اگر یہ سب چیزیں جس شخص کو میسر ہوں اور وہ نہایت تکلف اور شاہانہ بستر میں لیٹا ہوا ہو۔ پھر بھی اُسے ایسے مزے کی نیند نہیں آسکتی۔ جیسے کہ ایک کمبخت غلام کو آتی ہے جو پیادے کی طرح صبح سے شام تک سُورج کی دُھوپ میں پھرتا رہتا ہے اور عرق عرق ہو جاتا ہے۔ وُہ رات بھر گویا فردوس میں مزے سے سوتا ہے۔ دُوسرے روز صبح کے بعد اپنی نیند سے اُٹھتا ہے اور آفتاب کو اس کے گھوڑے پر سوار کراتا ہے۔ اور اسی طرح ہر سال اپنی محنت سے فائدہ اُٹھاتا ہوا کوشش کرتا رہتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اور اس مصیبت زدہ کمبخت شخص کو جو دن بھر محنت کرتا رہتا ہے اور رات کو مزے سے سوتا ہے گو بیرونی اور ظاہری نمود تو نصیب نہیں مگر اور سب طرح سے بادشاہ پر فوقیت حاصل ہے۔

(۳) ان شخصی گفتگوؤں کے ذریعہ سے شیکسپیر نہایت صاف طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیاوی حالت کے غیر مساوی ہونے کی کیا تلافی ہو سکتی ہے۔ جب ہم انسان کی مختلف حالتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یعنے بعض شخصوں کی دولت اور آرام اور بعضوں کی محبت وشفقت اور ناداری۔ تو ہم اکثر اُنکی بیرونی حالت سے چکا چوند ہو جاتے ہیں اور یہ بھُول جاتے ہیں کہ خوشی کا منبع ہم خود ہیں۔ خوشی کا ایک بڑا جزو تندرستی ہے اور یہ کسی خاص جماعت اور درجہ سے مخصوص نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ فقیر کو یہ نعمت حاصل ہو اور بادشاہ کو باوجود تلاش کرنے کے پھر بھی میسر نہ ہو۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ اس اختلاف کو بہت دور تک بڑھایا جائے۔ ہر ایک شخص

بڑے رُتبہ کا آدمی بیمار نہیں ہوتا اور نہ وُہ غریب شخص پر اُس کی تندرستی کے باعث حسد کرتا ہے۔ اور برعکس اس کے یہ تیری بدقسمتی کی بات ہے کہ بہت سے غریب اور مفلس لوگ امیروں پر انکی صحت کے باعث حسد لیجاتے ہیں۔ لیکن جب تندرستی ہوتی ہے۔ تو وُہ ایک ایسی بڑی اور بے بہا نعمت ہے کہ دولت کی تمام عیش و عشرت او شان و شوکت کے تمام لوازمے اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اور صحتِ انسان کے لئے خُدائی عطیہ ہے اور جو انسان عقلمند ہے وُہ قارون کی دولت سے بھی ہرگز اسکا تبادلہ نہ کریگا

(۴) تاہم لوگ ایسی نعمتِ عظمےٰ کو اکثر بڑی بے پروائی اور خام خیالی سے ضائع کر دیتے ہیں۔ اور اس کی قدر عموماً اس کے جاتے رہنے کے بعد ہوتی ہے پہلے نہیں۔ صحت یا تندرستی کے معنے صرف جسمانی تکلیف سے بری ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد کل انسان کی صحیح اور عُمدہ حالت ہے۔ صحت ایک ایسی قابلیت ہے جس کے باعث سے انسان اپنے عقلیہ اور جسمانیہ قوا سے بخوبی کام لے سکے اور اُنکے استعمال سے اور اپنے آس پاس کی چیزوں سے حظ اُٹھا سکے۔ کارلائل صاحب جو ولائیت میں بڑے مشہور فلاسفر ہُوئے ہیں فرماتے ہیں۔ صحت ایک بڑی شئے ہے۔ اس سے مراد حالت موازنہ ہے۔ یہ ہر ایک قسم کی راستی یا حق۔ عُمدہ انتظام اور نیکی پر حاوی ہے۔

گیلن صاحب صحت کو تناسب اور بیماری کو بدصورتی کے نام سے بیان کرتے ہیں۔ جب تمام قوتیں ٹھیک اندازہ سے کام میں لائی جائیں اور جو کچھ آرام اور غذا انکو ضروری ہے۔ ان سب قوتوں کو بہم پہنچایا جائے۔ صحت اسوقت ہوتی ہے۔ لیکن جو طالبعلم علم حاصل کرنے اور اس میں کامیاب ہونے کے شائق ہیں اُن کے دماغ کو تو بے حد مشق ہو جاتی ہے۔ اور باقی حصوں کو نہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تناسب جاتا رہتا ہے اور صحت نہیں رہتی۔ دُنیا کی نہائیت عُمدہ محنت جاتی رہتی ہے اور اس کے جاتے رہنے کا الزام خود طلبہ پر ہے۔

. . . .

(۵) یہ ایک ایسی بُرائی ہے جس سے خاصکر اس ملک یعنی ہندوستان میں بچنا ضروری ہے۔ یہاں پر زیادہ سرد ملکوں کی نسبت گھروں سے باہر پھرنے کے کام اور دل لگی کی باتیں بہت تھوڑی اور کم دلکش ہیں۔ سال میں گرمی کا موسم زیادہ دیر تک رہتا ہے اور اس وجہ سے طالبِ علم مُدت تک گھروں کے اندر رہتے ہیں۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیٹھ کر کام کرنے کی عادت زیادہ ہو جاتی ہے اور جسم زیادہ تر آرام کرنے کی طرف راغب رہتا ہے۔ گرمی کے مہینوں میں طالبعلم کا قریب قریب کل وقت مطالعہ اور نیند میں صرف ہوتا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم گر جاتا ہے۔ دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور صحت بگڑ جاتی ہے۔ مگر یہ خرابی صرف ہندوستان سے ہی مخصوص نہیں اور ہندوستان ہی موسم بھی گرما ہی سے مخصوص نہیں۔ ایک اکسفورڈ کا طالب علم ایک دوست کا ذکر کرتے ہُوئے یہ کہتا ہے۔ وُہ پندرہ گھنٹے روز پڑھتا تھا اور وہ اس لئے سب سے اوّل رہا۔ لیکن اس بیچارے کے دماغ میں گرمی چڑھ گئی اور اُسے دماغ کی بیماری ہو گئی۔ ستورے نے ایک مشہور نوجوان شاعر کا ذکر کیا ہو کہ وُہ ۲۱ برس کی عُمر میں مر گیا۔ وُہ صریحاً سخت محنت سے مر گیا۔ کیمبرج نے اُسے مار ڈالا۔ جب اُس کے رگ و پٹھے خُوب کھچ چکے یہاں تک کہ رات اُسے مُصیبت میں کٹتی تھی۔ اور لوگوں نے اُسے دوائی دی تاکہ وُہ انعام حاصل کرنے کے لئے اِمتحان دے سکے۔ گھوڑا جیت تو گیا مگر گھوڑ دوڑ کے بعد مر گیا۔ سٹیفن جو مشہور انجنیئر تھا اُسے معلوم تھا کہ حد سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کا کس قدر بُرا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ اسکا دوست لنڈلے از حد محنت سے تھک گیا اور دب گیا تو اُس نے اُس سے کہا اے لنڈلے اب مَیں نے معلوم کر لیا کہ تم کس بات کی تلاش میں ہو۔ تم اپنے ایک پونڈ میں سے ۲۰ شلنگ نکالنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہُوں کہ اس خیال کو بالکل ترک کر دو۔ اور اس سبق کی بھی تمام طلبا کو اور ان تمام شخصوں کو

جو اپنی قوا سے حد سے زیادہ کام لینا چاہتے ہیں یہی نصیحت کرو کہ یہ خیال بالکل چھوڑ دو جیسا کہ قانون ثقل یا کشش کے برخلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جسم اور ذہن کے قوانین کا بھی مقابلہ کرنا عبث ہے۔ بقول شاعر ورڈز ورتھ۔

اے میرے دوست ہوشیار ہو جاؤ جاگ اٹھو
اور غور سے دیکھو۔ کس لئے اسقدر محنت اور تکلیف اٹھاتے ہو

اے میرے دوست اٹھو اپنی کتابیں چھوڑ دو ورنہ تم ضرور بدن کے دوہرے ہو جاؤ گے۔ تم سے سستی کے مارے اٹھا بیٹھا نہیں جائیگا۔ بدن پھول کے کپا ہو جائیگا۔ کتابیں۔ یہ تو ایک ہمیشہ کا جنجال ہیں یا یہ کہو کہ خلجان ہیں اور سستی پیدا کرتی ہیں۔ آؤ جنگل کے اس پرند کی آواز سنیں۔ دیکھو اس کا گانا کیسا خوشنما ہے۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس کے راگ میں کتابوں کی نسبت زیادہ دانائی بھری ہوئی ہے اور سنو یہ پرند کیسی خوشی سے گاتا ہے۔ یہ بھی کچھ ادنےٰ وعظ کرنیوالا نہیں ہے۔ باہر روشنی میں آؤ۔ جہاں طرح طرح کی چیزیں موجود ہیں اور قدرت کو اپنا استاد بناؤ۔ یعنے قدرت سے بہت سی باتیں سیکھو۔

بہت کچھ علوم و فنون پڑھ چکے۔ ان پھیکے اور بے لطف ورقوں کو بند کر کے رکھدو۔ باہر آؤ اور ایسی طبیعت ساتھ لاؤ جو قدرت کی ہر ایک شے دیکھے بھالے اور اس سے علم حاصل کرے +

م - ل

دربارِ غالب جو دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اسکے مضامین بجائے ۵۶ کے ۹۰ صفحہ پر آئے تھے۔ اور انہیں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ اسکی کچھ زائد کاپیاں رکھی ہیں۔ جن حضرات کو شوق ہو۔ جلد طلب فرمائیں۔ اسمیں کئی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں۔ **قیمت** ۱۰ بذریعہ ترسیل ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی۔پی طلب کیجئے + **مینجر مخزن**

مُفید تفریحات

(ترجمہ)

اِس قسم کی تفریحات میں جو دماغ کو تروتازہ کرتی ہیں۔ یہ چیزیں ہیں۔ باہمی میل جول۔ اُمور ذاتی۔ خانگی۔ و عامہ پر گفتگو۔ جنگلات۔ باغات۔ میدانوں کی سیر۔ جس میں مختلف قسم کے پُھول۔ پتّے۔ درخت دیکھنے میں آئیں۔ اور جو اپنی شان اور خوبصُورتی کی وجہ سے مسرّت انگیز ہوں۔ اور ایسی سیر ہے جس میں مختلف قسم کے مکانات۔ محلات۔ پرندہ۔ آدمی۔ جانور نظر آئیں۔ نیز اس قسم کے نظارے جن سے کسی اخلاقی نیکی کا سبق ملتا ہو۔ یا ایسے واقعات کا مشاہدہ جن سے خُدا کی قدرتِ کاملہ کا پتہ چلے۔ یہ اور ایسی ہی اَور چیزیں قوّتِ باصرہ کے لئے ہیں۔ بہت سے موسیقی کے ترانہ اور راگ بھی ایسے ہیں۔ جو انسانی اُلفتوں کے ساتھ اپنی تطبیق کے بموجب دماغ پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ علاوہ ازیں مہذب مذاق اور ظرافت بھی ہے جس سے دماغ تروتازہ ہوتا ہے۔ یہ قوّتِ سامعہ کے متعلق اسی طرح آپس میں مل کے کھانا پینا اور اسکے متعلق دل بہلاؤ کے سامان بھی ہیں۔ کھیلیں بھی ہیں۔ جو گھروں میں کھیلی جاتی ہیں۔ مثلاً تاش۔ چوسر۔ شطرنج اور علیٰ ہذالقیاس مجالس جو شادی۔ اور خوشی کے جلسوں کے موقعہ پر منعقد ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا اور اسی قسم کی دیگر اشیاء دماغ کی تفریح کے نہائت مفید سامان ہیں۔ اِن کے علاوہ بعض ورزشی محنت و مشقت کے کام بھی ایسے ہیں جن سے جسم کو حرکت ہوتی ہے۔ اور جو دماغ کو اپنے جائز کام سے کچھ عرصہ کے لئے پھیر دیتے ہیں۔ یہی حال اخبار وں کی نئی نئی خبریں دیکھنے اور ایسی کتابوں کے مطالعہ کا ہے۔ جن کے مضمون اخلاقی بھی ہوں اور جن کے پڑھنے سے دل خوش ہو۔ یہ تفریحات دفاتر میں کام کرنے

والے ۔ اور کاروباری آدمیوں کے لئے ہیں۔ اور اِس لئے انکو دفاتر یا کاروبار کی تفریحات کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ان اُلفتوں اور محبتوں کا بوجھ انسان کی طبیعت پر سے ہلکا کرنے والی ہیں جنکی وجہ سے وُہ کام میں مستغرق رہتا ہے۔ ہر ایک کام میں کوئی نہ کوئی دلچسپی ضرور ہوتی ہے۔ جس سے رُوح کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو دماغ کو اپنے کام یا مطالعہ میں لگائے رکھتی ہے۔ اس توجہ میں اگر کمی واقع نہ ہو تو ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اور اس کی قوت میں فرق آجاتا ہے وہ دل جو ہمیشہ ایک ہی قسم کے خیالات میں مستغرق رہے۔ کچھ عرصہ بعد ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے وُہ نمک جسکا ذائقہ جاتا رہے اور جس میں کچھ مزہ نہ رہے۔ یا وُہ جھکی ہُوئی کمان جسکی وُہ قوت جو لچک کی وجہ سے تھی۔ بوجہ کبھی سیدھی نہ ہونے کے سلب ہو جائے۔ یہی حال اس آنکھ کا بھی ہے۔ جو برابر ایک ہی چیز کو دیکھتی رہے کیونکہ سیاہ یا سفید یا سُرخ رنگ کو لگاتار دیکھنے سے بصارت جاتی رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص برف کی طرف برابر دیکھتا رہے تو اس کی بصارت میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن اگر وہ مختلف رنگوں کو ایک ہی وقت میں یا یکے بعد دیگرے دیکھے تو بینائی تر و تازہ ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز بوجہ گوناگون ہونے کے خوش آتی ہے۔ ایک ہار جو سلیقہ سے مختلف رنگ کے پھُولوں سے گُندھا ہوا ہو۔ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوس قزح خود سُورج کی روشنی سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے۔ جب دماغ کچھ عرصہ تک کام کر چکتا ہے۔ تو اُسے آرام کی خواہش ہوتی ہے۔ اور جب آرام کرتا ہے۔ تو گویا جسم کے اندر اتر آتا ہے۔ اور وہاں آکر اپنی خوشی کے ایسے سامان ڈھونڈھتا ہے۔ جو اس کی اندرونی حرکات کے مطابق ہوں۔ جسم کی اندرونی اشیاء اپنی خوشیاں زیادہ تر حواس خمسہ۔ بصارت۔ سماعت۔ شامہ۔ ذائقہ اور لامسہ) سے حاصل کرتی ہیں۔ یعنے یہ خوشیاں گو حقیقت میں تو بیرونی

اشیا سے پہنچاتی ہیں۔ لیکن تاہم وہ ہمارے جسم کے ان واحد حصص ہیں داخل ہوجاتی ہیں جو عضو بدن کے نام سے موسوم ہیں۔ وہ اِسی اور صرف اِسی ماخذ سے اپنی خوشیاں اور حظائظ حاصل کرتے ہیں۔ ہر ایک رگ و ریشہ۔ ہر ایک خون کی نلی۔ اور پھر اُن سے بڑے بڑے اندرونی اعضا۔ غرض انسان کے جسم کے سب اندرونی حصے خود ہی اپنے حظائظ کو حاصل کرتے ہیں۔ ان خوشیوں کو انسان فرداً فرداً محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ وہ بحیثیت مجموعی مشترکہ طور پر ایک عام حس کی صورت میں محسوس ہوتی ہیں۔

جیسا دِل آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ ویسی ہی خوشیاں بھی وُہ طلب کرتا ہے یعنی پاک یا ناپاک۔ رُوحانی یا جسمانی۔ بہشتی یا دوزخی۔ کیونکہ انسانی جسم کے اندر ہر ایک جسمانی حس اس خاص فرد واحد کی رضا و رغبت کی محبت سے ملوث ہوجاتی ہے۔ اور اس کے بموجب فہم یا ادراک ان خوشیوں کو معلوم کرتا ہے۔ ہر ایک حس کی زندگی ہی انسانی مشیت اور اس کی رغبات سے مرکب ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کا جسم ایک گتھی ہوئی شے ہے۔ جس اپنی ہستی سے اس طرح آگاہ کرتی ہے۔ جس طرح ایک زنجیر پہ اس کی مختلف کڑیوں کے ذریعہ زور ڈالا جاتا ہے۔

لیکن چونکہ ہر ایک شخص کا کار دنیوی (محنت۔ مشقت۔ کار منصبی) اس کے دِل و دماغ کو ہر وقت روکے رکھتا ہے۔ اور اس کو مختلف تفریحات کے ذریعہ ڈھیل دینے۔ تازہ رکھنے۔ اور بحال کرنے کی ضرورت واقع ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تفریحات میں بھی اندرونی رغبتوں کے مطابق اختلاف ہوتا ہے۔ اگر محبت کی رغبت اُنکے دِل میں ہے تو تفریحات کچھ اور ہوتی ہیں۔ اگر عزت کی طلب صرف انکا منشا ہے تو کچھ اور۔ اگر انہیں صرف مال و دولت کا لالچ ہے تو تفریحات اَور طرح کی ہوتی ہیں۔ اور اگر وُہ اپنا فرض منصبی صرف پیٹ پالنے کی خاطر پُورا کرتے ہیں تو اَور طرح کی۔ اس شخص کی جسے خالی خوبی نام و نمود و شہرت کی طلب ہو تفریحات

اِس شخص کی تفریحات سے جو روپیہ محض فضول خرچی کی نیت سے کماتا ہے بالکل مختلف ہوتی ہیں - اور اسی طرح ہم اَوروں کو بھی قیاس کر سکتے ہیں -

اگر خیرات کا خیال ان کے دِل میں بسا ہوا ہے - تو تمام مذکورہ بالا تفریحات (تمام نظارے اور کھیلیں - راگ اور ترانے - کھیتوں اور باغوں کی خوبصورتی اور باہمی میل جول) اسے خیال کو تازہ رکھنے کی خاطر ہوتی ہیں - کسی کے کام آنے کی خواہش ہر وقت اُنکے دِل میں سمائی رہتی ہے - اور جب وہ آرام کرتے ہیں تو اس خواہش میں رفتہ رفتہ پھر تجدید ہو جاتی ہے - خدا کا سایہ ہر وقت انکے سر پر رہتا ہے - اور ان کو تقویت بخشتا رہتا ہے - اور وہی اپنی رحمت کاملہ سے اُنکو اپنے فرض کی ادائیگی میں وُہ خوشی بخشتا ہے - جو کبھی دُوسروں کے خواب میں بھی نہیں آتی - گویا وُہ انکے اندر ایک ایسی خوشبو اور شیرینی پھُونک دیتا ہے - جسکو وُہ کچھ خود ہی اچھی طرح معلوم کرتے ہیں - ایک خوشبو جس سے رُوحانی خوشی مراد ہوتی ہے - اور ایک شیرینی جس سے رُوحانی تفریح مفہوم ہوتی ہے - یہ خوشی عقل اور فہم کا حصہ - اور یہ تفریح اِس انسانی مشیت کی رغبت کا حصہ ہوتی ہے - وُہ لوگ جو خیرات کے نام سے ناآشنا ہیں انکو سمجھ ہی نہیں سکتے - کیونکہ ان کا رُوحانی دِل بند ہوتا ہے - اور جس قدر وہ خیرات سے دُور بھاگتے ہیں - اسی قدر انکا دِل کور ہوتا جاتا ہے - اور اِسی طرح بند ہو جاتا ہے - جیسے کسی نے اُسے سریش سے بھر دیا ہے -

ان لوگوں کی جنہیں عزت کی لگن ہوتی ہے - (یعنے جو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری شہرت ہو - لوگوں میں تعریفیں ہوں ہم ترقی کریں) تفریحات بظاہر ایسی ہی ہوتی ہیں وُہ اپنا کام ہوشیاری سے کرتے ہیں - بہت سے مفید کار بھی سرانجام دیتے ہیں - لیکن خلق اللہ کو نفع رسانی کی غرض سے نہیں بلکہ محض خود نمائی کی وجہ سے - اپنے ہمسائہ کی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض نام و نمود کی خاطر - وُہ بھی اپنے فرض کو

پُورا کرنے میں حظ اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن ایک قسم کا شیطانی حظ گو وُہ اُنکی نظروں میں خاص خدا کا بھیجا ہوا ہی معلوم ہو۔ کیونکہ دونوں شکل صُورت میں بظاہر ایک سے ہیں۔ لیکن اُن کی خوشی۔ رنج سے ملوّث ہوتی ہے۔ اُنکے دل کو کبھی چین ہی نہیں پڑتا۔ سوائے اس وقت کے جب وُہ عزّت و شہرت کے خواب دیکھ رہے ہوں۔ جب وُہ ان باتوں کا خیال نہیں کرتے۔ تو عیاشی میں غرق ہو جاتے ہیں اور شراب خوری۔ عیش پسندی۔ زنا۔ ظلم۔ اور اپنے ہمسایہ کو بُرا بھلا کہنے پر (اگر وُہ اُنکی عزّت نہ کرے) آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وقتاً فوقتاً انکو کوئی عزّت حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ تو وُہ اپنے کام سے متنفر اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور بیکاری کو اپنا شعار قرار دیکر کاہل الوجُود بنجاتے ہیں۔ ایسے لوگ مرنے کے بعد شیاطین بنجاتے ہیں۔

یہ تفریحات ان لوگوں کے لئے بھی ہیں جو صرف نفع کے لالچ سے کام کرتے ہیں۔ مگر محض جسمانی صُورت میں۔ اس قسم کے لوگ محتاط۔ ہوشیار اور محنتی ہوتے ہیں۔ خصُوصاً اگر وُہ سوداگر یا پیشہ ور ہوں۔ اگر وُہ اہل کار ہوں تو اپنے کام میں ہوشیار ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو روپیہ کی خاطر بیچ دیتے ہیں۔ اگر پیشوائے مذہب ہوتے ہیں تو نجات کو فروخت کرتے ہیں۔ روپیہ ہی اُنکا خدا ہوتا ہے اور ہر وقت اس شعر کو اپنا رہنما بنائے رکھتے ہیں کہ ؎

جس نے پیسہ دیا اُسی کے ہیں
پیر و پیغمبر و خدا کیا ہے

ایسے لوگ اپنے کام اور فرضِ منصبی سے بھی صرف یُوں محبت کرتے ہیں کہ اس سے پیسہ ہاتھ لگتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے اگر وُہ کسی اعلیٰ عُہدہ پر ہوں یہ بات بالکل نمایاں ہو۔ کہ وُہ روپیہ کی خاطر اپنے ملک کو بیچ دیں۔ حتّٰی کہ اپنی فوج اور شہر کے لوگوں کو دغا سے دشمن کے ہاتھ میں بھی دینے سے دریغ نہ کریں۔ دغابازی

تو اُن کے مزاج میں راسخ ہوتی ہے۔ اور چونکہ انہیں نفع کی خاطر نہ عزا کا ڈر ہوتا ہے نہ جزا کا۔ نہ بدنامی کا نہ قانون کا۔ اس لئے انہیں چوری کرنے اور لوٹ لینے میں بھی عار نہیں ہوتا۔ اگرچہ وُہ ظاہر میں سچائی کا جامہ پہنے رہتے ہیں۔ لیکن باطن میں ان کا دِل سیاہ ہوتا ہے۔ وُہ انسانوں کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جس نظر سے کہ شیر یا بھیڑیا بکریوں کو دیکھتا ہے کہ داؤں لگے تو پھاڑ کھائیں۔ انکو خلق اللہ کو فائدہ رسانی کا کچھ خیال ہی نہیں ہوتا۔ اُن کی تفریحات میں ایک قسم کی بہیمی خوشی ہوتی ہے۔ وُہ گدھے کے مانند ہیں جسے چراگاہوں اور کھیتوں میں سوائے اس چیز کے جو وُہ کھاتا ہے (خواہ وُہ گندم کی بالیں ہو یا جو کی) اور کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔ حقیقت میں طماع لوگوں کا یہی حال ہے!

اب ایسے لوگوں کو لیجئے جو محض پیٹ پالنے اور ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی خاطر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ یا وہ جو صرف نام کے لئے کام کرتے ہیں۔ تاکہ وہ مشہور ہوں "ہزاروں میں ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں" یا وُہ جو خاطر خواہ تنخواہ لینے کے واسطے کام کرتے ہیں تاکہ مالدار ہوجائیں اور چین سے زندگی بسر کریں۔ ایسے لوگوں کے لئے بس صرف مذکورہ بالا تفریحات ہی ایک فائدہ کے کام ہیں۔ یہ لوگ یقین کے بندے ہوتے ہیں۔ انکی روحیں ناپاک اور شہوات و خواہشات نفسانی سے مرکب ہوتی ہیں۔ وُہ اپنا کام محض تفریح کے لئے کرتے ہیں۔ ایسے لوگ حیوان بشکلِ انسان ہوتے ہیں۔ اور انکے فرائض ان پر بارِ گراں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ قایمقام ڈھونڈتے ہیں جو ان کی جگہ کام کرے۔ حالانکہ کام اُن کا ہو اور تنخواہ بھی یہ اُڑائیں۔ اس قسم کے لوگ جب مذکورہ بالا تفریحات میں مشغول نہیں ہوتے۔ تو بالکل احدی اور کاہل الوجود بنجاتے ہیں۔ پلنگ پر لیٹے یہ سوچتے رہتے ہیں کہ غپ زنی اور ہم نوالہ ہم پیالہ ہونے کے لئے ساتھی کہاں

ملیں؟ یہ لوگ خلق پر ایک بار گراں ہیں۔ ایسے تمام لوگ مرنے کے بعد تعذیر خانوں میں بند کر دیتے جاتے ہیں۔ جہاں ایک منصف مزاج منتظم انکا نگران حال رہتا ہے۔ اور ہر ایک کو کچھ روزانہ کام کرنے کے لیے بتاتا ہے۔ اگر وہ کام نہیں کرتے ۔ تو انہیں نہ روٹی کھانے کو ملتی ہے ۔ نہ کپڑا پہننے کو۔ اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے یہانتک کہ انہیں چار و ناچار کچھ مفید کام کرنا پڑتا ہے +

محمد سعید

کام کی باتیں

موت سے زیادہ کوئی چیز دنیا میں یقینی نہیں۔ پھر کسی کی موت کی خبر پر اچنبھا کیوں ہو ۔ زندگی پر تعجب ہو تو بجا نہیں کہ اب تک زندہ کیونکر ہے ؎ لائی حیات آئے ۔ قضا لیچلی چلے + اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جو غالب ہے وہ معشوق ہے جو مغلوب ہے وہ عاشق ہے ۔ گرچہ علم صرف کے رو سے خلاف ہے۔

حیوان ناطق کو حیوان مطلق پر اس سے بڑھکر اور اچھی کوئی دوسری فضیلت نہیں کہ وہ گذشتہ واقعات سے اطلاع رکھتا ہے اور سینکڑوں عقلا کے تجربہ سے ایک فرد فضیلت رکھتا ہے اور یہ صرف علم کی وجہ سے ۔

دنیا میں دوستی سے بڑھکر کوئی نازک رشتہ نہیں ۔ ؎ اس بلائے جان سے آتش دیکھئے کیونکر بنے + دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست ۔ قرابت مندی کے رشتے ٹوٹ ہی نہیں سکتے ۔ چاہے ہزار بے لطفی ہو ۔ دوستی کے رشتے مضبوط رکھنے والے بڑے مرد ہیں ۔ ؎ خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم ۔ انیسؔ ٹھیس نہ لگجائے آبگینہ کو۔

خادم مخدوم ہوجاتا ہے مگر مخدوم ہمیشہ خادم ہی رہتا ہے۔

تم کو وقت کا انتظار کرنا چاہئے ۔ وقت تمہارا انتظار نہیں کرسکتا۔

آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اس میں خوبی ۔ مگر اپنے عیب کو نہیں دیکھ سکتی۔

[illegible]

نالۂ فراق

اُستاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد انکی جُدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکینت قلبی کا مُنہہ دیکھنا نصیب نہ ہوا - ایک روز زورِ تخیل نے اُنکے مکان کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آگئے جنکی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں - اگرچہ انکی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اسوقت لکھی بھی جا چکی تھی - تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردآمیز اظہار تھا - کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا - آپ کی تشریف بری کے بعد دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم میں بہت سی تبدیلی ہو گئی -

(اقبال)

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں ‎ ‎ آہ مشرق کی پسند آئی نہ اسکو سرزمیں

آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں ‎ ‎ ظُلمتِ شب سے ضیائے روزِ فُرقت کم نہیں

"تا ز آغوشِ وداعش داغِ حیرت چیدہ است

ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگاہ خوابیدہ است"

کُشتۂ عزلت ہوں آبادی میں گھبراتا ہوں میں ‎ ‎ شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں

یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں ‎ ‎ بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے

اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ہو گئی رخصت مسرت غم مرا ہمدم ہوا ‎ ‎ دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا

کچھ عجیب اسکی جدائی میں میرا عالم ہوا   دل مرا منت پذیر نالۂ پیہم ہوا

"حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہ گوشم دیدہ اند"

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونیکو تھا   یہ شکستہ آئینہ عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوں کا ہرا ہونیکو تھا   آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونیکو تھا

ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم   تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائے صحرائے علم   تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

"شور لیلا کو کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند"

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پرخوں مرا   صورت سیماب مضطر ہے دل محزوں مرا
درد فرقت سے ہی رنگیں نالۂ موزوں مرا   داغ حرماں ہے سراپا ہر گل مضموں مرا

آہ وہ حاصل نہیں اوروں کو مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

کھولدیگا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو   توڑ کر پہونچونگا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو   کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جسکو ہے سخن تصویر کا

زندگی کا دامن انساں میں گویا خار ہے   آرزو کا دل میں سینہ میں نفس کا خار ہے
یوں تو اس عالم کے ہر ذرے سے اگتا خار ہے   خار فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے

"زندگانی در جگر خار است و در پا سوزن است
تا نفس باقی است در پیراہن ما سوزن است"

اقبال

رخصتِ شباب

یہ چند ابیات پریشان اپنے مکرم دوست میر نیرنگ بی - اے کی یادگارِ ملاقات میں لکھے ہیں -
اسی لئے انہیں کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں -

ذوالفقار علی خاں گوہر (رامپوری)

الفراق اے صحبتِ بزمِ نشاط — اب نہیں دل میں وُہ جوشِ انبساط
وُہ جوانی کی اُمنگیں اب کہاں — وُہ محبت کی ترنگیں اب کہاں
سر میں سودا ہے نہ دل میں چاہ ہے — شورِ نالہ ہے نہ زورِ آہ ہے
اب کہاں اگلی سی وہ بیتابیاں — وُہ تصور وہ پریشاں خوابیاں
وُہ میرے دل کی تپش جاتی رہی — وُہ اُمیدوں کی خلش جاتی رہی
آرزوئے وصل مُردہ ہو گئی — جستجوئے کوئے جاناں سو گئی
سب یہ عشقِ بد بلا کے ساتھ تھیں — یہ شبابِ فتنہ زا کے ساتھ تھیں
اِنتظارِ یار کی طاقت نہیں — بزم آرائی کی اب فرصت نہیں
اب نہ خود بینی نہ رشکِ غیر ہے — ذوقِ ہنگامہ نہ شوقِ سیر ہے
جب سرورِ کامرانی ہی نہیں — جب وُہ ذوقِ شادمانی ہی نہیں

پھر غمِ ناکامیٔ دِل کیا کریں — کیوں کِسی کے واسطے رویا کریں
صحبتِ ساقی کا چسکا مٹ گیا — وُہ نظر بازی کا لپکا مٹ گیا
شرکتِ بزمِ حسیناں کا خیال — اب نظر آنے لگا جی کا وبال
اب وُہ اگلی سی خود آرائی کہاں — چال میں اندازِ رعنائی کہاں
اب نہیں آنکھوں میں آثارِ خوشی — لب ہُوئے ہیں آشنائے خامشی
سُرخیٔ رخسار سب جاتی رہی — شوخیٔ گفتار اب جاتی رہی
وُہ مری جادو بیانی اب کہاں — وُہ طبیعت کی روانی اب کہاں
وُہ تبسم خیز باتیں ہی نہیں — ہائے وہ دن اور راتیں ہی نہیں
اب کبھی پہروں ہنسی آتی نہیں — دِل کی یہ اُفسردگی جاتی نہیں
صحبتِ احباب سے دل بھر گیا — کم ہوا سودا تو درد سر گیا
اب جوانی ہے نہ اُس کا دور ہے — خواہشِ دِل اور ہے دِل اور ہے
وقت سے پہلے ضعیفی آ گئی — خود بخود دِل کی کلی مرجھا گئی
ہو گیا دِل خوگرِ رنج و الم — چھا گیا افسوس کیسا ابرِ غم
وقت سے پہلے گذر جاتے ہیں — کاش دِل کے ساتھ مرجاتے ہیں
چھوڑ آئے ناداں یہ بیہودہ خیال — ہے زمانہ کی ہمیشہ سے یہ چال
اِک فقط تو ہی نہیں افسُردہ دِل — تجھ سے بھی بڑھ کر ہیں لاکھوں مُردہ دل
انقلابِ ہستیٔ عالم ہے یہ — جس سے چھٹکارا نہیں وُہ غم ہے یہ
کونسا گل ہے جو مُرجھایا نہیں — جو گیا پھر لوٹ کر آیا نہیں
گہ خزاں گاہے بہارِ بوستاں — آتی ہیں وقتِ معین پر یہاں
زندگی و موت لاتی ہیں یہی — گل کھلاتی گل سکھاتی ہیں یہی
انقلابِ آسماں ہے اس کا نام — ہو نہیں سکتا کسی شے کو قیام

بزمِ فطرت کا یہی دستور ہے — رات کو ظلمت تو دن کو نور ہے
شادی و غم ہیں زمانہ میں توام — پھر خوشی سے کیا خوشی کیا غم سے غم
ایک سا عالم کبھی رہتا نہیں — کون ہے جو سکھ میں دکھ سہتا نہیں
ہر کمالے را زوالے میشود — بدر کاہد تا ہلالے میشود
مقتضائے عقلِ انساں ہے یہی — وقت کے ساتھ اپنی بدلے چال بھی
جو نہیں کرتے کبھی اس پر عمل — اپنی آسائش میں پاتے ہیں خلل
شاخِ کہنہ تازہ پھل لاتی نہیں — راگنی بیوقت خوش آتی نہیں
موسمِ گرما میں سردی کا لباس — پہنتے ہیں صرف مخبوط الحواس
جھونپڑوں میں دیکھنا محلوں کے خواب — کر دیا کرتے ہیں انساں کو خراب
جاگنا سونے کے وقت اچھا نہیں — کر دیا کرتا ہے رنجور و حزیں
جاگنے کے وقت سونا قہر ہے — یہ فلاحِ زندگی کو زہر ہے
کان رکھ کر گوشِ دل سے سن ذرا — کہہ رہا ہے حالیٔ نغمہ سرا
چل رہی ہو جس گھڑی بادِ خزاں — بے محل ہے عہدِ گل کی داستاں
زندگی کا پھول تھا وقتِ شباب — اسکو اے غافل نہ کرنا تھا خراب
وقت تھا یہ بیش قیمت کام کا — یہ نہ تھا موقعہ ترے آرام کا
فکرِ خال و خط نے تجھ کو کھو دیا — تخمِ غم کیوں اپنے ہاتھوں بو دیا
شہد بھی ہے یہ جوانی زہر بھی — یہ ہوا ہے مہر بھی ہے قہر بھی
اس میں شیرینی بھی ہے تلخی بھی ہے — کامرانی بھی ہے ناکامی بھی ہے
ہم طریق اس کی سعادت چاہیے — ہم نفس اس کی مشقت چاہیے
جب ہوائے دل مشیر اسکی بنی — یہ سمجھ لے پھر جوانی ہو چکی
سرکشیٔ نفس بد انجام ہے — دشمنِ دیں دشمنِ آرام ہے

اس پہ جو غالب رہا وُہ مرد ہے — آسماں اس کا شریکِ درد ہے
رحمتِ حق اُس پہ برساتی ہے نور — اس سے رہتی ہیں بلائیں دُور دُور
جو ہوا مغلوب وُہ بدکیش ہے — بے خبر نا عاقبت اندیش ہے
اُس پہ لاتا ہے مصیبت یہ شباب — اُس پہ ڈھاتا ہے قیامت یہ شباب
اُلجھنوں میں رات دن رہتا ہے وُہ — دُکھ ہزاروں طرح کے سہتا ہے وُہ
وُہ سرورِ عافیت پاتا نہیں — سچ تو یہ ہے اُسکو چین آتا نہیں
ہو نہ جس میں فکر کچھ انجام کا — وُہ شباب وقت پھر کس کام کا
اس مصیبت میں نہ پڑنا ہی بھلا — ایسے ساتھی سے بچھڑنا ہی بھلا
حیف اُنپر ہے گیا جن کا شباب — لیکن ابتک دیکھتے ہیں پچھلے خواب
انقلابِ حال سے ہیں بے خبر — وقت بدلا وُہ نہیں بدلے مگر
ہو رہے ہیں زعمِ باطل میں خراب — وقتِ پیری کو سمجھتے ہیں شباب
آفتاب آیا ہے تا نصف النہار — اُنکی نیندوں کا نہیں اُترا خمار
یہ سمجھتے ہیں ابھی کچھ رات ہے — کیا ستم ہے کیا ہنسی کی بات ہے
ان کے حالِ زار کی ہے یہ نظیر — پیٹتے ہیں سانپ کے بدلے لکیر
حالتِ افراد حالِ قوم ہے — یہ زوال اُنکا زوالِ قوم ہے

پائیگی وُہ قوم کیا عزّ و وقار
جس میں ہو افراد کا یہ حالِ زار

گوہر - رام پوری

نغمۂ عشق

نکل کے گھر سے میں آج پہنچا جو صحنِ گلشن میں صبحگاہاں
چٹکتے غنچوں کو میں نے میٹھے سُروں میں پایا ترانہ ریزاں
تمہاری پیشانیٔ منور کا سجع تھا یاسمین کو از بر
تمہارے رخسارِ لالہ گوں پر گلاب مستانہ تھا غزلخواں
کنول تمہارے جھکے ہوئے سر کا وصف ادھر گنگنا رہا تھا
ادھر بنفشہ سنا رہا تھا حکایتِ کاکلِ پریشاں
تمہاری توصیف پھول سارے یہ کر کے ایک ساتھ کر رہے تھے
خدائی کہتی ہے خوب ہم کو مگر ہو تم بادشاہِ خوباں
گذر مرا صحنِ دشت میں پھر ہوا تو میں نے سنا کہ طائر
زمرّدیں شاخ کے منابر پہ ہیں گل افشاں و شکر افشاں
یہ نغمہ سب گا رہے تھے مل کر کہ حسن و خوبی کا تم ہو مصدر
عَرَض ہے حسن اور تم ہو جوہر ہے تم سے قائم نیاز کی شاں
تدرو طاؤس و کبک و ہُدہُد یہ شور پیہم مچا رہے تھے
نہ پائینگے پر نہ پائینگے ہم تمہاری طلعت تمہارا الحاں
یہاں سے پلٹا تو جا کے پہنچا تدم قدم میں کنارِ دریا
ہمہ تن اُس کو بھی میں نے پایا مگر نوا خوان و نغمہ سنجاں
یہ رازِ اُلفت بھرا ہمارا تھا اُس کے نغموں سے آشکارا
کہ تم میرے اور میں ہوں تمہارا بہم ہیں ہم اور تم تن و جاں

ہزاروں صدیاں گذر چکی ہیں تمہاری خوبی کا جب تھا چرچا
تمہاری اُلفت کا پڑھ کے کلمہ ہوا ہیں جب اوّلیں مسلماں

شنیدہ ایں شکریں نواہا شتافتم تا دوبارہ گردم
فدائے تو دلبرا کہ از من ربودہ نقد عقل و ایماں

ظفر علی خان

کم فرصت بچہ

سُنتے تھے کہ یہاں راحت و آرام بہت ہے
پر تجربہ کہتا ہے کہ یہاں کام بہت ہے

دن رات میں فرصت نہیں اتنے ہیں مشاغل
ممکن نہیں ہو جاؤں میں دم بھر کوئی غافل

اس پر بھی مرے کام مکمل نہیں ہوتے
عُقدے جو مرے کام میں ہیں حل نہیں ہوتے

لو آج ہی جس وقت سے ہونے لگی بارش
شیشوں پہ دریچوں کے ہوئی بوندوں کی تراوش

اس وقت سے بندہ ہمہ تن چشم تماشا
دیکھا کیا ایک ٹکٹکی باندھے یہی نقشا

اِک وقت میں اِک کام پہ پر کی نہ قناعت
نادانی سے سر پر پڑی یہ ایک نئی محنت

اِک گیت زباں پر جو کہیں ہو گیا جاری
دو پہر اسی راگ کے دھندے میں گزاری

تھے اس کے سوا اور بھی بہتیرے مشاغل
طے اور بھی کر ڈالے کئی میں نے مراحل

آئینے پر ایسا کوئی اک پھونک دیا دم
وہ جس کے اثر سے ہوا اک آن میں پر نم

اس نم کو وہیں صورتِ تصویر بنایا
تصویر کو اک لحظہ میں پھر خود ہی مٹایا

پھر فرشِ زمیں پر جو توجہ ہوئی مائل
تعمیر کئے اس پہ مکاں رہنے کے قابل

ٹوٹی ہوئی کشتی جو مری سب سے بڑی ہر
اب اس کی مرمت کی مجھے فکر پڑی ہر
دعوت جو خیالی مرے ہاں ہوتی ہر اکثر
پھر اس میں بلاتے ہیں مجھے سارے تونگر
اتنے ہیں تردد مری اک ننھی سی جان کو
فارغ جو ہیں کیا جانیں وہ اس دردِ نہاں کو
اب کھیل کی فرصت کوئی ڈھونڈے تو کہاں ہے
"مصروف ہوں مصروف" یہی وردِ زباں ہے

(ترجمہ از انگریزی)

اکرام

مرأت العروس

شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب ایل ایل - ڈی کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب مرأت العروس کا ایک نہایت عمدہ انگریزی ترجمہ حواشی انگلستان میں شائع ہوا ہے - یہ ترجمہ جناب مسٹر جی - وارڈ صاحب بہادر پنشنر سی - ایس - کی اُردو دانی کا بہترین نمونہ ہر - یہی صاحب ہیں جنہوں نے رباعیاتِ حالی کا بھی انگریزی ترجمہ نظم میں کیا ہے - ہمارے دوست سید محمد ضامن صاحب کنتوری نے وارڈ صاحب کے ترجمہ مرآۃ العروس کی یہ منظوم تقریظ لکھی ہے - جو قابلِ دید ہے :-

مہرِ عالمتاب جب پنہاں ہُوا
پڑ گیا دُنیا پہ پردہ رات کا
ہر طرف سے اِک خموشی چھا گئی
لیکے جامِ بیخودی نیند آگئی
کر دیا ایک اِک کو مستِ خواب ناز
اٹھ گیا نیک اور بد کا امتیاز
ہو کے فارغ سارے دن کے کام سے
بستروں پر لیٹے لوگ آرام سے
تیرگی تھی سارے عالم پر محیط
اور تھی غفلت نیند کی ہم پر محیط

ہوشیاری ایسی غفلت پر نثار   تھی خودی کی بیخودی آئینہ دار
کیوں نہ ہو اللہ کی رحمت ہی نیند   دافعِ گردِ غم و کلفت ہے نیند
نام میں اسکے ہے جادو کا اثر   کرتی ہے ہر باخبر کو بیخبر
نشۂ اس کا نشۂ مے سے ہی تیز   جس سے کرتی ہے خودی کوسوں گریز
گہ غم افزا گہ طرب اندوز ہے   روح اسکی مرغِ دست آموز ہے
اسپہ وا ہر ایک بابِ بستہ ہے   مایۂ راحت پئے ہر خستہ ہے
جیتے جی جنت میں یہ پہنچاتی ہے   خاکیوں کو عرش پر پہنچاتی ہے
لیٹے ہی لیٹے کرا دیتی ہے سیر   سارے عالم کی دکھا دیتی ہے سیر
تختِ شاہی پر کبھی پہنچا دیا   قعرِ نکبت میں کبھی پھنکوا دیا
حور بنکر جلوہ دکھلایا کبھی   دیو بنکر جی کو دہلایا کبھی
نیند جس دم آنکھوں میں آ گئی   طرفہ تر نیرنگ دکھلانے لگی
تھا عجب لطفِ تماشا خواب میں   خضرِ فرخ پے کو دیکھا خواب میں
لائے ہیں تشریف وہ عالی صفات   ہاتھ میں ہے ساغرِ آبِ حیات
مجھ سے فرماتے ہیں پی لے اسکو تو   گر ہے عمرِ جاوداں کی آرزو
جام بھی یہ جامِ جم ہے دیکھنا   دوست رکھنا جان سے اسکو سوا
اس میں آئینگے نظر اشکال وہ   تھے نہاں مرآتِ اسکندر سے جو
کھل گئیں آنکھیں جو ہیں دیکھا یہ خواب   غرقِ حیرت تھا دلِ پر اضطراب
فکر تھی یا رب یہ ہے کیا ماجرا   ہو گی اسکی آخرش تعبیر کیا
کون ہے خضر اور ہے کیا آبِ حیات   جامِ جم کیسا ہے یہ کیا واردات
اتنے میں خورشید نکلا دن ہوا   تیرگیِ شب کا پردہ اٹھ گیا
خوابِ راحت سے ہوئے سب ہوشیار   خلق کا جاری ہوا پھر کاروبار

یُوہیں جب سات آٹھ نو دس بجگئے — ڈاکیہ وارد ہوا کچھ خط لئے
اُن خطوں میں ایک پیکٹ بھی تھا — دیکھتے ہی جس کے جی خوش ہوگیا
تھا عیاں سرنامہ سے رنگِ وداد — نُور افزاے نظر خط کا سواد
کِس طرح کہیے کہ وُہ تحریر تھی — مشفقِ نادیدہ کی تصویر تھی
الغرض دل کو زیادہ کب تھی تاب — جب لفافہ کھولا نکلی اِک کتاب
پڑھ کے ٹیٹل ہیچ ظاہر ہوگئی — تھی جو کچھ تعبیر شب کے خواب کی
یعنے وُہ جو خضر صُورت تھی بزرگ — مجھ پہ جو ہیں مہرباں جیسے بزرگ
ہیں وُہ جی - ای واڈ صاحب ذی ہنر — فاضلِ نامآور و بالغ نظر
جو ہیں اُستادِ علومِ مشرقی — بلکہ نقادِ علومِ مشرقی
ہیں ادیبِ کاملِ اُردو زباں — جیسے کوئی فاضلِ ہندوستاں
آبجواں ہیں وُہ افکارِ عجیب — جنکا سرچشمہ ہو اِک ہندی ادیب
دِل ہے بہرِ قوم جسکا دردمند — جسکی ایک اِک بات ہو ایک ایک پند
کرکے ظاہر فائدہ تعلیم کا — جس نے کی ہے سعیِ بہبودِ نسا
کردیا ہے جس نے یہ گُر آشکار — عورتوں پہ ہے ترقی کا مدار
عورتیں جب قوم میں جاہل رہیں — مرد لایق ہوسکیں ممکن نہیں
جام وُہ جس میں یہ آبِ صاف تھا — ساغرِ جم سے ہر رُتبہ میں سوا
یعنے شرحِ بابِ عادات العروس — نسخۂ نایاب مرآۃ العروس
جو توجہ سے بنا ہے وارڈ کی — شمع فانوسِ زبانِ انگلشی
روشنی کا جسکی ہوگا یہ اثر — لیڈیاں یُورپ کی جو ہیں باخبر
دیکھینگی خال و خطِ خوبانِ ہند — سمجھینگی کچھ حالتِ نسوانِ ہند
جس سے پیدا ہوگا ربطِ باہمی — آئیگی بیگانگی میں کچھ کمی

گرچہ تجسدِ ظاہری رہ جائیگا — ہوگا قائم باطنی اِک سلسلہ
مِل گئی تعبیر جب یہ خواب کی — پھر تو دِل کی کچھ عجب حالت ہوئی
ہوگیا بیخود خوشی کے جوش میں — مست جیسے ہو نہ اپنی ہوش میں
وہ تِرے ہندی جو تھی لکھی ہوئی — سامنے یورپ کے خم میں تھی دھری
یعنے پہلے جو کتاب اُردو میں تھی — اب وُہ انگریزی میں چھپکر آگئی
پھر خیالِ استفادہ ہوگیا — شوق پابندِ ارادہ ہوگیا
کیا کہوں پڑھ کر ملا کیسا مزہ — ہر ورق پر کرتا تھا شُکرِ عطا
یُوں تو انگلش کی ثنا ممکن نہیں — اِس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں
صاف ہے سنجیدہ ہے آسان ہے — پھر بھی پُوری ترجمہ کی شان ہے
وارڈ سا فاضل کہاں ضامن کہاں — ذرہ نتوا ند رسد تا فرقداں

آپ کی تعریف اور میرا دہن
اس میں ہے خود مجھ کو بھی جائے سخن

اِقبال

یہ نظم میں نے اپنے ارادے سے نہیں لکھی بلکہ اقبال کی زبردست سخنوری نے جبرًا مجھ سے لکھوائی ہے۔ گو یا یہ خراج ہے جو انکی شاعری نے میری شاعری سے لیا ہے۔ ہرچند حضرت اقبال سلمہ اللہ تعالے بطور شاعر کے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں مگر میرے خیال میں انکی شاعری کا پایہ انکی شہرت سے بلند تر ہے:۔

(قیصری)

پیشِ آہوئے خطۂ تاتار بُوئے مشک ارمغاں فرستادم
جاہم غنچہ ہائے معنے را سُوئے آن گلستاں فرستادم
جمع آوردہ دُرِّ یکدانہ پیشِ پیرِ مغاں فرستادم
گلِ رنگیں و تر گرفتم ازو برگِ فصلِ خزاں فرستادم

مرحبا اقبال اس جادو بیانی پر تری حبذا طرزِ جدید شعر خوانی پر تری
واہ وا ایسی طبیعت کی روانی پر تری آفریں! اس نکتہ دانی نکتہ رانی پر تری
شمع ہے تو شاعری کی انجمن کیواسطے
فکر تیرا دام ہے مرغِ سخن کیواسطے

بلبلِ پنجاب تُو پنجاب ہے گلشن ترا پُر ہے نو گلہائے مضموں سے سدا دامن ترا
جسکا دانہ دانہ خرمن ہو وُہ ہی خرمن ترا دُوسروں کے سو تصنع ایک سادہ پن ترا
نقشِ تصویرِ مضامیں کے لئے مانی ہی تو
خطۂ ہندوستاں میں غالبِ ثانی ہی تو

ہیں نئے مضموں ترے باغِ سخن کی باغباں چُست تیری بندشیں سب سے جُدا طرزِ بیاں
چشمۂ کوثر میں ہر دھوئی ہُوئی تری زباں جو ادا تجھ میں نکلتی ہے وہ اَوروں میں کہاں؟
"از ہمہ خُوباں بر عنائی یگانہ بُودہ
وز جمالِ خویش در عالم فسانہ بُودہ"

صرفِ فکرِ شعر جب تیری طبیعت ہوگئی درد قرباں ہو گیا۔ صدقے فصاحت ہوگئی
تیرے طُوفانِ مضامیں سے یہ حالت ہوگئی سطرِ مسطر موجۂ بحرِ بلاغت ہوگئی
یہ کہیں رُوح القدس کی کارفرمائی نہ ہو!
شعر کے پردے میں اعجازِ مسیحائی نہ ہو!

کی ہے خالق نے عطا چشم تماشا جو تجھے
ہو دلِ پر درد جس میں وہ دیا پہلو تجھے
ہے الف اللہ کا سرو کنار جو تجھے
نغمۂ قمری صدائے نعرۂ یا ہُو تجھے

تو پسندِ خاطرِ خورد و کلاں ہونے کو ہے
یعنی اے یوسف عزیزِ کارواں ہونے کو ہے

اے شہِ ملکِ سخن رُوحِ روانِ قیصری
ایک موزوں ہے ترے سر پر کلاہِ برتری
ایک تیری نظم ہے نورِ خردِ جاں پروری
ایک تیرا شعر ہے خالِ لبِ افسوں گری

طبع تیری غیرتِ صد ابرِ نیسانی رہے
ذات تیری مظہرِ الطافِ یزدانی رہے

بدر الدین قیصری

تازہ غزلیں

نازو نیاز ظاہر و باطن رقیب سے
کیا کہیئے ! ہم کو شکوے ہیں کیا کیا حبیب سے
لگ لگ کے پاس بیٹھنے والا وہ کون تھا
دُشمن کو تم نے کیوں نہ اُٹھایا قریب سے
کوئی بنا رقیب کوئی پاسباں بنا
فتنے کئی اُٹھے تھے خرامِ حبیب سے
اغیار کا گلہ ہے نہ کچھ یار کا گلہ
جو کچھ ہوا۔ ہوا وہ ہمارے نصیب سے
انساں کے قول و فعل میں اس درجہ اختلاف
منبر پناہ مانگ رہا ہے خطیب سے
کیا جانتا تھا اُن میں بھری ہیں یہ شوخیاں
ظاہر دکھائی دیتے تھے حضرت غریب سے
الفت بیک نگاہ کا قائل نہیں غلام
صاحب ذرا علاج کرائیں طبیب سے

دیکھے فریبِ عشق کی نیرنگیاں تمام معشوق سادہ لوح ملا ہے تو نصیب ہے
ملتی ہے زخم رشک میں لذت وصال کی ذکر حبیب سُنکے زبانِ رقیب سے

قطعہ

کیا پوچھتے ہو مجھ سے مری بے بسی کا حال دیکھو کہ رنگ کیا ہے تمہارا رقیب سے
خودداریاں کہاں ہیں کہاں ہے غرورِ حسن دل کے معاملے ہیں سریجاں عجیب سے

تیرا ہوا ہے اور نہ ہوگا وُہ بیوفا
اعجاز تابہ کے یہ لڑائی نصیب ہے

غزل

مانوس کیوں نہ ہو دلِ وحشی حبیب سے ایک یار دلنواز ملا ہے نصیب سے
کہدیگی دُور سے نگہِ شوق وہ پیام الفاظ جسکو کہہ نہیں سکتے قریب سے
ایک ہجر و وصل کیا کسی حالت میں کل نہیں ہیں تیرے ولولے دلِ ناداں عجیب سے
اے وائے نارسائی دستِ درازِ شوق! اور آپ کا نکل کے وُہ جانا قریب سے
ہم نے اُنہیں سُنا ہی دیا ماجرائے دل حالِ مریض کیونکہ چھپاتے طبیب سے
اللہ رے اُنکی اُٹھتی جوانی کی شوخیاں! بچپن میں تھی جو بھولے سے جیسے غریب سے
جلتے کے دِل کو اور جلانا ضرور تھا ہم نے نوازشیں تیری کہدیں رقیب سے
لاکھوں گلوں میں ایک اُسی جلوہ کی ہے تلاش سیکھو اصُولِ اہلِ نظر عندلیب سے

تحسینِ حسنِ یار میں ہے میرا ہم خیال
نیرنگ کیوں نہ ہو مجھے اُلفت رقیب سے

غزل

ہے گل کو عشق آہ دلِ عندلیب سے — سنتا ہے نالہ کان لگائے قریب سے
دو باتیں اَور کرنی رہی ہیں حبیب سے — وہ بھی کوئی جو موقع ملے گا نصیب سے
رندانِ مست دیکھتے ہی ہم کو کھل گئے — جیسے کوئی حبیب ملے ہے حبیب سے
آئی نگاہِ ناز تو رہتی ہے دُور دُور — چٹکی مگر وہ لیتی ہے دل میں قریب سے
انداز وہ کہ فتنۂ محشر نثار ہو — شوخی تو دیکھو بیٹھے ہیں کیسے غریب سے
بادِ صبا فسردہ دلوں کو نہ چھیڑ تو — لازم نہیں ہے لگ کے یہ چلنا غریب سے
ہم دل جلوں کا کام بجز اس کے کچھ نہیں — شکوہ حبیب سے ہے گلہ ہے نصیب سے

حالی نے سچ کہا ہے یہ اے بختِ دل حزیں
پوچھو وطن کی قدر مسافر غریب سے

(زینب شفیعہ بیگم)

غزل

دیوانگی کی شورش پیشِ نظر بیاباں — وحشت کا سر میں سودا۔ دل میں جنوں کا ساماں
کٹتی ہے زندگانی کیا کیا اُدھیڑ بن میں — سیتا ہوں کر کے ٹکڑے پھر دامنِ گریباں
سُن سُن کے میرے نالے۔ خوش ہیں جہان والے — زندانیٔ قفس ہے اک بلبلِ خوش الحاں
کہیو دامنِ صبا سے جو کھلے کبھی تو کھل جائے — احوالِ لالہ و گل شمشاد و سرو و ریحاں

یاروں سے میں بچھڑ کر جیتا ہوں کیسے صادق
میرا رشتۂ بقا ہے یادِ عزیز یاراں

(صادق)

غزل

جو کرم ہم پہ کچھ بھی مائل وہ جفا شعار ہوتا مجھے وہم گھیرے رہتے نہ یہ انتشا
بہت اے صبا نہ اترا مجھے تیری سب خبر ہے نہ کسی کو چھو کے آتی نہ یہ افتخا
ترے نیم جاں ہزاروں ترے جاں نثار لاکھوں یہ کہاں تھی میری قسمت کہ مرا شما
کسی کوہ پر گرا کر دن مرے اشک جمع ہوتے تو جہاں میں سب سے بہتر وہی آ
یہ کہاں سے لاتا جرأت یہ کہاں سے آتی ہمت
کہ جو تیرا مظہری سا کوئی جاں نثار ہوتا

محمد شفیع احمد مظہر

غزل

شکوہ ہے چرخ کا یا دہر کا بربادی میں ایک سے ایک ہے بڑھ کر ستم ایجا
شورِ ماتم سے مبدل کبھی گلبانگِ سرور حشر برپا کہیں عشرت کدہ شا
آہ! نیرنگِ فلک سے کبھی آتا ہے نظر منظر نینوہ کشمیر کی بھی وا
کرتی ہے تیغِ خزاں سینہ شگافی بہار یہ بھی دستور ہے اس عرصۂ بربا
اس کے خنجر کے اشارے سے کٹی گردنِ عیش فلکِ پیر جواں مشق ہے جلاد
تیشۂ جورِ زمانہ سے ہوئے حیف! ہلاک شہرۂ آفاق تھے عشاق جو فرہا
مرمرِ واقعہ سے ہو گئی پیوست زمیں نامور تھے جو حسیں قامتِ شمشا
آئے بسا غنچۂ شگفتہ کہ وہ باصد ناز ٹہنیوں پر تھے پڑے جھومتے آزا
ناگہاں آیا چمن زار میں طوفانِ عظیم ڈوبی آزادی سب اس ورطۂ بر

آخر اے دلِ نو ہے پابستہ تا بہ کجا؟ حلقۂ سلسلۂ فرطِ غم و شادی میں
سیرِ عبرت کے لئے کر کسی ویرانہ کی غفلتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں آبادی میں
ہمصفیرانِ چمن پردہ کرے کیا نوحہ
مثلِ مشتاق جو ہو پنجۂ صیادی میں

(محمد شفیع مشتاق)

منتخباتِ سالک

تمکیں سے نہ دیکھے جو کبھی آئینہ جھک کر وُہ مرتکبِ شرم و حیا ہو نہیں سکتا
ماتم زدہ کے ہاتھ سے گھبرا نہ شبِ وصل عادت ہے کہ سینہ سے جدا ہو نہیں سکتا
کہنے پہ چلے دل کے عبث یہ بھی نہ جانا گمراہ کبھی راہ نما ہو نہیں سکتا
میں اُس نگہِ ناز کا محکوم ہُوں سالک وابستۂ احکامِ قضا ہو نہیں سکتا

کہوں مطالب سب اپنے جی کے یہ شرط کیجے کہ ہاں نہ کیجے
کہو نہیں پھر اُسی طرح سے مجھے ہے سُننا نہیں نہیں کا
عجب ہے سالک کبھی رند مشرب کہ چھوڑ بیٹھا ہے ملتیں سب
نہ مانتا ہے کسی کا مذہب نہ ہے یہ پابند اپنے دیں کا

مُنہہ نہ کھلوا تجاہل سے یہ کہ کیا دیکھا کیا کہیں بزم میں دشمن کی جو دیکھا دیکھا
جس نے اس برقِ تجلّی کو سراپا دیکھا کہ سکا ہوش میں آکر نہ کبھی کیا دیکھا
عشق وُہ شے ہے کہ الکن کو بناتا ہی کلیم تجھ سے نقصان نہ کچھ اے لکنتِ موسیٰ دیکھا

وہی رونا ہے وہی گریہ ہے سالک تجھ کو تندرستی میں بھی ہم نے تو نہ اچھا دیکھا

دل محبت مکان ہے گویا آرزو کا جہان ہے گویا
کھول دے منہ خموں کے پیر مغاں آج ہی امتحان ہے گویا
تیری تصویر کیوں نہ بول اٹھے اس میں عاشق کی جان ہے گویا
تیرا چپ چاپ بیٹھنا سالک اک طرح کا بیان ہے گویا

میرا ہوا آشیانہ اور آدھا جلا ہوا بجھ بھی گئی تھی آگ تو بجلی کو کیا ہوا
عاشق ہیں اُس پہ رشک سے کہتے ہیں تو نہ مل معلوم ناصحوں کا نہ مجھے مدعا ہوا

جس قدر ضبط کیا اور بھی رونا آیا یہ طبیعت نہیں آئی کوئی دریا آیا
کوچۂ یار میں آ کر نہیں جاتا کوئی یہ وہ جا ہے کہ یہاں جو کوئی آیا آیا
رات کیا جانیے کس طرح گزاری ہم نے اپنے وعدہ پہ شب وعدہ تو اچھا آیا
وعدۂ وصل پہ قسمیں تو نہ کھا عہد شکن باور آیا نہ مجھے بس اور تو آیا آیا
کہہ اٹھا آج کہ اس بت کو خدا لائے کہیں شکر ہے لب پہ مرے نام خدا کا آیا
اشک آنکھوں میں بھرے لب پہ فغاں دامن چاک جو تماشے کو گیا وہاں سے تماشا آیا

ڈالا ہے کشمکش میں مجھے شوق رشک نے نادم بلا کے میں تجھے اے نامہ بر ہوا

ضبط فغاں بھی راز کا پردہ اٹھا گیا میری خموشیوں سے وہ مطلب کو پا گیا
عاشق مزاج اپنی یہ کچھ اُن کا حسن وہ گذرا نظر سے جلوہ کہ دل میں سما گیا

سالک نکل کے میکدہ سے آگئے کدھر　　ساغر کو پھینکو ہاتھ سے بازار آگیا

ہم اُنکو دیکھ کر ہوتے ہیں یہانتک محوِ نظّارہ　　بھری محفل میں بھی ہم کو مزا آتا ہی خلوت کا
عدم سے کیوں چلے آتے خرابآباد دنیا میں　　ازل میں گر دکھا دیتے نوشتہ ہم کو قسمت کا
زمانہ رفتہ رفتہ آگیا چشمِ تصوّر میں　　مزا جاتا رہا سارا ہماری کنجِ عزلت کا

ایک ہم ہیں کہ جسے دوست بنایا نہ بنا　　ایک دُنیا سے ملا رہتا ہے دشمن کیسا

ابھی نامہ بر کو روانہ کیا　　ابھی کہہ رہا ہُوں کہاں رہ گیا
ترے لُطف نے کی یہانتک کمی　　جو پہلے یقیں تھا گماں رہ گیا
مَیں واماندہ اور کہہ رہا ہی جرس　　رہا جو پسِ کارواں رہ گیا

کرونگا تنگ آکر اب کے وُہ آہ　　کہیں گے لوگ یہاں چرخ کہن تھا
کہاں تم اور کہاں اغیار سچ ہے　　نہ غصّہ ہو یہ میرا سوئے ظن تھا
نہ مرتا کس طرح فرہاد سالک　　فلک پہنے لباسِ پیرزن تھا

انتخاب لاجواب کیوں اسقدر ہر دلعزیز ہو گیا ہے؟

اوّل یہ کہ اس قسم کے دلچسپ اور مفید لائق لٹریچر کا ایک بھی رسالہ اُردو زبان میں شائع نہیں ہوتا۔

دوم یہ کہ باوجودیکہ یہ ہفتہ وار ہے۔ اسکے دلچسپ مضامین کی مجموعی مقدار ماہوار رسالوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

سوم۔ یہ کہ اس کے مضامین ٹھوس طویل بھدّے اور مشکل نہیں ہوتے۔ بلکہ نہایت سہل پُر مذاق دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں اور اسی لئے ہر پرچہ میں بیسیوں مختلف مضامین ہوتے ہیں۔

چہارم یہ کہ اس میں آجتک پندرہ بیس اعلیٰ درجہ کے دلچسپ سلسلہ وار ناول انگریزی۔ ترکی۔ فرانسیسی۔ بنگالی وہندی وغیرہ زبانوں سے ترجمہ ہو کر اور طبع زاد بھی چھپ چکے ہیں۔ اتنے ناول آج تک کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں نہیں چھپے ہونگے۔

پنجم یہ کہ اس میں مشاہیر عہد کا ایک مہتم بالشان باتصویر سلسلہ چھپا ہے کہ جس میں آج تک ہندوستان اور دنیا کے ۲۶۰ مشہور لوگوں کے حالات اور تصویریں چھپ چکی ہیں۔ کیا صرف یہی سلسلہ بجائے خود اس پرچہ کو نہایت دلچسپ اور مفید بنانے کیلئے کافی نہیں ہے؟

اگر مخزن کے اس صفحہ میں زیادہ گنجائش ہوتی تو ناظرین کو بتلایا جاتا کہ انتخاب کے اس قدر ہر دلعزیز ہونے کی چھٹی۔ ساتویں۔ آٹھویں۔ نویں اور دسویں وجہ کیا ہے لیکن مجبوراً اسکو یہاں ختم کر کے باقی وجوہات معلوم کرنے کے لئے آپ کو انتخاب کا پرچہ منگانے کی سفارش کی جاتی ہے۔ جو آپ کے لکھنے پر مفت نذر ہوگا۔

منیجر انتخاب لاجواب لاہور

جوہرِ تحقیقات

قیمت فی جلد ۱۲ [illegible]

[illegible]

تمام مسائل مذہبی۔ اخلاقی۔ ملکی وغیرہ کا فیصلہ قطعی بدلائلِ معقول و منقول جیسا اس کتاب میں ہے۔ ویسا آج تک دیکھنے و سُننے میں نہیں آیا۔ مُشتے نمونہ

فہرستِ مضامین یہ ہے:۔

پنڈت ہیمراج وید وشارد سب ایڈیٹر بھارت بھگنی پترکا کا ویدک اوشدھالیہ بسرپرستی مسٹر روشن لال صاحب بی-اے بیرسٹر ایٹ لا لوہاری منڈی لاہور

[illegible]

[illegible]

معزز صاحبان اسوقت ادویات کے اشتہارات دینے والوں نے کوئی الفاظ اس قسم کے نہیں چھوڑے جنکو لکھ کر ایک سچا آدمی اپنی سچائی کو ظاہر کر سکے - اسلئے ہم بالکل سادہ اور مختصر الفاظ میں عرض کرتے ہیں - کہ آپ مہربانی کر کے ہماری ادویات کا پہلے نمونہ منگا کر تجربہ کریں - اگر ہماری تحریر کے مطابق ہوں تو دوائی منگوائیں ورنہ جانے دیں -

نین امرت روغن - یہ روغن آنکھوں کے جملہ امراض مثلاً جالا - دھند - غبار - موتیابند - ککرے پانی کا بہنا - سرخی جلن وغیرہ کو چند ہی روز کے استعمال سے بیخکنی کر دیتا ہے اگر چھ ماہ تک مطابق ہماری ہدایت کے استعمال کیا جاوے تو عینک کی حاجت نہ ہوگی قیمت فی شیشی جو ایک سال کیلئے کافی ہوگی صرف عہ علاوہ محصولڈاک وغیرہ نمونہ ۲/ - دو شیشی اکٹھی منگوانے پر معہ محصولڈاک ایک روپیہ ♦

خان بہادر جناب ڈاکٹر سید امیر شاہ صاحب ایل-ایم-ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور میں تصدیق کرتا ہوں کہ پنڈت ہیمراج وید کے تیار کردہ نین امرت تیل کو میں نے (بچوں وغیرہ) اور آنکھوں کے ککروں میں استعمال کیا اور اسکو مفید پایا -

پنڈت شیودت صاحب شرما - مہامہوپادھیائے ہیڈ پروفیسر سنسکرت - سپرنٹنڈنٹ سنسکرت ڈیپارٹمنٹ اورینٹل کالج لاہور و فیلو یونیورسٹی پنجاب :- میں نے پنڈت ہیمراج وید وشارد کے تیار شدہ موم کے تیل اور نین امرت تیل کی پریکشا کی - موم کے تیل کی دو ہی دفعہ کی مالش سے میرا انگوٹھے کا درد دور ہوگیا - درد دور کرنے کے لئے یہ ایک عجیب دوا ہے - نین امرت تیل کی تعریف نہیں ہو سکتی - یہ اسم با مسمیٰ ہے آنکھوں کی ہر ایک بیماری کو دور کر کے بینائی کی طاقت کو بڑھاتا ہے -

مولوی عبد الحکیم صاحب شمس العلماء پروفیسر و سپرنٹنڈنٹ پرشین ڈیپارٹمنٹ اورینٹل کالج و فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کالونہ ضلع گوجرانوالہ :- پنڈت ہیمراج صاحب کا نین امرت روغن کا تجربہ کیا گیا جن اشخاص کو یہ دوائی دی گئی پنڈت صاحب کے ثنا خواں ہیں اور مجھکو اپنے خاص تجربہ سے عیاں ہو گیا کہ یہ دوائی ضعف بصارت - تاریکی چشم - دھند - آنکھوں سے پانی جانا وغیرہ امراض چشم کے لئے نہایت مفید ہے ♦

مولوی مفتی محمد عبد اللہ شمس العلماء ہیڈ مولوی و سپرنٹنڈنٹ اورینٹل کالج لاہور و فیلو پنجاب یونیورسٹی و پریزیڈنٹ انجمن اسلامیہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ نین امرت تیل آنکھوں کے لئے مفید دوا ہے - مجھے امید ہے کہ لوگ اس کے استعمال کرنے پر میرے بیان کی تصدیق کرینگے - اس لئے میں پبلک سے اس سے فائدہ اٹھانے کی سفارش کرتا ہوں -

پنڈت ہیرانند صاحب شاستری ایم-اے میکلاڈ سنسکرت سکالر پنجاب یونیورسٹی و سنسکرت پروفیسر اورینٹل کالج گورنمنٹ و دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور :- میں پنڈت ہیمراج وید وشارد کو بخوبی جانتا ہوں - وہ سچے ایماندار اور محنتی نوجوان ہیں - انہوں نے بہت ہوشیاری سے اپنے سنسکرت چکتسا گرنتھوں کو پڑھ کر اپنا دوائی خانہ کھولا ہے جسمیں چند بہت مفید ادویات تیار کی ہیں - میں انکا نین امرت روغن کا استعمال کرتا ہوں یہ آنکھوں کیلئے نہایت ہی عمدہ دوا ہے - اس لئے میں اس روغن و نیز مصطگی سودمی کے تیل کی جو کہ میرے امتحان میں آ چکی ہے پبلک کی فائدہ کے لئے بہت زور سے سفارش کرتا ہوں ♦

امجد بیگ کا روغنِ خضاب

صرف پانچ منٹ میں سفید بالوں کو قدرتی بالوں کی طرح سیاہ کر دیتا ہے باندھنے کی ضرورت نہیں صرف برش سے لگا دیجئے دوسرے خضابوں کی طرح بالوں میں بھورا پن نہیں آتا۔ ایک مدت دراز تک رنگ نہیں جاتا اور اسی بات پر مجھے ناز ہے۔ ورنہ خضاب کے نسخے ہزاروں آجکل مروج ہیں۔ مگر میرے خضاب کی طرح بالوں کا رنگ قائم اور نرم چمکدار نہیں بناتے۔ قیمت سب خضابوں سے بہت کم یعنی فی بکس معہ محصولڈاک ایک روپیہ۔ اور اس بکس میں دو شیشیاں ہیں۔

اس کے علاوہ ولایتی ہر قسم کی نایاب اشیاء جرمن۔ فرانس۔ امریکہ۔ لندن مثلاً گھڑیاں ہر قسم کی۔ بالکل خوشنما مضبوط۔ گاڑی گھوڑوں کا ساز سامان موٹر کار۔ یہ گاڑی بجلی کی قوت سے خود بخود چلتی ہے۔ عجیب طلسمی گاڑی ہے۔ غرضیکہ تمام دنیا کی چیزیں میرے ذریعہ سے آپکو گھر بیٹھے پہنچ سکتی ہیں۔

برقی فیتہ۔ اس فیتہ میں بجلی کی قوت دی گئی ہے جس بچے کے گلے میں پہنا دیا جائے دانت بہت آسانی سے نکل آئیں۔ تمام ڈاکٹروں کا اس پر اتفاق ہے **قیمت دو روپے** (عہ)۔

سرمہ کی گولی۔ نہایت مفید آزمودہ آنکھ کے ہر مرض کے لئے تاثیر اکسیر رکھتی ہے **قیمت** فی تولہ ایک روپیہ (عہ)

قرآن مجید۔ یہ قرآن شریف ایک انچہ لمبا اور ایک انچہ سے کسیقدر کم چوڑا مختلف دھاتوں کے تعویذ میں بند ہوا اس کے ساتھ ایک آتشی گلاس بھی ہے۔ آتشی گلاس کے ذریعہ خوب اچھی طرح سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ کتنی برکت کی بات ہے۔ ایک تعویذ تمام کمال قرآن شریف کا جو نہایت خوشنما گلے میں ہے۔ اس سے زیادہ حرزِ جان کے لئے عمدہ کوئی چیز صاحبان اہلِ اسلام کو ممکن نہیں ہے۔ **قیمت تین روپے** (عہ)۔

بواسیر کا چھلہ جو ماہ رجب کی ایک مخصوص تاریخ میں برکت اسماء الٰہی سے تیار کیا جاتا ہے خونی و بادی ہر قسم کی بواسیر کو دفع کرتا ہے ایک درویش کامل کا عطا کیا ہوا ہے **قیمت فی چھلہ ۱۰** المشتہر

مرزا امجد بیگ تاجر کتب بمبئی بھنڈی بازار

مخزن

سکّہ کی ابتدا اسلام میں

جناب مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے۔ ڈپٹی کمشنر ضلع بیڑ علاقہ سرکار نظام کا پایہ مضمون نگاری میں ایسا بلند ہے اور اُن کے مضامین سے اوراقِ مخزن اتنی دفعہ عزت حاصل کر چکے ہیں۔ کہ اُنکے اس تازہ مضمون کو ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے ہمیں کسی لمبی تمہید کی ضرورت نہیں۔ یہ مضمون تاریخی اعتبار سے خاص دلچسپی رکھتا ہے اور یہ دلچسپی اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ حال ہی میں سکوں کے متعلق ایک مضمون شایع ہو چکا ہے۔ جو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس میں علاوہ نفس مضمون کی دلچسپی کے مشتاق مضمون نگار کی عبارت کی دلاویز طرز نے اعلیٰ درجہ کی خوبی پیدا کر دی ہے

دنیا میں وہ کون ہے جو ابیض نورانی کی ناز آفریں اداؤں کا دل سے والا و شیدا اُس کی قدر وقیمت سے واقف نہیں ہے لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اُس کی ابتدا اُس کی ترقی اور اُس کے حالت موجودہ پر اُن کی تاریخ سے واقف ہوں۔ جس طرح پر کہ سکہ کی ابتدا قدیم سلطنت لیڈیا میں جہان کے دولتمند بادشاہ قارون کا نام ابیض نورانی کے عشق کے لحاظ سے آج تک ضرب المثل ہے ہوئی اور پھر یونانیوں اور رومیوں میں بتدریج ترقی پا کر تمام عالم میں پھیل گیا اس پر بحث کرنا تو ایک طول امل ہے کیونکہ اس وقت ہم صرف اسلامی سکہ کی ابتدا پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں جبکہ جماعت انسانی کی ضرورتیں محدود ہوتی ہیں تبادلہ سے کام چل جاتا ہے لیکن جب ترقی تمدن کے ساتھ مختلف افراد کی ضرورتوں میں مختلف طور پر ترقی ہوتی ہے تو کسی ایسی

چیز کی ضرورت پیدا ہوتی ہے جو سب اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے ذریعہ تبادلہ بن سکے اور چونکہ ایسی شئے کے مقبول عام ہونے کے لئے علاوہ دوسری صفات کے ضرور ہے کہ (۱) کمیاب ہو (۲) بدقت حاصل ہو سکتی ہو (۳) وزن کے اعتبار سے جسامت میں کم ہو (۴) بطور خود بھی اس کی [illegible] قیمت ہو (۵) سخت ہو اس وجہ سے قدیم سے دنیا نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا ہے کہ جیسی قابلیت [illegible] اور سونے میں ذریعہ تبادلہ بننے کی ہے ویسی کسی دوسری شئے میں نہیں ہے پس اسی [illegible] یہ قیمتی دھاتیں عام اشیاء کی خرید و فروخت میں استعمال ہونے لگیں لیکن جب تجربہ سے ثابت ہوا کہ حرص و طمع ایسی چیز ہے کہ انسان کو دغا و فریب کی طرف مائل کرتی ہے اور رفتہ رفتہ ان تک بھی اس کا سلسلہ پہونچا تو کسی ایسی معیار کی ضرورت داعی ہوئی جس سے آسانی [illegible] قلب میں تمیز ہو سکے اور چونکہ صنعت و حرفت اور تجارت و سلطنت سب کے کاروبار کے لئے کسی عام ذریعہ تبادلہ کی ضرورت تھی اس لئے سلطنت ہی نے اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیا اور ان دھاتوں کے مختلف ٹکڑوں کو اپنی خاص علامت ثبت منقوش کر کے جاری کیا تاکہ ہر شخص کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکے۔ یہی ابتدا سکہ کے چلن کی ہے۔ عرب میں قدیم زمانہ میں کوئی ملکی سکہ رائج نہ تھا بلکہ جس جس حصہ ملک پر جس سلطنت کا اثر تھا یا تجارتی تعلقات تھے اوسی کا سکہ وہاں رائج تھا۔ جنوبی عرب میں جہاں قدیم سے یمنی تمدن پھیلا ہوا تھا حمیری سکے رائج تھے اور وسط عرب میں جو سلطنت ایران سے متاثر تھا ساسانی سکوں کا رواج تھا اور شمال میں جہاں رومی سلطنت کا سایہ پڑا تھا رومی درہم و دینار عام طور پر مروج تھے جب ہمارے ہادی برحق نے جزیرہ نمائے عرب میں کلمۃ الحق کا اعلان کر کے اسلام کی تبلیغ کی تو جس زمانہ تک کہ اسلام کے بیرونی تعلقات قائم نہ ہوئے تھے وہی قدیم سکے رائج رہے لیکن جب نور اسلام نے دوسرے ممالک کو روشن کیا اور جب یہ تمدنی ضرورتوں اور تجارتی وسعت کے لحاظ سے پردیسی سکوں کی تعداد جو قدیم زمانہ میں اہل عرب کی محدود ضرورتوں کے لئے کافی تھی ناکافی ثابت

ہوئی تو جس طرح پر کہ دوسرے مفید انتظامات کی بنیاد امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک زمانہ میں پڑی تھی اوسطرح سکہ کو بھی پہلی دفعہ ممالک اسلامیہ میں ضرب ہونے کی عزت اُسی متبرک عہد میں ۱۸ھ میں حاصل ہوئی لیکن چونکہ طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جن اشیاء سے مانوس ہوجاتی ہے اُس کو بہت ہی مشکل سے ترک کرتی ہے اور گو سمجھدار لوگ علم و عمل کے رو سے خاصہ طبیعت کو روک بھی لیتے ہیں مگر جاہل و نادان لوگ تو اُس کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ سکہ ایسی چیز ہے جس کو جاہلوں اور عالموں دونوں بلکہ جاہلوں سے بیشتر اور عالموں سے کمتر سابقہ پڑتا ہے اس لئے اُس کا بدلنا کچھ آسان کام نہیں ہے اور اگر ایسا قصد بھی کرتے ہیں تو بہت ہی بتدریج اور آہستہ آہستہ حصول مرام کی طرف قدم بڑھاتے ہیں - اس کے علاوہ یہ بھی بڑی دقت تھی کہ صرف مسلمانوں ہی میں لین دین محدود نہ تھا بلکہ تجارتی کاروبار کی ضرورتوں نے دوسری قوموں سے تعلقات قائم رکھنے پر بھی مجبور کیا تھا - اور اس لئے خالص اسلامی سکہ کی اجراء کے لئے استحکام سلطنت مقدم تھا - یہی وجہ تھی کہ ابتداء میں سکہ جب ضرب کیا گیا ہے تو نہ اس کا نام یا وزن بدلا گیا اور نہ صورت و ہیئت چنانچہ جو سکے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مضروب ہوئے تھے وہ درہم و دینار و فلوس ہی کہلاتے تھے اور بعد میں بھی یہی نام مروج رہے حالانکہ لفظ دینار رومی لفظ دیناریس اوریس (Dinarius) اور درہم Drachma لفظ دریکم اور فلس لفظ فالس (Folis) سے نکلا ہے اور اسیطرح ہیئت کے اعتبار سے رومی اور ایرانی ٹھپہ قائم رکھے گئے صرف اونپر نام یا کوئی برکت کا کلمہ عربی زبان کا بڑھا دیا گیا تھا حضرت عمرؓ کے زمانہ کا کوئی سکہ ہماری نظر سے نہیں گذرا لیکن ایڈورڈ ٹامس نے جن ساسانی سکوں کی تصویریں دی ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں نام بھی عربی زبان میں نہیں لکھتے تھے بلکہ بنانے والے اور دارالضرب کا نام بھی وہی

زبان میں لکھا جاتا تھا اور اوسپر ایک طرف خسرو پرویز کی مورت اور دوسری طرف آتش کی قربان گاہ اور دو مؤبدوں کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ اس قسم کے سکے زیاد ابن امیہ کے زمانہ کے پائے جاتے ہیں جبکہ وہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے بصرہ کا گورنر تھا۔ اس کے بعد جب عبداللہ ابن زبیر کا زمانہ آیا تو انہوں نے اس وجہ سے کہ اکثر مختلف قیمتوں اور عیار کے سکہ رائج تھے اور ان کی وجہ سے عام طور پر کاروبار میں نہایت خرابی پڑتی تھی اس طرف توجہ فرمائی اور اون کے بھائی مصعب ابن زبیر کے حکم سے حارث ابن عبداللہ ابن ربیعہ المخزومی نے سنہ ھ میں سکے بنانے شروع کئے مگر یہ سکے بھی بالکل ایرانی وضع کے تھے صرف اتنا فرق تھا کہ ایک طرف الفاظ "برکت اللہ" اور دوسری طرف "اللہ" اور بڑھا دئے جاتے تھے۔ لیکن چونکہ عبداللہ ابن زبیر کا زمانہ خلافت محض چند روزہ تھا اور یوسف بن حجاج کے ظالم مگر قومی ہاتھوں نے بہت ہی جلد اس کا خاتمہ کر دیا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ کے سکے زیادہ عرصہ تک مروج نہیں رہے۔ ابتدا میں ایرانی طرز کے سکوں کے مضروب ہونے کی یہ وجہ بھی کہ دارالضرب قسطنطنیہ تو جاری تھی اس لئے ممالک شام وغیرہ میں سکوں کی کمی ہوتی تھی تو وہاں سے پوری ہو جاتی تھی مگر برخلاف اس کے دارالضرب ایران ساسانیوں کی تباہی کی وجہ سے بند ہوگئی تھی اور اس لئے وہاں سلطنت اسلامیہ ہی کو جدید سکے بنانے پڑے۔ غرضیکہ عبداللہ بن زبیر کے زمانہ تک سکوں کی وہی قدیم شان قائم رہی لیکن جب خلیفہ عبدالملک بن مروان نے یوسف بن حجاج کی سختی اور تدبیر ملکی کی بدولت ممالک اسلامیہ کو اندرونی بغاوتوں اور قضیوں سے پاک کیا تو خلافت اسلامیہ کی سطوت و جلالت میں یہانتک ترقی ہوئی کہ اس نے قرابین کی پیشانی سے تثلیثی طغرا کو نکال کر توحیدی طغرا قائم کیا اسپر جسٹی نین Justinian II دوم قیصر روم نے رسم قدیم کے پھر اختیار کئے جانے سے مایوس ہو کر یہ دھمکی دی کہ میں اپنے سکہ میں نعوذ باللہ تمہارے

پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے نام کے ساتھ ایسے الفاظ منقوش کرادونگا جو تم کو نہایت ناگوار گذرینگے اور چونکہ ہمارا سکہ عالمگیر ہے اس لئے ساری دنیائے اسلام میں بآسانی پھیل جائیگا یا یہ ہو جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ قیصر روم نے ان خطوط کی پیشانی پر جو اُس کے پاس خلیفہ اسلام کے یہاں سے آئے تھے قل ہو اللہ احد اور آنحضرت صلعم کا نام نامی دیکھکر پیچ وتاب کھایا اور ایسی دھمکی دی ۔معلوم ہوتا ہے کہ جب سلطنت بنی امیہ دمشق میں قایم ہوئی تو انہوں نے رومیوں کے تثلیثی طغرا و طراز کو محض علامات حکومت و سلطنت سمجھکر اختیار کر لیا اور گو بعد میں اوس کے معنی سمجھ بھی گئے لیکن چونکہ اندرونی بغاوتوں اور آئے دن کے فسادوں کی وجہ سے اتنی قوت نہ تھی کہ رومی غیظ وغضب کا مقابلہ کر سکتے اس لئے اونہوں نے اُنکو نہیں بدلا لیکن جب عبدالملک کے زمانہ میں سلطنت کی بنیاد قوی ہوئی تو اُس نے پہلے ہی موقع پر اس غلط طریقہ کو بدلدیا جو قیصر روم کو نہایت ناگوار گذرا لیکن چونکہ اُس کی رعایا کی منصفانہ بغاوت نے جیسا کہ گبن نے لکھا ہے جلد اُس کا خاتمہ کر دیا اس لیے اُس سے کوئی بدنتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ اگر قیصر روم دھمکی نہ بھی دیتا تو تمدنی ضرورتیں خود اس امر پر مجبور کرتیں کہ ممالک اسلامیہ میں سکہ بنایا جائے اور کثرت سے بنایا جائے کیونکہ اس زمانہ میں ممالک محروسہ کے حدود ایک طرف تو سرحد چین سے ملے ہوئے تھے اور دوسری طرف خلیج بسکے سے ٹکر کھاتے تھے پس گویا قیصر روم کا دھمکی دینا باروت میں شتابہ ہو گیا اور عبدالملک بن مروان نے خالد بن یزید بن معاویہ کے صلاح و مشورہ سے جنکو بوجہ علم و فضل اور دانش و فرہنگ کے حکیم بنی امیہ کا معزز خطاب دیا گیا ہے ۷۶ھ ہجری میں اسلامی سکہ بنانا شروع کیا۔ مختلف تاریخوں کے دیکھنے سے ایک عجیب اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ۷۵ھ میں سکہ

۱؎ حیات الحیوان روایت خلیفہ ہرون الرشید۔

ضرب ہوا اور اکثر کا اس پر اتفاق ہے جیسا کہ ہم نے بھی لکھا ہے کہ سنہ ۷۶ھ میں سکہ کا رواج ہوا لیکن اگر خود سکون کو علامہ مقریزی کی بیان سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جو سکہ عبدالملک نے بنوایا تھا اُس میں بڑی حد تک رومی شان قایم رکھی گئی تھی یعنی اس میں عبدالملک نے خود اپنی تصویر بنوائی تھی جسکی کمر سے تلوار لٹکتی تھی اب ہم چند قدیمی سکون کی تفصیل بتاتے ہیں۔

(۱) طرف اول۔ رومی طرز کی مورت سر پر تاج اس پر صلیب سیدھے ہاتھ میں ایک کرہ اُسپر صلیب اور اس کے داہنی طرف لفظ "حمص" عربی خط میں اور بائیں طرف یونانی لفظ (Kaών) عمدہ۔

طرف ثانی۔ حرف (M) اوسپر ایک ستارہ اور دو دائرہ اور حاشیہ پر یونانی لفظ (Imeche) اور اُس کے نیچے عربی لفظ "طیب"۔

(۲) طرف اول۔ رومی طرز کی مورت جسم سیدھا ہاتھ اوپر کو اوٹھا ہوا برچھا لئے ہوئے دوسرے ہاتھ میں ایک کرہ جس پر صلیب چڑھی ہوئی بائیں طرف "بسم اللہ" سیدھی طرف ۵۸ ن

طرف ثانی۔ (M) اس پر صلیب حاشیہ میں (Imeche) اُس کے نیچے طیب۔

(۳) طرف اول۔ دو قد آدم مورتیں ہر ایک کے ہاتھ میں عصائے شاہی جس پر صلیب لگی ہوئی اور ان مورتوں کے بیچ میں "محمد رسول اللہ" اور حاشیہ پر "لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ"۔

(۴) طرف اول۔ قد آدم مورت بال بڑے بڑے اور ایک طرف کمر سے تلوار لٹکتی ہوئی حاشیہ پر "محمد رسول اللہ"۔

طرف ثانی (M) حاشیہ پر "ایلیا فلسطین"۔

(۵) طرف اوّل - مورت نصف جسم چہرہ سامنے اور بال لمبے حاشیہ پر "لا الہ الا اللہ"۔
طرف ثانی مٹا ہوا۔

(۶) طرف اوّل - کھڑی مورت چوغہ پہنے ہوئے ہاتھ سینہ تک اٹھا ہوا اس ہاتھ میں تلوار کا غلاف جو کمر سے لٹکتی ہے اور حاشیہ پر خط کوفی میں "بعبداللہ عبدالملک امیر المومنین" لکھا ہوا۔
طرف ثانی - ایک صلیب جس کا سرا چار سیڑھیوں پر قایم ہے اس کے سیدھی طرف "بقنسرین" اور اولٹی طرف "واف" حاشیہ پر "لا الہ الا اللہ وحدہ محمد رسول اللہ"۔

(۷) دینار طلائی - طرف اوّل وسط میں "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" حاشیہ پر "محمد رسول اللہ ارسلہ بالہدی ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ"
طرف ثانی - وسط میں "اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد" حاشیہ پر "بسم اللہ ضرب ہذا الدینار فی سنہ سبع و سبعین"۔

(۸) درہم نقرئی - طرف اول - وسط میں "لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ" حاشیہ پر "بسم اللہ ضرب ہذا الدرہم فی سنہ تسع و سبعین" اور حاشیہ پر پانچ علامات وقف (۵) طرف ثانی - اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احدٌ" حاشیہ پر "محمد رسول اللہ ارسلہ بالہدی ودین الحق لیظہرہ علے الدین کلہ ولو کرہ المشرکون"

ان سکوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمبر (۴ و ۶) کے غالباً وہی سکے ہیں جنکے ابتدا میں ضرب کیے جانے کا علامہ مقریزی نے ذکر کیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مورخوں کے جو بیانات در بارہ تقدیم و تاخیر ہیں اُن میں دراصل کوئی اختلاف نہیں ہے - کیونکہ رومی طرز کا سکہ پہلے سے ضرب ہوتا تھا مگر خاص عربی عبارت کا سکہ سنہ ۷۶ھ میں ضرب ہوا - اگر دوسرے پہلو سے ان سکوں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے

تو معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہمنے پہلے بیان کیا ہے کہ کسقدر آہستہ آہستہ خالص اسلامی سکہ کی ترویج کے لئے راستہ صاف کیا گیا ہے۔ سکہ نمبر (۱) میں تو کوئی تصرف سوائے اس کے نہیں کیا گیا کہ کوفی خط میں لفظ "جص" لکھدیا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ سکہ ممالک اسلامیہ میں مضروب ہوا ہے اور دوسری طرف اس خیال سے کہ لوگ اس کو جدید سمجھکر کہیں برا یا جعلی نہ سمجھیں لفظ "طیب" منقوش کر دیا گیا۔ دوسرے سکہ میں رومی و عیسائی علامتوں کو قایم رکھکر بسم اللہ کو داخل کر دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف رفع شک کے لئے پھر لفظ طیب لکھا گیا ہے۔ تیسرے سکہ میں رومی و عیسائی علامتوں کو قایم رکھکر ساتھ کے ساتھ اپنی مذہبی اعتقاد کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے اور ایک طرف دو صلیبوں کے مابین "محمد رسول اللہ" اور دونوں طرف حاشیہ پر "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" لکھدیا گیا۔ تثلیث و توحید کا یہ عجیب اتحاد ہے اور اس سکہ پر "طیب" کے لفظ کے نہ ہونے سے پایا جاتا ہے کہ اب لوگ اسلامی سکہ سے مانوس ہو چلے تھے۔ چوتھے سکے سے اور بھی ترقی ظاہر ہوتی ہے کہ علامت صلیب غیر موجود ہے اور پانچویں سکے میں تو خالص وحدانیت کا اظہار ہے گو کہ ایک مورت بھی موجود ہے۔ چھٹے سکے میں پوری طرح پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ سکہ خلیفہ اسلام کا ضرب کیا ہوا ہے۔ مگر اُس کے ساتھ بنظر احتیاط علامت صلیب کو قایم رکھا ہے گو کہ اس کی شکل ایسی بدل دی ہے کہ چاہو تو اُسے کچھ اور سمجھ لو اور رفع شک کے لئے لفظ "واف" بھی لکھدیا ہے یہ چھ سکے مسی ہیں۔ اور اس سے اور بھی اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح آہستہ آہستہ خلائق کو خالص اسلامی سکہ کی اجرا کے لئے تیار کیا گیا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ مسی سکہ ایک تو تعداد میں زیادہ ہوتا ہے دوسرے امیر و غریب سبھی کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ تیسرے اُس کی قیمت اس قدر کم ہوتی ہے کہ کسی کو شبہ ہو جائے تو بھی اُس کا چلن مشکل سے

رک سکتا ہے۔ جب عام طور پر ان ناقص اسلامی سکوں کو رواج ہو گیا اور ممالک متصلہ میں بھی وہ بے تکلف چلنے لگے اور ادھر مسلمانوں میں بھی خالص اسلامی سکہ پر تصویر ہونیسے ایک قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تو عبد الملک نے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے سنہ ھ میں خالد بن یزید کے مشورہ سے خالص اسلامی سکہ جاری کیا۔ اس سکہ میں وہی عبارت تھی جو سکہ نمبر (۷) میں ہے جو ایک سال بعد کا ہے۔ اسمیں تمام رومی وعیسوی علامات ترک کرکے صاف صاف لفظوں میں خدا کی وحدانیت اور رسول کے نبی برحق اور دین اسلام کے صراط مستقیم ہونے کا اعلان کیا گیا ہے اور عیسائیوں پر ظاہر کر دیا گیا ہے کہ ان کا دین باطل اور ہمارا حق ہے ان پر زور جملوں کے کندہ کرنے سے قیصر روم کا جواب دینا مقصود تھا اور شاید یہ پولیٹکل خیال بھی ہو کہ ایسے پر جوش فقرے لکھنے سے سکوں کے مروج ہونے میں مسلمانوں کے مذہبی جوش سے بھی مدد ملیگی لیکن میرے خیال میں اصلی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے ان پر جوش الفاظ سے تثلیث کے مقابلہ میں توحید کی خوبی اور عظمت کا اظہار ہو اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بے جان تصویروں سے فصیح الفاظ زیادہ موثر اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ جب یہ سکہ جاری ہوا تو اسپر سورہ اخلاص کے کندہ ہونے سے مسلمانوں میں پھر ایک جوش پیدا ہوا کہ سکہ ایک ایسی چیز ہے جو مطہر اور غیر مطہر سب کے ہاتھ میں جاتا ہے اس لئے اس پر ایسی متبرک سورۃ کا منقوش کرنا مناسب نہیں ہے لیکن چونکہ اس سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود تھا اس لئے اس قسم کی نکتہ چینیوں کی پرواہ نہیں کیگئی اور وہ چند روز میں خود بخود دب گئیں۔ سکہ نمبر (۸) کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خالص چاندی کا تھا اور چونکہ اس کا دور بڑا تھا اس لئے اسمیں چند الفاظ اور بھی بڑھا دئے گئے۔ ہر قسم کے سکوں کے نام آخر تک وہی رہے جو رومیوں میں قدیم سے

تھے - غرضیکہ ۱۲۸ھ تک سکہ کی یہی صورت رہی مگر سنہ مذکور میں اس قدر رہوئی کہ دارالضرب کا نام بھی لکھنے لگے ۱۲۸ھ میں ابو مسلم خراسانی داعی بنی نے اپنا سکہ جاری کیا اور اس میں اپنی دعوت کے اعلان کے لئے بعض عبارت کیا اس کی صورت یہ تھی +

رخ اول - وسط میں "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" اس کے گرد میں "لا اسئلکم راً الا المودۃ فی القربیٰ" اور حاشیہ پر "بسم اللہ ضرب بجی سنہ ثمان ین ومئۃ" +

رخ ثانی - وسط میں "اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد" حسب معمول "محمد رسول اللہ ارسلہ بالہدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ ون" مگر علامات وقف نہ تھیں +

پہلا سکہ ہے جو علاوہ خلفائے وقت کے کسی شخص نے چلانے کی جرأت ن اس باغی نے بھی اصلی عبارت کے بدلنے کا خیال نہیں کیا بلکہ فقط ایک بارت بڑھا دی جس سے اس کی پالیسی کا اظہار ہوتا تھا +

رچہ کوئی خاص ضرورت نہیں ہے لیکن غالباً اس امر کا بتانا دلچسپی سے خالی خلفائے بنی عباس میں پہلا درہم جو عبداللہ السفاح نے ۱۳۲ھ میں تخت کے بعد مضروب کرایا اس میں بھی بنی امیہ کے درہم سے کچھ زیادہ تغیر وتبدل ا گیا بلکہ تقریباً اس کو اسی حالت پر قائم رکھا البتہ وہ آیات قرآنی جنکے منقوش نے پر اہل تقویٰ کو اعتراض تھا خارج کر دی گئیں اس کی صورت یہ ہے +

رخ اول - وسط میں - "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" حاشیہ پر "بسم اللہ ضرب ہذا الدرہم سنہ اثنین وثلثین ومئۃ" -

رخ ثانی وسط میں "محمد رسول اللہ" +

حاشیہ پر "محمد رسول اللہ ارسلہ بالہدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون"
اسمیں منصور کے زمانہ میں اسقدر اور ترمیم ہوئی کہ طرف ثانی میں ولیعہد کا نام بھی اس طرح پر درج ہونے لگا +

"مما امر بہ المہدی محمد بن امیر المومنین"۔

اور مہدی کے زمانہ سے خلیفہ کا نام لکھا جانا شروع ہوا اور ہارون الرشید کے زمانہ میں یہ رواج عام ہو گیا کہ جس صوبہ کے دارالضرب میں سکہ مضروب ہوتا تھا وہاں کے والی کا نام بھی اُس پر منقوش کیا جاتا تھا چنانچہ ایسے اکثر درہم اور بعض دینار ہمارے ذخیرہ میں بھی موجود ہیں۔ اسلامی سکہ بنی عباس کے دور کے آخر تک تھوڑے اختلاف سے قریب قریب اُسی شکل پر رہا۔ چونکہ قدیم سے سکہ اور خطبہ علامت شاہی سمجھا جاتا رہا ہے اور مسلمانوں میں صدہا حکمراں خانداں ہوئے ہیں اس لئے اسلامی سکہ کا مضمون نہایت دلچسپ اور اُس سے تاریخ پر گہری روشنی پڑ سکتی ہے لیکن اُس کے لئے ایک ضخیم کتاب چاہئے +

چونکہ مجھکو کئی سال سے سکوں کے جمع کرنے کا خبط سا ہو گیا ہے اور اپنی حیثیت سے زیادہ روپیہ خرچ کر کے بہت سے سکے جمع کئے ہیں۔ اور اُس فن شریف میں کسی قدر مداخلت حاصل ہونے کے لئے سخت محنتیں بھی کیں ہیں۔ اس لئے اگر زمانے نے فرصت دی اور ناظرین نے اس مضمون کو پسند کیا تو کبھی کبھی کسی خاص خاندان کے سکوں کے حالات لکھے جایا کرینگے +

محمد عزیز مرزا

بڑائی

جب آپ بڑے آدمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو سوا لفظ گریٹ (بڑے) کے اور کوئی لفظ نہیں استعمال کر سکتے۔ عام طور پر بہت سے ہنروں سے ماہر ہونا یا انسانی کام کی کسی شاخ میں کمال حاصل کرنا اسی کا نام گریٹنس (بڑائی) نہیں ہے۔ بڑے بڑے ستارہ شناس۔ نجومی۔ مصور اور شاعر بھی گذرے ہیں مگر وہ بڑے لوگ نہیں کہے جا سکتے۔ بڑائی کامیابی یا غیر کامیابی دونوں سے حاصل ہو سکتی ہے ولیمؔ[1] بہ نسبت مارلبرو کی فتحیابیوں کے اپنے بھاگنے میں کہیں بڑا ہے۔ برخلاف اس کے سیزرس کی لگاتار کامیابیاں اس کی بڑائی پر سیاہی نہیں پھیر سکتیں۔ بڑائی کو افعال سے کوئی تعلق نہیں بلکہ دیسے ہی تعلق ہے +

---

[1] ولیم کو جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا تاہم اسے گریٹ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ شکست اٹھانے پر بھی ہمت نہ ہارا اور یورپ کے فائدہ کے لئے برابر لڑتا رہا اور بعد کو کامیاب ہوا۔ یہ تو غیر کامیابی کی مثال تھی اب رہی اس کی مثال کہ بڑائی کامیابی سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مارلبرو لڑائیاں برابر فتح کرتا رہا اور گریٹ یا بڑا کہلایا۔ مگر اس کی خودغرضی اور مکاری نے اس کی بڑائی میں دھبا لگا دیا۔ اس لئے ولیم اپنی غیر کامیابی کی حالت میں بہ نسبت مارلبرو کے کہ وہ کامیابی کی حالت میں تھا زیادہ گریٹ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف خودغرضی تھی اور دوسری طرف دلسوزی +

پھر یہ صفت گریٹنس[1] (بڑائی) کس چیز میں پائی جاتی ہے - یہ عادات و اطوار ارادوں اور قابلیتوں میں بھی نہیں دکھائی دیتے جبکہ پلہ برابر ہو - ہاں - ان صفتوں سے انسان خوش و خرم اور کامیاب رہیگا اور ہمیشہ اپنے کاموں کی تہہ کو خوب پہونچیگا - بڑائی اس کو بھی نہیں کہتے کہ انسان خطاؤں[2] سے بری ہو - اس امر کی تشفی کے لئے ہمیں قدیم زمانہ کے بڑے لوگوں کی فہرست دیکھنی چاہیے - بڑائی کے لئے قوت کی ضرورت ہے بھی نہیں بھی ہے - کامل طور پر ہمارے سمجھنے کے لئے یہ مثال کافی ہو سکتی ہے کہ بڑائی حقیقتاً ایک دریا[3] کا پاٹ ہے نہ کہ اُس کا تیز بہتا ہوا پانی - اس میں شک نہیں کہ قوت کا اثر جب طبیعت پر پڑتا ہے جس میں اوصاف بھی موجود ہوں جنکو ہم مختصر طور پر مہارت کہتے ہیں اور وہ عمدہ مقاصد کیطرف مائل کیجاتی ہے تو اُس وقت اُس کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا ہے اور جیسے بعض وقت ہم دھوکھے سے گریٹنس کہتے ہیں - اور کوئی شخص خاص کر کے اپنی ترقی کیجانب متوجہ ہے تو وہ اس حالت میں بہت سی مشکل گرہیں[4] کاٹ ڈالتا ہے اور اپنے طرز رفتار میں قوت

---

[1] مجھے اس لفظ کے ترجمہ کے لئے سوائے بڑائی کے اور کوئی جامع لفظ نہیں تھا + [2] یعنی یہ امر تاریخوں سے ظاہر ہے کہ بڑے بڑے لوگوں سے بھی خطائیں سرزد ہوئی ہیں + [3] دریا کو بڑا اسکا بڑا پاٹ ہونیکی وجہ سے کہتے ہیں نہ اُس کے رواں پانی کے سبب سے یعنی ہم انسان کو بڑا اسکی کشادہ دلی کے باعث کہینگے نہ کہ اُس کی قوت یا کاموں میں مہارت کے سبب سے + [4] انسان کو اپنی ترقی کا خیال ہوتا ہے تو اس راہ میں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھاتا ہے تاہم جی نہیں چھوڑتا اور اپنا کام بدستور کئے جاتا ہے مگر اسکے لئے ہم اسے گریٹ نہ کہینگے - اسی قسم کے صدمات اسوقت بھی جھیلنا پڑتے ہیں جب کسی قسم کا خیال انسان کے دل میں گذرتا ہے اور اس کا انجام دینا ضروری سمجھا جاتا ہے گو وہ خیال اچھا نہو تاہم ایسے شخص کو ہم بڑا نہ کہینگے - مثال - ایک متعصب شخص کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہر شخص میرا ہی مذہب اختیار کرے - اس سے اُسکی خود غرضی پائی جاتی ہے مگر اس ارادے کو پورا کرنے کے لئے اسے مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں جنکی وجہ سے اُس شخص کی وقعت ہماری آنکھوں میں زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر اسپر بھی ہم اُسکو بڑا نہ کہینگے +

اور تمیز صرف کرتا ہے اور یہ امر بظاہر عظیم الشان معلوم ہوتا ہے - یہی حال انسان کا اسوقت بھی ہوتا ہے جب کسی خاص قسم کا خیال اُس کے دل میں ہوتا ہے گو وہ خیال چھچھورا کیوں نہو اس میں شک نہیں کہ کامیابی زیادہ تر جب ہی ہوتی ہے جب انسان ایک بات کی کوشش کرتا ہے حالانکہ جو بڑے لوگ ہیں وہ مختلف ارادوں کیوجہ سے ناکام رہتے ہیں مگر اس سے انکی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا +

اگر بڑائی کو ہم صفتوں پہ محدود کریں تو یہ صفت جرأت[1] - کشادہ دلی اور ہمدردی میں پائی جائیگی - ان صفات کا اثر آغاز میں کچھ ایسا قوی نہ معلوم ہوگا - مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ ان تین صفتوں[2] ہونے کا کسقدر مادہ ہے - جو صاف باطن میں اول کی تعلیم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا - پھر جس شخص میں ہمدردی کا عنصر ہے وہ جس سے ملتا ہے اس کے دل میں کسی قدر راہ پیدا کرتا ہے یا اس کے شریک حال ہوتا - انکے تجربے حاصل کرتا اور خود آدمی بن جاتا ہے - ہمدردی تمام مشکلیں حل کر دیتی ہے - بغیر اس شئے کے کوئی چیز ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی - انسان کے فہم میں اختلاف اُسکی قوت ہمدردی کے اختلاف کیوجہ سے ہے جس میں جسقدر ہمدردی کا مادہ ہوگا اسیقدر وہ دوسروں کی ضرورتوں اور حاجتوں کو سمجھ سکیگا - ہمدردی دنیا میں ہرگز ایسی شئے ہے جو ہمدردی کی طرح خودغرضی کو دفع کرنے والی ہے - خود غرضی بیشک جرأت بیشک بڑی اور دلیرانہ جو نکلنا اور سچائی سے رک سکتی ہے - مگر اُس کی پوری روک تھام اُس وقت ہو سکتی ہے جب ہم اپنے کیں

---

[1] یعنی ہمارے جرأت کشادہ دلی اور ہمدردی بڑائی کی ظاہری علامتیں ہیں - کشادہ دلی کے اصلی معنی یہ ہیں کہ بزرگوں سے سبق لے اور اپنی اصلاح کرے +

[2] یعنی یہ خوبیاں ان صفات میں ترقی کرنے سے پیدا ہونگی یعنی جو لوگ ... سے ... ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نیک ... اور تجربے حاصل کرینگے ان کا فہم بڑھتا جائیگا -

ہمدردی کو بڑھنے دیں اور اُس کی نرم نرم شاخوں کو بیرونی چیزوں پر پھیلنے دیں +

ہمدردی گرمی[51] اور روشنی دونوں ہے - یہ گویا اتفاقی ہوا[52] ہے جو تمام جاندار چیزوں کو آپس میں وابستہ وگرویدہ کر دیتی ہے - لوگوں کے خیال تعلیم اور گفتگو میں جو اختلافات ہیں اُن سے تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ ہو کر یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کی طبیعتوں میں کسقدر اختلاف ہے - پچھلے فلاسفروں کو حیرت ہوتی تھی جب وہ خیال کرتے تھے کہ ہم نے ایک جدید چیز کی تحقیقات کی[53] مگر انسان کیا ہے - یہ بھی تو خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اور ایسی چیز ہے جسکی نظیر گذشتہ زمانہ میں نہ تھی - یہ خیال کیجئے کہ خلقت کا ایک تانتا لگا ہوا ہے جسمیں شہزادے بھی ہیں جو بڑے ناز و نعم میں پلے تھے - اور وہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں جو اجڑی بستیوں اور تنگ و تاریک خانوں کے رہنے والے تھے - اب ان سب کے پہچاننے کی کونسی صورت ہے - کون انہیں ہر شخص کے شناخت کا مادہ پیدا کر سکتا ہے - ہاں - وہی لوگ جو سب کے ساتھ عموماً گہری ہمدردی سے پیش آتے ہیں - بغیر بڑی ہمدردی کے کوئی آدمی بڑا نہیں ہو سکتا - جسطرح تماشہ گاہوں میں معمولی آدمیوں کے روپ

---

۵۱ - اس میں آفتاب کی طرح گرمی اور روشنی ہے یعنی دل میں گرمی محبت پیدا کرتی ہے اور کل انسان اور اشیا کو اچھی طرح دیکھتی ہے + ۵۲ - جس طرح ہوا کے ذریعہ سے ایک چیز کا اثر دوسری چیز پر پڑتا ہے - اسیطرح ہمدردی بھی اپنا اثر پھیلاتی ہے مثلاً اگر ہم کسی جگہ پر آگ جلائیں تو ہوا کے ذریعہ سے اُس کی روشنی دور دور کی چیزوں پر بھی پڑتی ہے - یہی حال ہمدردی کا ہے - اگر ہم میں اُس کا مادہ ہے تو ہم ضرور دوسرے کی ضرورتوں اور حاجتوں کو سمجھ جائینگے + ۵۳ - علم طبعیات کے ماہروں کو جب ایک نئی چیز کی تحقیقات پر حیرت ہوتی ہے تو لوگوں کو یہ سمجھ کر اور زیادہ حیرت ہونی چاہئے کہ ہر انسان اپنی علیحدہ طبیعت کی وجہ سے خدا کی ایک نئی مخلوق ہے +

ں بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کی شبیہیں پیش نظر ہوتی ہیں اور اسوقت
وہ داد ہوجاتی ہے اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ہمدردی کا مطلق مادہ
ہیں اور وہ دھوئیں اڑاتے ہیں۔ مگر ہم کو تجربے انہیں سے حاصل ہوتے ہیں جو
ہمدردی کرتے اور بڑی بڑی مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھاتے ہیں +

جرات کو اگر کشادہ دل کے ساتھ شریک کریں تو پھر ایک ایسا شخص پائنگے
جو اپنی غلطیوں کا آپ معترف ہوگا۔ دوسروں کی خطاؤں سے درگذر کریگا۔ اُن کے قول
و فعل پر اعتبار کریگا اور ہر کام میں اپنی جان لڑا دیگا۔ خلاصہ یہ کہ اُس کی سمجھ اور ہمدردی
اسے جو جو باتیں تعلیم کریگی وہ اُن کے موافق عمل کریگا +

قوموں کے گریٹ ہونے کے لئے بھی وہی صفتیں درکار ہیں جو انسان کے
گریٹ ہونے کے لئے۔ اسباب ظاہری کا زیادہ اثر جسطرح آدمیوں پر ہوتا ہے۔
اسیطرح قوموں پر بھی اور ان سے اُن کی شان آدمیوں سے زیادہ بڑھ جاتی ہے
مگر ہم اس خیال کے عادی ہوگئے ہیں کہ کوئی قوم گریٹ یا بڑی نہیں کہی جاسکتی
جبتک وہ دولت ملک و مال اور ضلع اطوار میں بھی گریٹ نہو۔ مگر دو قومیں جو اور
باتوں میں مساوی درجہ رکھتی ہوں اُنمیں اُسی کو ترجیح ہوگی جو جرات۔ کشادہ دلی
اور ہمدردی میں افضل ہو۔ پھر باعتبار گریٹنس۔ زمانہ کے مختلف دور کی متقابل
حالتوں کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں وہی معیار اختیار کرنا چاہیئے جو ہم آدمیوں کے
ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً۔ موجودہ اور گذشتہ زمانہ کا مقابلہ کریں تو پچھلے
زمانہ کی جو چیزیں ہمیں حیرت میں ڈالتی ہیں وہ انکا ظلم و تعصب ہے اور ایک
ایسا ظلم جو ستم ایجادوں پر خود پلٹ پڑتا تھا اور ایک ایسا تعصب کہ اگر کوئی بات
اُنکے نفع کے لئے کیجاتی تھی تو اُس کے بگاڑنے اور مٹنے کی کوشش کرتے تھے
اور اگر وہ اُس کی خوبیوں سے واقف ہوتے تو اپنی جہالت سے کھیل نہ بگاڑتے

بلکہ اُس کی ترقی کی فکریں کرتے اور اُسے فروغ دیتے ۔ بہت سی نصیحتیں اِن پر جوش انسانی معاملات کی نسبت کی گئیں مگر اکثر اُن کے شعلے اور بھڑکتے نظر آئے ناعاقبت اندیش ان نصائح کو ماننے کیا کہ اور سنکر آگ ہوجاتے تھے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی تحصیل کا زیادہ حصّہ ہمیشہ دوسروں کی ایذا رسانی میں صرف کیا کرتے تھے ۔ تم خیال کرتے ہوگے کہ پچھلے زمانہ میں لوگوں کے پاس کھانے کو بہت تھا ۔ وہ بے فکر اور خوش حال تھے ۔ غلہ بھی خوب پیدا ہوتا تھا اور سوا اِس کے اُن کو اور کوئی کام نہ تھا کہ لوگوں کو دُکھ دیں اور اذیتیں پہونچائیں مگر ایسا نہیں ۔ یہ خیال محض غلط ہے ۔ تمنے قحط اور مصیبتوں کا حال پڑھا ہے جن سے ظاہر ہے کہ یہ زمانہ اُس زمانہ کے کال اور تکلیفوں کی برابری نہیں کرتا ۔ تحریریں موجود ہیں کہ لاکھوں بے موت مارے گئے اور یہ اُنکے ظلم وستم کا ادنے کرشمہ تھا ۔ مثال کے لئے اُنکے طریقۂ انصاف اور طرز جفا کو خیال کرو بھلا اُن عقلاء کے تعصب کی کیا کیفیت ہوگی جو اُس زمانہ میں دانشمند مشہور تھے اور ستم روا رکھتے تھے ۔ وہ اپنے ہوش ہی میں نہ تھے ۔ اگر اِس قسم کے مظالم لوگ اُٹھاتے تو کیا کچھ نہ کہتے ۔ شاید اکثروں کی یہ خواہش ہو کہ سچی بات اور واقعی حالات دریافت کریں اسیوجہ سے یہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو ۔ گو مجھے اس امر کا خوف ہے کہ موجودہ زمانہ کا میں بڑا جنبہ دار سمجھا جاؤنگا مگر میں یہ ضرور کہونگا کہ یہی ایک خاص صفت گزشتیں ہے جسمیں ہماری قوم نے ترقی کی ہے ۔ ہم لوگوں میں ہمدردی اور کشادہ دلی زیادہ ہے ہم میں سے کچھ تو اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ اگر انسان کسی امر کے خلاف رائے زنی کرے تو اُسپر ناک بھوؤں نہ چڑہانا چاہیئے بلکہ اُسے نیک نیتی اور دل سوزی کی طرف محمول کرنا چاہیئے ۔ علاوہ اِس کے ہم لوگوں میں بہ نسبت اگلوں کے زیادہ

محمل ہے تو اس صفت سے بے بہرہ تھے - اب رہی جرأت یا ہمت جو گرمٹینس کا دوسرا جزو ہے - کیا ہم لوگوں نے اس میں ترقی کی ہے؟ - یہ بہت ہی مشکوک[1] سوال ہے اسباب خوف مختلف موقعوں پر کچھ ایسے مختلف ہوتے ہیں کہ اس امر کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کس قدر جرأت ان باتوں کے انسداد کے لئے ظاہر کرنی چاہئے لوگ آجکل عام خیالات سے اسطرح ڈرتے ہیں جس طرح اگلے زمانہ میں اسٹار چیمبر[2] سے ڈرا کرتے تھے - اور وہ ہولناک شبیہیں ہمارے حق میں ویسی ہی ہیں جیسی رفیڈیز[3] اہل یونان کے حق میں تھیں - اس لئے بہت دشوار ہے کہ اس زمانہ کی جرأت کا مقابلہ قدیم زمانہ کے جرأتوں کے ساتھ کیا جائے اور یہ آسان کام نہیں ہے کیونکہ اسکے لئے تفصیلی حالات کا جاننا ضرور ہے اور ساتھ ہی اسکے زیادہ سمجھ اور عقل کی ضرورت ہے - پھر اس کے مختلف نتائج بھی پیدا ہونگے اور

[1] مصنف کو اس مقام پر شک ہے کہ آیا اس کی قوم نے عقلی شجاعت (مارل کریج) میں بھی متقدمین سے زیادہ ترقی کی ہے کہ نہیں - یہ شک اسوجہ سے ہے کہ ہر زمانہ میں اس کی رفتار کے موافق جرأت سے کام لینا پڑتا ہے - جیسا جیسا موقع ہوتا ہے ویسی جرأت کا اظہار کیا جاتا ہے - اس خیال سے اس امر کا تصفیہ بہت محال ہے کہ کس زمانہ میں زیادہ جرأت سے کام لیا گیا + [2] عدالت ہزی چہارم جس کے کارروائیاں ظالمانہ تھیں +

مجھے "مارل کرج" کا عمدہ ترجمہ نہو سکا اس لئے عقلی شجاعت پر اکتفا کی - مترجم)

[3] مراد یہ ہے کہ اُس زمانہ میں لوگ اسٹار چیمبر اور اہل یونان اپنے دیوتاؤں (رفیڈیز) سے بھی اس قدر نہیں ڈرتے تھے جسقدر کہ ہم اب اپنے معترضین سے خوف کرتے ہیں مصنف نے از راہ طنز یہ فقرات لکھے ہیں +

ہر شخص کی رائے میں اختلاف ہوگا کیونکہ ممکن ہے رائے قایم کرنے والا پورے طور پر عقل سے کام نہ لے - مگر ہر حالت میں گرنٹس کی آزمایش کے لیے کشادہ دلی اور جرأت کا ہونا لازمی ہے تاکہ ایک سے خانۂ دل میں محبت اور ہمدردی کی جگہ پہلے اور دوسرے سے تمام خوف و ہراس دور ہوں اور وہ علم و عقل کی روشنی میں کام کرے اور اس کا ساتھ نہ چھوڑے -

سجاد عظیم آبادی

تاج و نشان معروف بہ تاج الملوک یہ کتاب جس میں قریباً تمام بڑے بڑے سلاطین گذشتہ و موجود کے تاج و نشانات کی تصاویر درج ہیں سید محمد رفیع صاحب عالی موہانی نے تالیف کرکے مطبع نیر اعظم میں چھپوائی ہے یہ کتاب اپنی قسم کی بالکل نئی کتاب ہے اور اس قسم کی کتابیں واقعی اردو زبان کے لیے سرمایۂ ناز ہیں کیونکہ ابھی اردو لٹریچر کے ذخیرے میں ایسی مفید اور قابل قدر کتب کی بہت کمی ہے - اس کتاب کے قابل مولف نے تاج و نشان کی اصل حقیقت خوب وضاحت کے ساتھ لکھی ہے تمام شاہان ایران و کیانیاں و غزنویان تیموریہ - قاچاریان و شاہان روم و روس و انگلستان و ہندوستان وغیرہ کے علاوہ اور دوسری سلطنتوں کے بادشاہوں کے تاج اور نشانات کی تصاویر بھی درج کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے بڑی جانفشانی اور محنت سے ماخذ بہم پہونچائے ہیں - یہ اس کتاب کو پڑھ کر البتہ اس قدر رازجوئی کا درد دل میں باقی رہ جاتی ہے کہ تاج و نشان قدیم کے ماخذ کہاں سے دستیاب ہوئے - اگر اس کا کہیں بھی ذکر آ جاتا تو کتاب بہمہ وجوہ اپنی قسم کی اعلیٰ اور نایاب کتاب کہلانے کی مستحق تھی - تاہم کتاب قابل دید ہے اور مولف کی محنت - تلاش اور ترتیب قابل داد +

یہ کتاب مطبع نیر اعظم مراد آباد سے ۸ر کو مل سکتی ہے +

تحائف زندگی

خواب

دل کے مضمون کے ساتھ منشی عبدالرحمن صاحب سہواروی نے ایک تصویر بھی اسی مضمون کے متعلق ارسال کی تھی۔ یہ تصویر چونکہ مضمون کی دلچسپی کو زیادہ بڑھاتی ہے اس لئے ہم اسے ضروری جزو سمجھ کر مقابل کے صفحہ پر چھاپتے ہیں۔

میں نے ایک بار ایک عورت کو سوتے دیکھا جو عالم رویا میں تھی اُس نے خواب میں دیکھا کہ زندگی ایک پری کی شکل میں اس کے سامنے آئی اور کہنے لگی کہ اے عورت دیکھ میں یہ دو تحفے تیرے واسطے لائی ہوں بائیں ہاتھ میں محبت ہے اور داہنے میں آزادی۔ مانگ کیا مانگتی ہے +

عورت نے بہت دیر تک تامل کیا اور پھر کہنے لگی آزادی یہ سنکر اُس پری نے کہا بیشک تو نے اچھا انتخاب کیا اگر تو نے محبت مانگی ہوتی تو میں نے تجھکو محبت ہی دی ہوتی مگر سن لے کہ پھر میں تجھے چھوڑ کر چلی جاتی اور کبھی واپس نہ آتی میں زندگی ہوں اب تو وہ دن بھی دیکھے گی کہ میں پھر تیرے پاس آؤنگی اور دونوں تحفے ایک ہاتھ میں لاؤں گی اور تجھے دوں گی +

میں نے دیکھا کہ عورت خواب میں ہنسی +

(ترجمہ)

عبدالرحمن ۔ سہواروی
از کوئٹہ



نواب اور کباب

ایام اکبر اور اورنگ زیب جبکہ آگرہ اور دہلی کے قصر اور ایوان عشق اور محبت کے گیتوں سے پرشور تھے اور انکا ہر در و دیوار رقاصوں کے قیمتی زیورات کی چھنکار کی صداؤں سے گونجتا تھا - ان ایام کی داستانوں کا جیسے کہ وہ عام گپ بازوں کی زبانی سننے میں آتی ہیں ایک حیرت خیز اور تعجب انگیز طومار ہے - پرانے ارباب نشاط جنکے باپ دادا مغلی درباروں میں ملازم تھے اکثر اوقات ان الوان نعمت کی تیاری کے عجیب و غریب طریقوں کے بیان سے رطب اللسان ہوتے ہیں جو عہد مغلیہ میں رائج تھے اور بڑے بڑے امیروں اور نوابوں کے گھروں میں دیکھے جاتے تھے اور انکے زیب دسترخوان تھے - ایک کہتا ہے کہ امیران مغلیہ گلاب کے نرم و نازک پھولوں کو گرم گرم روغن زرد میں بھگو کر چوستے تھے - ان کا بیان تھا کہ اس سے آواز میں شیرینی اور لوچ اور چہرہ کے رنگ روغن میں صفائی پیدا ہوتی ہے کہ دیکھنے والے اس حسن گلوسوز کے تاب نہ لاکر مارے عشق کے بیتاب ہوجاتے ہیں" +

اب تو نوابوں نے اُن سب عملیات پر پانی پھیر دیا ہے - مگر پلاؤ اور کباب تیار کرنے کے ایسے ایسے عجیب و غریب نسخے اب بھی مروج ہیں کہ فرانس کا مشاق سے مشاق خانساماں بھی اُن کے پورے اہتمام سے چکرا جائے اور اُن کے بے شمار مصالحے جنمیں اکثر تو نایاب ہیں جمع کرتے کرتے گھبرا جائے +

لذیذ کھانوں کا علم بھی جیسا کہ اور علوم کا حال ہے پہلے پہل ہندوستان قدیم میں پیدا ہوا اور ہندوؤں سے نکلا چنانچہ یجروید میں پلاؤ پکانے کی ترکیب موجود ہے " پل یعنے گوشت انا یعنے چاول کے ساتھ پلاؤ اور پانی اور نمک اور

مصالحے وغیرہ وغیرہ زیادہ کرو۔ یہی کہا نارادن او یو سے زید ا کے سامنے جس کا ذکر یادشاہ یودھشٹر کے نام سے مہابھارت کی۔ ہی مشہور آفاق کتاب میں آیا ہے۔ رکھا۔ مغلوں نے اُسے ترقی دی اور کمال عروج پر پہونچا کر موجودہ نسل کے ورثۂ مشترکہ میں چھوڑ گئے۔ چنانچہ پلاؤ "پال" گوشت اور اَن یا انا "چاول کا بدیہی مرکب ہے۔ مگر جو پلاؤ نواب صاحبان کے ہاں پکتا تھا وہ حد سے زیادہ مقوی ہوتا تھا اور اُس کا استعمال گاہے گاہے خطرناک بھی ہوجایا کرتا تھا۔ قریب ایک صدی کا مذکور ہے کہ ایک بنگالی نوجوان ایک نواب صاحب کے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ نواب صاحب کے باورچی خانے سے بڑے بڑے لطیف اور خوش ذائقہ کھانوں کی خوشبو اُڑ اُڑ کر بنگالی کے دماغ تک پہونچتی تھی اور اُس کے دل کو بے تاب کئے دیتی تھی یہاں تک کہ ایک روز اُسنے اپنی ذات اور مذہب کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اُس نے باورچی سے ڈھب لڑایا اور اُسے کچھ دے دلا کر خوش کیا۔ شام کے وقت پلاؤ تیار ہوا تو بنگالی بھی آگیا باورچی نے ایک رکابی لاکر اس کے سامنے رکھی اور اس میں ایک چاء کا چمچہ بھر پلاؤ ڈال دیا۔ نوجوان جل گیا اور کہنے لگا "بڑے میاں خان ساماں۔ میں تو تمہاری خاطر اپنی ذات بھرشٹ کرنے کو تیار ہونگا اور تم ایسے کنجوس بلکہ مکھی چوس ہو کہ مجھے اس چمچے پر ٹالتے ہو" باورچی نے جواب دیا کہ ماشاءاللہ میری طرف سے اور لیجئے مگر یاد رکھئے کہ پیچھے نہ کچھ کہنا اور اُسنے وہی ایک چمچہ بھر کرکے اور ڈالدیا بنگالی اس کے اسی بخل پر نہایت آشفتہ خاطر ہوا اور پلاؤ زہر مار کرنا شروع کیا۔ مگر افسوس اُس کا خیال تھا کہ میں ان چاولوں کو اس طرح نگل جاؤں گا جیسے کوئل کا بچہ ستو کا مالیدہ اُڑاتا ہے مگر وہ دانے ابھی آدھے بھی نہ ہوئے تھے کہ اسے تپ چڑھی اور کمرے میں نہایت اضطراب اور بیکلی کے عالم میں چلاتا ہوا دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ نہیں بالکل پاگل ہوگیا۔ اُس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں باہر آگئی تھیں

"اور یہ کلمہ ہائے میری ذات ہائے میرا مذہب" اُس کی زبان پر تھا یہانتک واویلا کرتا ہوا زمین پر چت گرا کہ اب مرا جب ہنتا ہے۔ باورچی نے مرکب ذیل اس کے کان میں ڈالا۔ "سُنو مرزو دسنو۔ نواب صاحب کی مرغیوں کو سانپوں کے بچوں کا قیمہ کرنا پڑتا ہے جب تو وہ ایسی موٹی اور تازی ہوتی ہیں۔ انکا پلاؤ بڑا اچھا ہوتا ہے مگر گرم سخت ہوتا ہے اور صرف نواب صاحب کا ہی معدہ اس کے ہضم کی تاب لاسکتا ہے۔ میں نے تمسے صاف صاف کہدیا تھا کہ پلاؤ کھانا کوئی کھیل نہیں مگر تمنے ایک نہ سنی۔ میں نے ایک چمچہ دیا۔ تم راضی نہوئے۔ اب مزا چکھا۔ لواب اپنے کئے کی سزا بھگتو" پھر گل یاسمن کا شربت اس کے حلقوم میں ٹپکایا جس سے وہ اٹھکر بیٹھ گیا۔ اور اپنے گھر کی راہ لی اور پھر کبھی نواب صاحب کے باورچی خانے کی طرف رخ نہ کیا +

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب واجد علی خان نے کھانے کھاتے پان کا ایک ٹکڑا کہیں فرش پر پھینک دیا ایک ہندو بھنگی نے دیکھ پایا اور نظر بچا کر اٹھا لیا اور منہ میں ڈال لیا۔ چند لحظے نہ گذرے تھے کہ سر چکرانے لگا اور زمین آسمان گھومتے دکھائی دینے لگے۔ اسے معلوم ہوا کہ میں بجائے فرش کے عرش پر ہوں اور ستاروں کی تعداد دو چند ہو گئی ہے۔ نظام عالم میں اتنا بڑا انقلاب ہوجانے اسکے سوا کوئی وجہ نہ تھی کہ پان کے اوپر تو ورق طلا لپٹا تھا مگر اندر چونا اور کتھا مروارید ناسفتہ یاقوت اور جواہرات سوختہ کا تھا جسمیں زعفران کشمیر۔ عنبر اشہب۔ مشک خالص اور افیون اور دیگر مبہیات اور مقویات پڑی تھیں +

ان دنوں کوئی نواب یا امیر کوئی ارزان اور کم قیمت چیز خواہ کیسی ہی مفید اور کارآمد ہو خرید نہ کرتا تھا اور نہ استعمال میں لاتا تھا۔ ایک دفعہ شاہ جہانگیر جب صدہا اقسام کے نشوں کے استعمال سے دق آگیا اور جان سے بیزار ہوا

دنیا کے سب نشے مثل نشۂ شراب -
ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

تو اس نے اپنے ایک خاص الخاص راز دار خدا بخش کو بلا کر کہا کہ کوئی ایسی چیز پیدا کرو کہ کھانے - پینے - یا کھینچنے سے کوئی نئی قسم کا سرور پیدا کرے - خدا بخش جو اول درجہ کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا ایک چیز چلم میں بھر کر لے آیا - بس کش لگانا تھا کہ مطلب دلی حاصل ہو گیا - پہلے نشہ ہوا پھر جنون پھر خبط اور دیوانگی اور اس کے بعد مستی اور بیہوشی اور خود فراموشی - جہانگیر بہت خوش ہوا اور سمجھا کہ ایسی عجیب و غریب چیز خدا جانے کتنے میں آئی ہوگی - ارشاد ہوا کہ خدا بخش کو یکصد مہر اکبر شاہی مرحمت ہو - خدا بخش جوش وفاداری میں پاؤں پر گر پڑا اور عرض کی کہ قبلہ عالم اس پر تو ایک سو مہر صرف نہیں ہوئی یہ تو ایک پیسہ کا مال ہے - پیسہ کا لفظ سنتے ہی شہنشاہ مغلیہ کا نشہ ہرن ہو گیا - اٹھ کر بیٹھ گیا اور غصہ سے آگ بگولہ ہو کر رعد کی طرح گرجا کہ او نابکار - پاجی تو ہمارے واسطے ایسی چیز لانیکی جرأت کرتا ہے جسکی قیمت صرف ایک پیسہ ہو - پھر دربانوں کی طرف مخاطب ہو کر اشارہ کیا کہ کتے سے کھلاؤ - بیچارہ خدا بخش کمر تک زمین میں گاڑا گیا اور ایک پل میں کتا اس پر چھوڑا گیا - یہاں یہ جتا دینا بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ کتے کو ایسے گیدڑوں کا گوشت کھلایا جاتا تھا جنکو سانپوں اور بچھوؤں نے ڈسا ہو - پھر اس کی تیزی اور تندی کا آپ خود ہی خیال فرما سکتے ہیں -

کباب یعنے بھونا گوشت پکانے میں کچھ بڑی کاریگری کی ضرورت نہیں اور وہ آپ نے انارکلی کے بازار میں بلکہ ہر جگہ بکثرت دیکھے ہونگے - مگر آگ پر رکھنے سے پہلے گوشت کی تیاری ایک بڑا اہم کام ہے اور میرے خیال میں کباب مغلیہ خوان نعمت کا بادشاہ ہے - کبابوں کی دو قسمیں ہیں - کباب سیخ - اور کوفتہ - ایک تیسری

قسم کا کباب بھی ہے (پسندہ) اور اس کے نام سے پرانی وضع کے لوگوں کے دانتوں میں ضرور پانی بھر آیا ہوگا - انکو دستی کباب کہتے ہیں - یہ تینوں قسمیں بڑی اعلےٰ ہیں - عہد فرخ سیر میں سیخی کباب صرف بکرے کے گوشت سے تیار ہوتے تھے - اُنکو بکری سے از حد محبت تھی اور اُس کی آواز سُنکر اُس کی روح تازہ ہو جاتی تھی - وہ بکری کا دودھ پیتا - اُسی کا گوشت کھاتا - چنانچہ ایک وقت آیا کہ اُس کی ٹھوڑی کے نیچے امریکہ کے بکرے کی سی لمبی داڑھی لٹک پڑی - وہ اسی کی کھال کی جوتی پہنتا بلکہ بکری کی محبت اس درجہ تک پہونچی - کہ وہ بُزخوار کا گوشت بھی (ایک پنجہ دار - باز اور عقاب کے قسم کا جانور ہے) نہایت مزے سے اُڑانے لگا - یہ جانور رات کے وقت بکری کا دودھ اور خون چوس لیتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی آواز اور اس کا گوشت بکری کی طرح بڑا لطیف اور لذیذ ہوتا ہے - فرخ سیر کے فرمان سے بڑے بڑے ریوڑ تیار ہوئے - یہ حیوان بصرہ کا گلاب کھاتا - غازی پور کا عرق گلاب پیتا - اور صبح شام اس عطر گلاب سے جو خاص خفا نیک سے اس غرض کے لیئے منگایا جاتا تھا نہلایا جاتا - ان کے گوشت سے جو کباب تیار ہوتے تھے اُن سے عطرِ گلاب کے خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں اور کوسوں تک لوگوں کے دماغ معطر ہو جاتے تھے - اُن کو گلابی کہتے تھے +

نواب اور بادشاہ اُدھے اوتار ہوتے تھے لہذا اُن کی نسبت ہم کو بہت سی لغو اور فضول حکایات پہونچتی رہی ہیں - ذیل کی نفیس باتیں جو مجھ سے ایک قابل قدر مولوی صاحب نے بیان کی ہیں اور جن سے نوابان ملک کے شاہانہ طبیعتوں کا کچھ ثبوت ملتا ہے اُمید ہے کہ خالی از دلچسپی نہونگی +

ان دنوں قیمتی اور ٹھوس اشیا کا استعمال کچھ کھانے پینے پر ہی موقوف نہ تھا - بلکہ آلات حرب اور گولہ بارود بلکہ لکھنے پڑھنے کی ضروریات میں بھی اس بڑائی اور موٹائی اور گاڑھاپن کا رواج عام تھا ایک فرمان پر دستخط کرتے وقت شہنشاہ اکبر نے محسوس

کیا کہ روشنائی کافی گاڑھی نہیں - اُس کا چہرہ غصّہ سے تمتمانے لگا اور سرخ ہو گیا اور حکم دیا کہ اسے تالاب میں گرا دو - دیکھتے دیکھتے تالاب کا پانی گہرا سیاہ ہو گیا - یہاں تک کہ ملک نے اپنی دواتیں اس سے بھرلیں اور دکانداروں نے بوتلوں میں بند کر کے ان کو سربمہر کیا اور یہ لیبل لگا دیا " اعلیٰ ترین کالی الماسی اکبری لکھنے کی روشنائی "+

ایک اور نواب کا ذکر ہے کہ اس نے دمشق سے تلوار منگائی - اس کی دھار نہایت ہی مہین تھی - نواب صاحب نے آزمائش کے لیے اُسے اپنے ایک غلام پر لگایا تلوار آبدار بجلی کی طرح کوند کر اس کے جسم میں سے تیر گئی مگر آدمی نہ مرا بلکہ حسب حال یہ شعر پڑھنے لگا ؎

وہ مول لیتے ہیں جب دم کوئی نئی تلوار
مجھی پہ پہلے لگاتے ہیں امتحاں کے لئے

مگر جوں ہی غلام نے چلنے کا ارادہ کیا اس کا اوپر کا آدھا دھڑ اُتر کر صاف اس کے قدموں پر گر پڑا +

مرشد قلی خان ایسا مغرور تھا کہ جب چلتا کبھی اپنی چھڑی کو اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا - ایک شخص نواب صاحب کے آگے آگے چلتا اس کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی - دوسرے خادم کے ہاتھ میں حقہ - اُسے حکم تھا پیچھا پیچھا چلے - تاکہ اس کے دھواں دھار لچھوں سے نواب صاحب کا مشام جان تازہ رہے جو پیچھے پیچھے ایک دو قدم خراماں خراماں تشریف لاتے تھے - تیسرا آدمی دور دور آگے چلتا اور ہاتھ مار مار کر مچھر اُڑاتا جاتا کہ کوئی بے تمیز دانہ حضور عالی کے شخص اقدس تک نہ پہونچ جائے - نواب کو اب سوائے چلنے کے اور کچھ کام نہ ہوتا اور وہ اب ربڑ کے کنگرو کی طرح آگے پیچھے پاہوں کو ہلاتے ہوئے لطف سیر اُٹھاتے اثنائے راہ میں کہیں کوئی گدھا نظر آجاتا تو حکم ہوتا کہ اسے مونڈو - خود تماشا دیکھنے کھڑے ہو جاتے - ہنستے جاتے اور اس شاہانہ مذاق کے لطف کو دوبالا کرتے زندہ

بھینسے کا پیٹ چاک کر کے اس کو سلوا دینا۔ تالاب میں روپیہ پھینکنا۔ طلائی مہروں کو ہوا میں اُچھالکر بندوق سے نشانہ کرنا اور گل چھرے اڑانا اور سر سے سم تک غریب گدھوں کا موذن ہوتے دیکھنا بعض بعض شاہان مغلیہ کے جنکے ہاتھ میں ہندوستان کے زمام اختیار رہتی نہایت دل پسند اور انوکھے مشغلے تھے +

کہتے ہیں کہ تاج محل کی بنیاد رکھنے سے پہلے شاہ جہان نے دریا کے کنارہ پر تمام کاریگروں کو جنکی تجویز سے موتیوں اور جواہرات سے پچی کاری کا کام ہونا قرار پایا تھا جمع کیا اور انکے روبرو دریا جمنہ میں مہروں کی تھیلیاں پھینکنی شروع کیں۔ بہت سے یہ تماشا دیکھکر ہکے بکے رہ گئے اور بے اختیار تعجب اور حیرت کے حروف زبان پر لانے لگے۔ شہنشاہ نے مونہہ پھیر لیا اور ان سب کو موقوف کر دیا کہ جو لوگ اس ذرا سے روپیے کے نقصان سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں انکی کوتل میں وہ قیمتی اور بیش بہا جواہرات نہیں دئے جا سکتے جن سے تاج جیسے نادر چیز کو مرصع اور مکمل ہونا ہے + نوابوں کی روح آسمان پر پرواز کرتی تھی۔ اس کا یہ حال تھا کہ ابھی اژدہوں اور پھنیر سانپوں کے زہر میں مست ہے تو ابھی گل گلاب اور یاسمن کے چمنوں کی ہوا کھا رہی ہے ایک وقت آتا کہ مغلوں کی آتشین روح خون افشان جنگ کا لطف اُٹھاتی ایک وقت ہوتا کہ وہ حرم سرا کے لطیف اور پیارے جلسوں کا حظ حاصل کرتی ان امیروں کی ناقابل تسخیر روح میں اب وہ وحشت نہیں رہی۔ سانپ اور بچھو باورچی خانے کے پاس تک نہیں پھٹکنے پاتے۔ رہے گلاب کے پھول سو اسکے مصنوعی پھول اکثر اب بھی کسی نہ کسی دیوالیئے نواب کے پاؤں میں ریشمی جوتیوں کے سر پر نظر آجاتے ہیں اور ان پھولوں پر عطر حسن کے چند قطرے چھڑکے ہوتے ہیں کہ آپ کا مشام جان تازہ رہے +

مہتوس

کلانور

کلانور ضلع گورداسپور (پنجاب) میں ایک قصبہ ہے۔ فی زمانہ اپنی بساط اور وسعت کے لحاظ سے اس قابل نہیں کہ ہندوستان کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاوے اور نہ اس کو ہندوستان کے مشہور شہروں کی سی شہرت حاصل ہوئی کہ جس کے باعث سے یادگار زمانہ ہو مگر تاہم اکبر اعظم جیسے شہنشاہ ہنر کے تخت گاہ ہونیکا جو فخر اس کو حاصل ہے وہ بھی کچھ کم نہیں اور ہمیشہ تاریخ ہند میں یہ تذکرہ تخت نشینی اکبر اعظم کلانور کا ذکر بھی ہوتا رہیگا +

اکبر اعظم کو اپنے والد ماجد کے انتقال پُر ملال کی خبر وحشت اثر کلانور ہی میں پہونچی مصلحت وقت اور ارکان دولت و اعیان سلطنت کے مشورہ سے کلانور ہی میں اکبر اعظم نے تاج شاہی زیب سر کیا اور تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ چبوترہ جس کو خاص طور پر تخت گاہِ اکبر ہونیکا فخر حاصل ہے اور جو خاص اسی واسطے تعمیر ہوا تھا اگرچہ زمانے کی دست درازیوں سے جاں بلب اور اس کی نیرنگیوں کے نظارہ سے ششدر ہے اور اسی کی بدولت اپنی جوانی کی آب و تاب کھوچکا ہے مگر تاہم اکبر اعظم کی تخت نشینی کی ایک باقیماندہ یادگار ہے اور چشم بصیرت کی دانۂ اشک کی تسبیح کے ایک دور کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ اکبر وہ جگہ جہاں پرندہ پر نہ مار سکتا تھا عام و خاص بلا اجازت جا نہ سکتے تھے جہاں نظریں بھی جاتی ہچکچاتی تھیں جہاں ہر وقت مجمع کثیر و جم غفیر رہتا تھا اب ویران و سنسان ہے وہ جگہ جسکا کثرت انبوہ مرداں سے دم گھٹتا تھا آج ذی نفس کی صورت دیکھنے کو ترس رہی ہے سچ ہے ع آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد۔ بادشاہی شان و شوکت دبدبۂ حشمت زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہوچکے۔

ہیں اور بجائے ان کے بیکسی ۔ حسرت ۔ یاس اور افسوس زبان حال سے گویا ہیں۔

ایک وضع پر نہیں زمانے کا حال یہ آہ
معلوم ہوگیا ہے ہمیں لیل و نہار سے

جہاں کسی زمانے میں لوگ شاہی ہیبت کے سبب نہ جا سکتے تھے اب وحشی جانوروں کی خوفناک ہیئت ان کی سد راہ ہے۔ جس زمانے میں اکبر تخت نشین ہوا ہے کلانور کا بھی عہد شباب تھا چند مقبرے ٹوٹی پھوٹی شہر پناہ اور اس کے دروازے پرانی عمارتوں کے کھنڈرات اس کے زمانہ عروج کی یادگار رہیں۔ مغلیہ سلطنت کے ساتھ ہی اس کا بھی زوال شروع ہوا اور ایک وفادار خدمتگار کی طرح اس کے ناپید ہوتے ہی یہ بھی گمنام ہوگیا۔ اسوقت بھی اگرچہ بلحاظ آبادی ایک قصبہ ہے مگر بلحاظ وسعت ایک شہر ہے۔ اس کا ایک زمانہ وہ تھا کہ بوجہ گنجائش نہ ہونے کے لوگ شہر کے باہر قیام کرتے تھے اور ایک وقت یہ ہے کہ اس کے بہت سے مکانات مکینوں کے انتظار میں استادہ ہیں اور بہت سے مکانات جنکی مدت انتظار ایک حد کو پہونچ گئی ہے شب ہجر میں عاشق کے مانند حالت اضطراب اور بے چینی میں گر کر برابر ہو چکے ہیں +

اس قصبہ کے گرداگرد ایک چھوٹا سا دریا جسکو کرن کہتے ہیں نرالی طرز ادا سے بہتا ہے۔ اگرچہ بظاہر دریا کی لمبائی چوڑائی کچھ بھی نہیں مگر وہ راہ جو اس نے اختیار کی ہے ایسی ٹیڑھی ترچھی ہے کہ اس کے کنارے کنارے ذرا سی دیر چلنے سے آدمی تھک جاتا ہے۔ اس کی وضع قطع کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سفید اژدہا بل کھاتا ہوا اپنے آپ کو چھپاتا ہوا کسی صید کی تلاش میں جا رہا ہے یا زمانہ کی دست درازیوں سے تنگ آکر بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد مایوسانہ حالت میں تڑپ رہا ہے۔ دریا کے کنارے کنارے پرانے زمانہ کے کھنڈرات دور تک چلے گئے ہیں اور چشم بصیرت کیلئے

ایک عجیب و غریب نظارہ ہے۔ ایسے منظروں کو دیکھکر سوائے اس کے کہ آدمی یاس کی کشتی میں بیٹھ کر خیالات کے دریائے ناپیداکنار میں روانہ ہو اور کچھ نہیں سوجھتا اور سوائے اس کے کہ حیرت سے زمانہ کی نیرنگیوں پر غور کرنا شروع کرے اور کچھ بن نہیں آتا +

ایک عرصہ کے بعد انگریزی سلطنت کی بدولت پھر اس شہر کا ستارا چمکا ہے صنعت و حرفت کا چرچا ہو گیا ہے اور تعلیم کا شوق بھی یہاں کے باشندوں کے دامنگیر ہوا ہے۔ یہاں کی مستورات بھی علم کی طرف راغب ہیں +

سید ارشاد علی

جب تک کہ ہنر نہ ہو بشر میں — ہوتی نہیں قدر کچھ بشر کی
تا ہو نہ ہنر شناس کوئی — کھلتی نہیں شان کچھ ہنر کی

خدا نے نیک دل پیدا کیا ہے جسکے سینے میں — کسی حالت میں ہو عاجز نوازی اسکی طینت ہے
قدر اندازسے صید زبوں محفوظ رہتا ہے — نشانہ مارکر صید افگنی گو اسکی عادت ہے
نہیں ہے کاٹتی ریشم کو کوئی تیغ بُرّندہ — ادہر تیزی ہے جتنی اُس طرف اتنی لچک ہے
ہوا جھکڑ کی چلتی ہے زمانے میں تو چلنے دو — جو سبزہ سرفگندہ ہے تو کب اُس کو اذیت ہے
تناور جو شجر ہیں آگئے ٹوٹی اکڑ ان کی۔ — کبھی گرنے پہ آفت ہے کبھی جڑ پر مصیبت ہے
جو مسکیں سے اکڑتا ہے وہ صاحب حوصلہ کب ہے — جو مارا شیر نے چوہا تو کیا وصفِ شجاعت ہے
نتیجہ تم کو اے ارشد بتا دیں ہم ستمگر کا۔ — غریب آزار پر اللہ اور بندوں کی لعنت ہے

(ارشد)

کہاوت

جس طرح کسی ملک کی پرانی عمارتوں ۔ کھنڈرات ۔ سے اُس ملک کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے اس طرح ایک ملک یا ایک قوم کے قصّے کہانیوں ۔ نظم و نثر اور ضرب الامثال یا کہاوتوں سے سوشل اور اخلاقی حالتوں یا کیفیات کا علم حاصل ہوتا ہے +

جیسے ماہران آثار صنادید پرانی تصویروں ۔ اصنام ۔ نقشوں سے گذشتہ قوموں کے معادی اور معاشرتی امور کا استدلال کرتے ہیں ایسے ہی قصص ۔ ملفوظات سے ایک ملک یا ایک قوم کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے کوئی قوم اور کسی قوم کی زبان خیالات کے تموّج اور ذخیرۂ ملفوظات سے خالی نہیں ہے +

جو قومیں علمی ذخائر کے اعتبار سے سرسبز و زندہ اور شائستہ ہیں جنکی قومی زبانیں قواعد و ضوابط مرتبہ کی وجہ سے شستہ اور فصیح و بلیغ شمار ہوتی ہیں اُن میں ہر ایک قسم کے ملفوظات کو ایک ترتیب سے دکھایا گیا ہے اور اُن کو ہر ایک فن کے متعلقات کے لحاظ سے ایک علمی سرمایہ سمجھا جاتا ہے لیکن جن ملکوں یا جن قوموں کی زبانیں ابھی پوبیدہ اور پریشان حالت میں ہیں اُن کی وہ باتیں یا وہ ملفوظات جنھیں علمی سرمایہ ہونے کا حق حاصل ہے اور جو سوشل اور اخلاقی ضرورتوں کا جزو اعظم شمار ہو سکتی ہیں اُسی طرح کس مپرسی کی حالت میں ہیں کہ جیسے اُن کی زبان ایک شائستہ گھر میں اگر چند معمولی چیزیں بھی شائستگی سے رکھی ہوں تو بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن ایک ناشائستہ گھر میں چند اچھی اور قیمتی چیزوں کا بے ترتیبی سے پایا جانا نظروں میں خوبی پیدا نہیں کر سکتا +

جب کسی زبان میں علمی مضامین کا ذخیرہ جمع ہونا شروع ہوتا ہے تو اُس وقت اگرچہ دیگر زبانوں سے بھی بہت کچھ مدد لی جاتی ہے لیکن اپنے ذخیروں میں سے بھی بہت کچھ لینا پڑتا ہے تاوقتیکہ قوم کو اپنی قومی زبان کے شائستہ اور وسیع بنانے کی فکر نہ ہو اُس وقت تک اُن علمی مضامین اور ملفوظات پر عبور نہیں ہوتا +

جیسے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کی تاریخی حالت جداگانہ ہے ایسے ہی ہر ایک قوم کے سوشل یا اخلاقی مضامین کا طرزِ استدلال یا طرزِ بیان جداگانہ ہے۔ کسی زبان میں علمی یا اخلاقی مضامین کا ذخیرہ صرف فلاسفروں یا عالموں کی کوششوں اور محنتوں کا ہی نتیجہ نہیں ہوتا یا یوں کہو کہ تمام علمی یا اخلاقی اور معاشرتی مضامین محض فلاسفروں اور حکیموں کی ہی جدت طبع کا اثر نہیں ہیں ان میں بہت کچھ ادنیٰ طبائع کی کمائی اور اُن اذہان کا اندوختہ بھی ہے کہ جنہیں دنیا جاہل اور وحشی لکھتی ہے +

صرف فرق اتنا ہے کہ اہل علم جاہلوں کے تجربوں۔خیالات کو ایک ضابطہ اور ایک ترتیب کی صورت میں لاکر پیش کر دیتے ہیں اور جاہل ایسا نہیں کر سکتے۔ایک جاہل جو علم عروض و قوافی سے ناواقف ہے شاعر ہو سکتا ہے یعنی اپنے خیالات کو شاعر کی حیثیت سے ایک بدصورت حالت میں پیش کر سکتا ہے گو اس میں بندش کی خوبی۔تلازمات کی پابندی اور سلاستِ بیان نہ ہوگی مگر خیال کا اظہار ضرور ہو جاوے گا +

ایک منطقی ایک واقعہ کو بہ شروط کلیہ و جزیہ و قضایا کے موجب بیان کرتا ہے اور اُس کو ایک علمی طریقہ سمجھا جاتا ہے لیکن اسی واقعہ کو جب ایک جاہل بلا شروط منطقیہ بیان کرتا ہے۔تو اُس کو علمی دائرہ سے خارج رکھتے ہیں تا بت ہوا

کہ علمی مضامین کا جزو اعظم ایک ترتیب اور انضباطِ دلائل ہے۔

خیالات کا اظہار۔ نقوش۔ اشارات۔ تصاویر۔ حروف۔ الفاظ۔ نثر۔ نظم۔ شعر۔ راگ۔ گیت۔ دوہرا کبت۔ ضرب المثل۔ اور کہاوت کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں میں سے بعض طریقے علمی دائروں میں منتقل ہوگئے ہیں اور بعض غیر علمی شمار کئے جاتے ہیں۔

جن طریقوں کو علمی دائروں سے خارج سمجھا جاتا ہے وُہ بھی دراصل علمی ہیں کیونکہ انکی بُنیاد بھی علمی طریقوں پر ہی رکھی گئی ہے اور ان میں بھی وُہی خاصہ اور وُہی اثر پایا جاتا ہے کہ جو دیگر علمی طریقوں میں ہے۔

جس طرح نثر کے مقابلہ میں نظم کی ضرورت ہے اسی طرح کہاوت کا وجود بھی ضرورتاً وجُود میں لایا گیا ہے۔ جب نوعِ انسان نے اپنے ارد گرد اور پیش و پس بہت سے واقعات کے وقوع اور معاملات کے ظہورِ نتائج کو دیکھا تو اُسوقت خلاصتاً جن جن امُور کو ایک خاص ترتیب میں بیان کیا گیا اس نظر سے کہ لوگ اُن پر غور اور توجہ کریں اُن کا نام **کہاوت** رکھا گیا ایک شخص نے خود اپنی ذات کے مقابلہ میں ایک بات کا تجربہ یا آزمائش کی یا کسی اَور کی بابت سُنا یا دیکھا اور اُسکو کسی دُوسرے وقت میں نظیراً سُنایا یا پیش کر دیا تو وہ ایک ضرب المثل یا کہاوت ہے۔ **کہاوت** کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگ ایک مجرب یا آزمودہ واقعہ اور ایک معقول نظیر کے ذریعہ سے تادیب یا تنبیہ یا ایک علم مزید اور وقوف لازمی حاصل کریں اور اُن کے واسطے مہمات معاشرتی میں ایک ذریعہ بصیرت ہو۔

علمی مباحثات میں جن امُور کو بطبقہ کَمَا قَالَ فُلَانٌ یا بقولِ فلانٍ بیان کیا جاتا ہے اور ان اقوال کو سنداً پیش کرتے ہیں وُہ بھی ایک قسم کی کہاوتیں ہی ہوتی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ اُنکو علمی دائروں میں معرضِ بیان میں لاتے ہیں اور

ضرب الامثال عام طور پر صداقت کے پیرایہ میں بیان اور قبول کی جاتی ہیں۔[1]

ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسی تاریخ نہیں جس سے ہم یہ بیان کرسکیں کہ فلاں زمانہ میں کہاوت کی بنیاد رکھی گئی یا فلاں شخص اسکا موجد تھا۔ اس حالت میں ہمیں یہی کہنا پڑیگا کہ انسان کی پیدایش کے ساتھ ہی اس کی پیدایش بھی ہے یا یوں کہہ لو کہ جب سے انسان کی گردن پر معاشرت کا جوا رکھا گیا ہے تب سے اس کا وجود بھی ہوا۔

پرانے عہدنامۂ توریت میں حضرت سلیمان کے ضرب الامثال ایک مشہور ضرب الامثال ہیں۔ گو اُنکو علمی طریقوں سے پیش کیا گیا ہے مگر اُن سے اس قدر پتہ لگ سکتا ہی کہ یہ طریقہ بدور دنیا سے ہی اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کہاوت کا وجود اور کہاوت کی ضرورت شعری ضرورت سے بھی پہلے محسوس کی گئی تھی۔ شعری ضرورت اسوقت محسوس ہوئی ہے کہ جب قوموں کو زبان کے درست کرنے اور خیالات کے ایجاز و ابتہاج کا خیال پیدا ہوا اور یہ حالت شعری اسوقت شروع ہوئی تھی کہ جب علمی طریقوں کی کافی اشاعت ہوتی جاتی تھی بہر حال یہ ماننا پڑیگا کہ کہاوت کا وجود شعر سے پہلے تھا۔

قریبًا ہر ایک زبان میں کچھ نہ کچھ کہاوتیں پائی جاتی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں عمومًا ایسے واقعات پائے جاوینگے کہ جن پر کہاوتوں کی بنیاد ہے یا جن سے کہاوتیں بنائی جاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ شعر کی طرح چونکہ کہاوت کے واسطے زیادہ تر قیود اور پابندیاں نہیں ہیں اسواسطے اُنکی تدوین اور ترتیب چنداں مشکل نہ تھی۔

یہ تعجب ہے کہ اگر چند ملکوں یا چند زبانوں کی کہاوتیں جمع کی جاویں تو اُن میں سے اکثر کہاوتیں باعتبار اپنے مضامین کے متحد پائی جاتی ہیں بعض ایسی مرادف

ہیں کہ بادی النظر میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ گویا ایک ہی قائل کی کہی ہوئی ہیں۔ یا یہ کہ
زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ جہاں تک خیال کیا گیا ہے۔ اس اتحادِ
خیال کے وجوہات حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

الف - چونکہ انسان کے خیالات کا رجوع طبعاً ایک ہی سلسلہ سے مربوط ہے اور
بلحاظ اس کے مدنی الطبع ہونے کے تقریباً اصول خیالات کا ماخذ ایک ہی ہے اسواسطے کہاوتیں بھی متحد ہیں
ب - یہ دنیا میں چونکہ انسانی جماعتیں زیادہ تر متحد خیالات رکھتی تھیں۔ اسواسطے
اتحاد کی بدولت یہ اتحاد بھی چلا آتا ہے۔

ج - تبادلۂ خیالات کے ذریعہ سے اس اتحاد کی بنیاد شاید قائم ہو چکی ہو۔

د - چونکہ حقایق کا وجود ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں یکساں ہی پایا جاتا ہے۔
معاشرتی اغراض اصولاً ہر ملک اور ہر قوم میں متحد الحالات میں اسواسطے یہ کہنا پڑیگا
عموماً وہ کہاوتیں جو حقایق یا معاشرتی مسلمات سے وابستہ ہیں۔ ہر ایک ملک اور
ایک قوم میں ایک ہی طریق سے بیان کی جاتی ہیں اور ایک ہی اصول پر ان کو
تسلیم کیا گیا ہے۔

ذ - یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کہاوتوں میں توارد ہو گیا ہے کیونکہ توارد
خیالات ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس سے عموماً اتحادی حالت پائی جاتی ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہاوتوں کا تداول اور اشاعت زیادہ تر
ان جماعتوں میں ہے کہ جو عام جماعتیں شمار ہوتی ہیں اور جنہیں علمی باتوں سے نسبتاً کم
تعلق ہے اور سب سے بڑھ کر کہاوتوں کا استعمال مستورات میں پایا جاتا ہے اور اکثر
کہاوتیں عورتوں کی زبانی کہی گئی ہیں۔ ابھی تک کوئی ٹھیک وجہ نہیں معلوم ہوئی
عورتوں کی طبائع کو کہاوتوں سے کیوں ایسی مناسبت ہے اور کیا وجہ ہے
مستورات کی زبان پر بمقابلہ مردوں کے کہاوتی الفاظ زیادہ تر سہولت سے اطلاق

پاتے ہیں۔ اگر ایک مجلس میں بیس مرد اور پانچ عورتیں مخلتے بالطبع گفتگو کریں یا کسی امر پر بحث ہو تو مرد سو دلائل کے پیچھے شاید ایک کہاوت بھی بیان نہیں کریگا لیکن عورتیں پانچ باتوں میں ایک ضرب المثل تو ضرور کہہ جاوینگی۔

بحث۔ لڑائی۔ مکالمت کے وقت عورتوں کی زبان سے بیسیوں کہاوتیں سُننے میں آتی ہیں اور طرفہ یہ کہ وُہ سب ٹھیک موقع اور برمحل بولی اور کہی جاتی ہیں۔

جس طرح نثر اور نظم باعتبار واقعہ اور حقیقت کے یا ایک کلام اور ایک جملہ بلحاظ اپنے الفاظ کے کچھ نہ کچھ اثر رکھتا ہے۔ اسی طرح کہاوت بھی ایک اثر رکھتی ہے جیسے کل اشعار یکساں اثر نہیں رکھتے ہیں ایسے ہی کل کہاوتیں بھی ایک ہی قسم کے اثر کے تابع نہیں ہوتیں۔

کہاوت کا اطلاق عموماً اُسوقت ہوتا ہے کہ جب ایک موجُودہ واقعہ کو ایک نظیر یا ایک وقوعی دلیل سے ثابت کرنا ہو یا یُوں کہو کہ کہاوت اکثر اوقات بجائے خود ایک وقوعی دلیل اور ایک مشتبہ نظیر ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ اکثر کہاوتیں باعتبار اپنے مضامین کے غلط ثابت ہوں اور اُن کا مصداق مفقود ہو۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُن کا اکثر حصہ واقعاتی اثروں سے مملو ہوتا ہے۔

جب کوئی کہاوت پیش کیجاتی ہے تو سُننے والوں کو اُس طرف توجہ ضرور ہوتی ہے اور سامعین سمجھتے ہیں کہ اُنکے سامنے ایک وقوعی نظیر پیش کی گئی ہے۔

نظم اور شعر میں فرضی واقعات بھی باندھے جاتے ہیں اور وُہ سماں بھی دکھایا جاتا ہے کہ جو شاعر کے خیال میں مرتسم ہو رہا ہے۔ اُن واقعات کو بھی لیا جاتا ہے کہ جو ظنی اور وہمی ہیں۔ اُن مضامین پر بھی بحث کی جاتی ہے کہ جن کا وجُود محض خیالی طور پر تسلیم کیا گیا ہے یا جن میں صرف تلازمات کی بھرمار ہے۔ مُبالغہ اور ایجاز و اختصار

سے بھی کلام لیا جاتا ہے۔

لیکن کہاوت میں عموماً یہ سب باتیں اور یہ سب تعلیات مقصود ہوتی ہیں۔ کہاوت کا وجود صرف اُنہیں واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔ کہ جن کا وقوع یا صدوث از رُوئے واقعات ہو چکا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ شعر یا کوئی دلچسپ نظم شاعر یا ناظم کی خوبیٔ طبع اور حُسنِ ذہن کا اثر لئے ہُوئے بمقابلہ کہاوت کے غضب کا اثر کرتی اور سکّہ جماتی ہے اور شاعر کی جودت طبع حسنِ مضمون اور خوبیٔ بیان سے بے درد اور روکھی پھیکی طبیعتوں کو بھی اپنے راہ پر لے آتی ہے۔ لیکن جن بندشوں اور جن تلازمات سے یہ حُسن و خوبی شاعر نے پیدا کی ہے اور جن کڑی منزلوں سے شاعر کی طبع گذری ہے وہ قائلِ ضرب المثل نے کہاں بھی اورسنی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایک اچھے شعر یا نظم کے مقابلہ میں ایک کہاوت کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے میں صرف یہ کہتا ہُوں کہ ایک اچھا شعر یا موزون اور موثر نظم جن جن قالبوں سے ڈھل کر نکلتی ہے اور ایک نازک خیال شاعر کو ایک مضمون کے دلچسپ بنانے کے لئے جو خونِ دل کھانا پڑتا اور جو دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے اُن راہوں سے کہاوتوں کا گذر ہی نہیں ہُوا۔ ایک اچھے شعر کے واسطے بہت سے تلازمات کی ضرورت ہے۔

وصفِ چشمِ یار کو جادو بیانی چاہیئے
بہر تسطیرِ سراپا کلکِ مانی چاہیئے

خلاف اس کے کہاوت کے واسطے صرف ایک واقعہ کا سادہ طور پر بیان کر دینا ہی کافی ہے ✦

مرزا سلطان احمد

غرورِ حسن

غرورِ حسن اجازت مگر نہ داد ای گل
کہ پرسشے نہ کنی عندلیبِ شیدا را

بذاتہٖ غرور ایک ایسی بدترو زبوں خصلت ہے۔ کہ اعلےٰ سے اعلےٰ اور برتر سے برتر انسان کو عام نظروں میں حقیر۔ ذلیل اور انگشت نما بنادیتی ہے۔ لوگ عموماً مغرور شخص سے ملنا تک ناپسند کرنے اور معیوب سمجھنے لگتے ہیں۔ حتّٰی کہ بادشاہوں میں بھی غرور ایک بدترین عیوب خیال کیا جاتا ہے۔ مگر خدا جانے یہ ظالم حُسن کیا چیز بنا ہے۔ کہ یہی غرور اگر کسی حسین میں ہو۔ تو ایک دل کش و شیریں ادا کہلانے لگتا ہے!

کتنی عجیب بات ہے۔ کہ بعض باتیں اور عادتیں حسینوں میں بھی بھونڈی اور معیوب محسوس ہوا کرتی ہیں۔ لیکن غرور اور حُسن کا کچھ ایسا تال میل ہے۔ گویا قدرت نے ایک کو دوسرے کا موضوع لہٗ قرار دیا ہے۔ یہی نہیں کہ مصاحبتِ حسن سے غرور کی شان بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ حُسن میں بھی ایک آن پیدا ہو جاتی ہے۔

حُسن میں غرور گھُل مِل کر ایسا موزوں ہو جاتا ہے۔ جیسے پانی میں رنگ۔ اور اپنے نزدیک تو سو کی ایک بات یہ ہے۔ کہ جس حسین میں غرورِ حسن نہیں وہ اُس پھُول کی مانند ہے۔ جس کے پہلو میں کوئی کانٹا نہیں۔

ہرچند ایسے پھُول کی نزاکت۔ لطافت اور نظر فریبی میں کچھ فرق نہیں آجایا کرتا۔ مگر جو شان و شوکت۔ برتری و عظمت۔ تجمّل و تمکنت اسکو کانٹوں کے ہوتے حاصل ہو سکتی ہے وہ نہیں ہوا کرتی۔

لعل جیسی بے بہا چیز کی قیمت اِس لئے کم نہیں ہو سکتی کہ وہ پہاڑوں کی سیتی سوا گذا

جگہ میں پیدا ہوتا اور کوہ کنی سی محنتِ شاقہ برداشت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اِس وجہ سے اُس کی قدر و منزلت زیادہ ترقی کرتی ہے ۔ ورنہ لعلِ بدخشانی اور معمولی سنگریزہ کوہستانی میں کچھ بھی اِمتیاز نہ رہتا!

مشہور ہے کہ ہیرے کی کنی سے اِنسان مرجاتا ہے۔ مگر کیا اِس سے اسکی عزت اِس کی وقعت ۔ اسکی شہرت اور اسکی قیمت میں کچھ کمی واقع ہوجاتی ہے ؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ نقادانِ فنِ جوہر شناسی کے نزدیک وُہ ہیرا اصلی ہی نہیں ہوتا ۔ جس میں یہ خصوصیت نہ ہو۔

ایسا ہی تکمیلِ حُسن و جمال کے لئے غرور و تبختر ایک ایسی ہی لازمی صفت ہے جیسی کہ لعل و الماس کے لئے مذکورہ بالا خصوصیتیں۔

غرورِ حسن! ہائے ظالم تو ایک ایسا خنجر ہے جسکی کاٹ میں لذت ۔ ایسا درد ہے جسکی شدت میں کیفیت ۔ ایسا تیر ہے جسکی خلش میں لطافت ۔ ایسا زہر ہے جسمیں سراسر حلاوت ۔ اور ایک ایسا ہلاہل ہے جسکو لوگ غلطی سے زہر کہتے ہیں ۔ ورنہ تیرا ایک قطرہ سو امرت ساگر سے بہتر ہے!!

او غرورِ حُسن! او میٹھی چھُری! او اپنے گرویدوں کے مار دینے اور جلا لینے والے جادو!! کچھ تجھے بھی معلوم ہے؟ دیکھ! تیرے کُشتے کس بے بسی کے عالم میں تڑپ رہے ہیں ۔ مگر اِس پر بھی "قربان زنگ ہے تو شوم باز نگلیے" کی صدا بلند ہے۔

او تغافل کیش! او تجاہل شعار! او بیدرد قاتل!! تو اپنے کُشتوں کا مداوا۔ اپنے مجروحوں کا علاج ہمیشہ نمک سے کیا کرتا ہے ۔ مگر اُنہوں نے اسی کا نام لطفِ حیات و بہارِ زندگی رکھ چھوڑا ہے۔

گر سہ
تِرا غرور مِرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

سید علمدار حسین بنوڑامی

مرقّعِ شبِ ماہ

اللہ اللہ کیا زمانہ تھا - لاہور کے اہلِ علم کی مجلسیں تھیں - اور مولانا آزاد - بڑے بڑے باکمال جمع تھے - مولانا آزاد - جو بعد میں شمس العلما کے خطاب سے مخاطب ہُوئے - اسوقت صرف پروفیسر محمد حسین تھے - مگر شمسِ علم و فضل اُسی وقت سے تاباں تھا - اُنکی ذات مقناطیسی اثر سے سخنوروں کو کھینچتی تھی - انہی دِنوں میں ایک مشاعرہ قائم کیا - جس میں خود اپنی نظم دلکش سُنا کر سامعین کو محو کیا کرتے تھے - شرکاء مشاعرہ میں مولوی سید احمد کبیر صاحب المتخلّص بہ عاشق تھے - جو اب ماڈل سکول لاہور کے زُمرۂ معلّمین کی زینت ہیں - بہت قابل آدمی ہیں - مگر خاموش - نہ عام طور پر لوگ اُنکے شناسا - نہ وُہ لوگوں کے پہچاننے والے - حال میں اِنہیں سید شریف حسین صاحب بی - اے جیسے لائق اور نوجوان بیٹے کے انتقال کا صدمہ پہنچا ہے - جس نے انہیں اور بھی چُپ کر دیا ہے - مگر حُسنِ اتّفاق سے ہمیں اُنکی جوانی کی ایک نشانی مل گئی ہے - شریف حسین مرحوم انتقال سے تھوڑے دن پہلے اُن کے کاغذات میں سے مندرجہ ذیل نظم تلاش کر کے ہمیں دے گئے تھے - یہ اُس مشاعرہ کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی تھی اور اس پر مصنّف کو بیحد داد ملی تھی :-

دِن چھپ گیا رات کے ہیں ساماں ۔۔۔ ڈوبا وُہ اُفق میں مہرِ تاباں
ہے شب کی جو فوج آن ٹوٹی ۔۔۔ مُنہہ پر ہیں ہوائیاں سی چھوٹی
تن خوف سے کانپتا ہے تھر تھر ۔۔۔ زردی بکھری ہُوئی ہے مُنہہ پر
بھاگا خورشید دیکھ سایا ۔۔۔ دورِ شبِ ماہتاب آیا
سُرخی ہے شفق کی آسماں پر ۔۔۔ ظلمت کا حجاب ہے جہاں پر

تاریکیٔ شب نے سر اُٹھایا سودائے صفرا پہ غالب آیا
ہونے لگا جھٹپٹا اندھیرا طائر لینے لگے بسیرا
گل گل سے ہے عندلیب مضطر رخصت ہوئی الفراق کہکر
کہتی ہے - رہی جو شب کو جیتی میں تم سے کہونگی رات بیتی
تاکید ہے باغباں کی یکسر ہو دخل نہ غیر کا یہاں پر
پہرہ ہے روش روش جمایا نرگس کو ہے دیدباں بنایا
دیتا ہے اذاں کوئی مسلماں مغرب کی نماز کے ہیں ساماں
ناقوس ہیں مندروں میں بجتے پوجا میں پران سب ہیں تجتے
حق ہر کا ہے لفظ میں فقط فرق معبود کی یاد میں ہیں سب غرق
ہیں سبحہ پہ دم خدا کا بھرتے سمرن پہ ہیں ہر کی یاد کرتے
ہر سمت ہے ہو رہی چراغاں پُر نور ہے شب کا جیب و داماں
در پردہ جو یوں جلی کٹی ہے پروانہ سے شمع کی لگی ہے
خاموشی پہ گل ہے یہ کھلاتی سب چرب زبانیاں دکھاتی
ظلمت نہیں چار سو یہ پھیلی کھولے ہوئے زلف کو ہے لیلی
تحریر نہیں یہ کہکشاں کی ہے مانگ یہ موتیوں میں بھاری
پاکر نور نظر پہ تابو پرواز میں شپرک ہے ہر سو
کحل الجیرت ہے صرف دیدن ظلمت میں سواد چشم روشن
صورت جو دکھائی اپنی شب نے رخ گھر کی طرف کیا ہر سب نے
جنگل سے ہیں آرہے مویشی چلنے میں دکھا رہے ہیں پیشی
دوڑے ہے کوئی کوئی اُچھلتا بچکر ہے سڑک سے کوئی چلتا
چوپاں پیچھے ہے اُن کے آتا دُھن میں یہ غزل ہے اپنی گاتا

یارب میری آہ میں اثر دے — اس شاخ کو بھی گُل و ثمر دے
دل کی مری بیکلی کو کر دُور — دامنِ گلِ مُدعا سے بھر دے
اے راحم و مطلق الاسارے — آزاد اس بندِ غم سے کر دے
یہ شوق ہے عالمِ بقا کا — اُڑ جاؤں خدا جو بال و پر دے
ساقی باقی رہے ترا دَور — ساغر مئے ارغواں سے بھر دے
پہنچا جو وہاں نہ پھر کے آیا — کون اہلِ قبور کی خبر دے
آفت ہے سامنا اجل سے — اس جنگ میں بس وہی ظفر دے
عاشق جو خدا کی یاد بھولا — کچھ عقل پہ پڑ گئے ہیں پردے
ساقی ہے چمن ہے شب ہے نا صبح — مہلت ہمیں آج تا سحر دے
ہے چاند کی روشنی سے ہر جا — روشن در و بام و کوہ صحرا
پھیلی ہے یہ چاندنی سراسر — یا فرش ضیا کا ہے زمیں پر
یا خامۂ نور سے ہے تحریر — وَالَّیلِ اِذَا سَجٰی کی تفسیر
روشن نہیں چرخ پر ستارے — تفسیر کے ہیں نقاط سارے
دفتر اس کا ورق ورق ہے — مضمون پیچیدہ و ادق ہے
پائے تو نکات کی حلاوت — گر فَاعْتَبِرُوْا کرے تلاوت
ہے شرح میں اس کی بس یہ لکھا — دنیا نہیں اعتبار کی جا
دھوکے میں نہ اسکے آؤ ہرگز — دل اپنا نہ یہاں لگاؤ ہرگز
ہے تلخیِ مرگ اس کا درماں — ہے نوش میں اس کے نیش پنہاں
اس نخل کا پھل ہے نکبۃ الحال — کرتا ہے نہال کرکے پامال
کرتے تھے جو دعوے خدائی — آخر اُن کو بھی موت آئی
نمرود کو دیکھئے کہاں ہے — باقی نہیں نام کو نشاں ہے

فرعون و ثمود و بخت نصّر   سب چلدیئے چھوڑ تخت و افسر
ساسانی و پیشدادی و کے   دُنیا میں کہو تو دن رہے کے
جامِ جمشید و قصرِ کسریٰ   آتا نہیں یاد بھولا بسریٰ
رستم ہے نہ زال ہے نہ ہے سام   افسانوں میں رہگئے فقط نام
باقی ہے نہ جام و سام باقی   مولا کا فقط ہے نام باقی
غافل عشرت ہے یہاں کی تکلیف   عاقل ہے تو چھوڑ اسکی اُلفت
گلزارِ جہاں ہے خارِ بنیاد   ہے اس کی نسیم صرصرِ عاد
اس گل کی شمیم ہے ہشیار   ہے لخلخۂ فنا و ادبار
منزل یہ کٹھن ہے پُرخطر ہے   کچھ زادِ سفر کی بھی خبر ہے
ساتھی ہے نہ بدرقہ ملے گا   تنہا تو یہ راہ طے کرے گا
کرتے ہوئے لوگ شیون و شور   چھوڑ آئینگے تجھ کو تا لبِ گور
پھر نوحہ نہ نالہ اور نہ رونا   تو ہوویگا اور لحد کا کونا
کام آئیگا بھائی اور نہ بیٹا   پر ہاں جو عمل ہے ہے سمیٹا
یہ مال و منال و جاہ و دولت   مُلک و حشم و نہیب و صولت
دُنیا سے جو کوچ تو کرے گا   ساتھ انمیں سے کوئی بھی نہ دیگا
بہتر ہے کہ آج خیر کر لے   کچھ ساتھ کو توشۂ سفر لے
کیوں مال کی فکر میں پڑا ہے   کیوں طمعِ فضول میں لگا ہے
بھائی ہیں ترے اسیرِ کربت   ہے قابلِ رحم انکی غربت
کچھ اپنے بھی حال پر نظر کر   بہبودی میں ان کی صرف زر کر
تو پیتا ہے یہاں شرابِ گلگوں   تکلیف سے انکا ہے جگر خوں
تو ذوق میں ہے گزک اُڑاتا   وہ غم سے کباب ہیں سراپا

تو رقص و سرود میں پڑا ہے وہاں نوحہ و گریہ و بکا ہے
مسند پہ تو ٹیکے بیٹھا فرعون انکو نہیں پوچھتا وہ ہے کون
ہے تو تو لگائے گاؤ تکیے پتھر ہیں رکھے وہ سر کے نیچے
کھاتا ہے تو پلاؤ قلیہ ملتا نہیں انکو دال دلیہ
ہے خس کی لگائے ٹٹیاں تو سنولاتے ہیں دھوپ میں وہ ہر رو
محلوں کے لگی ہے یہاں چنائی ہیں خانہ بدوش تیرے بھائی
قالین کے ہیں فرش یہاں سراسر انکو نہیں بوریا میسر
یہاں رات ہے شبرات دن عید وہاں غم سے سیہ ہے روز امید
تو جشن ہے رات بھر اڑاتا پھولا نہیں جامہ میں سماتا
جان انکی عذاب میں ہے گھلتی تارے گن گن ہے رات کٹتی
محفل میں تیری ہے شمع روشن اندھیر پڑا ہے انکا مسکن
تو محو جمالِ نازنیں ہے یہاں درد سے ہوش تن نہیں ہے
کرتا ہے تو بار بار شانہ سر ہو گیا بار دوش اُن کا
کرتا ہے یہاں تو سیرِ گلشن پھرتے ہیں وہ مارے مارے بن بن
کمخواب پہ تجھ کو نیند آئی ہے فرش زمیں پہ ایک خدائی
تو عطر عروس مل رہا ہے یہاں سارا سہاگ جل رہا ہے
ہے ہار گلے میں تو تو ڈالے واں جان کے پڑ رہے ہیں لالے
تو بستر نرم پر ہے شاداں خاکستر گرم پر وہ غلطاں
پہنے ہے تو خلعتِ مرصع پوشاک ہے سبکی یہاں مرقع
پہنے ہے تو بے بہا انگوٹھی حسرت سے وہ کاٹتے ہیں انگلی
بھاتی ہے تجھے تو میز و کرسی کرتا نہیں اُن کی تو حال پرسی

نعمت سے بھرا ہے پیٹ تیرا — فاقوں سے غیر حال اُن کا

دولت کے تو نشہ میں ہے سرشار — افلاس میں قوم ہے گرفتار

ہم جنس پہ اپنے یہ مصیبت — آتی نہیں تجھ کو کچھ حمیت

اے مستِ سرورِ خوابِ خرگوش — شیرِ قالین نہ بن پکڑ ہوش

گر حُبِّ وطن کی کچھ بھی بُو ہے — تیرا نہ سفید گر لہو ہے

ایں عیش ز مردمیت دُور است — غمخواریِ بیکساں ضرور است

بخشی ہے خدا نے گر امیری — کر اہلِ وطن کی دستگیری

حق نے ہے تجھے اگر کیا شاد — کر قوم کو بندِ غم سے آزاد

احسان کیا کبریا نے تجھ پر — ہم جنس پہ اپنے تو کرم کر

تعطیلِ کرم نہیں مناسب — شکرِ نعمت ہے تجھ پہ واجب

محبوبِ خدا ہے قوم کا دوست — مغضوبِ الٰہ دشمنِ اوست

ڈر خوفِ خدا سے بن نہ واہی — لاٹھی میں صدا نہیں ہے اُسکی

چاہے تو کرے ابھی اسی آن — سلطاں سے گدا گدا سے سلطاں

دانا ہیں عقیل اُس کو کہتے — دیوانے جو قوم پر ہیں سہتے

آ ہوش میں آ یہ خواب کب تک — دیگا نہ اُسے جواب کب تک

کچھ لوگ غریب سیدھے سادے — حُقّہ پیتے ہیں حلقہ باندھے

ہیں دن کی ریاضتوں سے بیغم — کچھ ذکر یہ کر رہے ہیں باہم

ہیں اب کے تو فصل کے بُرے طور — بارش نے جما رکھا ہے رنگ اَور

گر مینہ کا یہی معاملہ ہے — حافظ پھر فصل کا خدا ہے

کھیتی اگر اب کے یوں بگڑ جائے — اغلب ہے کہ قحط سخت پڑ جائے

یوں فصل سے گر جواب ہونگے — دانے اپنے خراب ہونگے

ہو نفع کہاں نصیب ایسا — بیٹھائے لگان ہی کا پیسا
خواہش میں خدا کی دخل کیا ہے — جو چاہے کرے وہ کبریا ہے
کہتا ہے کوئی کہ ہاں بجا ہے — مختار ہر ایک کا خدا ہے
پر کچھ تو بدل گیا زمانا — کہتے ہیں یہ سن رسیدہ دانا
اب جیسی ہے کاشت کی ترقی — اگلے وقتوں بھلا کہاں تھی
پانی بھی ہیں بے نظیر ہوتے — ہوتے ہیں سمے بھی خوب بانکے
پیدا کی ذرا نہیں کمی ہے — پر کچھ برکت سی اُٹھ گئی ہے
گر غور سے سب کا دیکھئے حال — پاؤ گے کوئی نہ فارغ البال
یہاں دیکھو تو کاشتکار نالاں — بیوپاریکا حال وہاں پریشاں
جو لوگ ہیں روزگار پیشا — دُکھ اور ہی جھنکتے ہیں اپنا
عشرت کی وہ لذتیں چکھتے — اسباب گرو ہیں اپنا رکھتے
بھانڈا عشرت نے اُن کا پھوڑا — گھر میں برتن بھی اک نہ چھوڑا
کھُلتا نہیں یہ ماجرا کیا ہے — نیت میں فتور ہے کہ کیا ہے
ماں بچے کو گود میں لئے ہے — دیتی ہے یہ لوریاں پیا پے
اس مُکھڑے پہ ماں نثار ہو جا — سو جا میرے لال جلد سو جا
جھُولا ترا عُمر خضر کی ہے — ڈوری آرام کی بندھی ہے
بدخوابی نہ اپنا دخل پاوے — سُکھ چین کی تجھ کو نیند آوے
اقبال ہو تیرے آگے آگے — دشمن سووے نصیب جاگے
مادر ہے تیری بلائیں لیتی — راحت تجھے لوریاں ہے دیتی
دیکھوں نہ میں تیری آنکھ دُکھتی — تجھ سے ہی ماں کی کوکھ ٹھنڈی
مَیں نے ہو مرے دُکھوں سے پالا — جیتا رہے تو مُرادوں والا

دُکھ درد نہ تیرے پاس آوے | بوڑھا ہو تو عُمرِ نوح پاوے
دُنیا میں ہو عزّ و جاہ تیرا | سونے کے ہو سہرے بیاہ تیرا
دُشمن پڑے آ کے تیرے جُوتوں | دودھوں نہاوے پھلے تو پوتوں
ہو علم نصیب تجھ کو بیٹا | گھر گھر ترے علم کا ہو چرچا
اللہ کرے تجھے تونگر | جاری رہے تیرے گھر سے لنگر
تو اہلِ وطن کے کام آوے | تو قوم میں اپنے نام پاوے
فریاد کو پہونچے غمزدوں کی | امداد کرے تو بیکسوں کی
دروازہ پہ ترے ہاتھی جھُومے | قیصر ترے آستاں کو چُومے
بخشے تجھے کارساز اقبال | دُنیا میں رہے تو فارغ البال
ہیں طالب علم جمع ایک جا | اور بیچ میں ہے چراغ جلتا
پروا نہ خورش نہ خواب کی ہے | لو سب کی کتاب سے لگی ہے
یہ جبرِ تقبیل میں پڑا ہے | وُہ علمِ حساب میں لگا ہے
یہاں علمِ ادب پہ گفتگو ہے | منطق پہ کلام وہاں کسو ہے
حکمت میں ہے کوئی دل لگائے | تاریخ میں کوئی جی لڑائے
محمود کا جب ہے حال پڑھتا | ایک غیظ و غضب ہے اسکا بڑھتا
کہتا ہے کہ ہیں یہ کیا ہے طوفاں | غزنی میں بکے ٹکے کو انساں
پر آگے جو دیکھتا ہے بڑھکر | ہے کوئی فنانشل کمشنر
دستور کوئی شاہِ زماں کا | افسر کوئی لشکرِ گراں کا
ہوجاتا ہے دم میں غم سے خالی | آجاتی ہے چہرہ پر بحالی
پر دل میں خیال ہے یہ آتا | عہدے نہیں اب کوئی یہ پاتا
یہ عہد تو عدل سے ہے معمور | ملتے نہیں پر وُہ کیوں بدستور

سرکاری عنایتیں نہیں ہیں   یا ہم میں لیاقتیں نہیں ہیں
سرکار تو مہرباں ہے ہم پر   اور پہلے سے ہم ہیں اہلِ جوہر
پھر کس نے یہ فرق آ کے ڈالا   بے شک کچھ دال میں ہے کالا
کچھ شمعیں ہیں اِک مکاں میں روشن   رونق سے بنا ہے رشکِ گلشن
شائستہ سے لوگ کچھ ہیں بیٹھے   ہیں چائے کے دَور سے بھی چلتے
آئین و ادب سے حسبِ دستور   ہوتے ہیں اِدھر اُدھر کے مذکور
ہے رُوس کا ذِکر کوئی لاتا   خبریں کوئی رُوم کی سُناتا
کابل کے کوئی ہے کہتا اخبار   گہ کرتا ہے کوئی ذکرِ قندہار
جو حُبِّ وطن میں مُبتلا ہے   وُہ اَور ہی نشہ میں پڑا ہے
گرمی پہ ہے سوزشِ نہانی   کہتا ہے وہ ہند کی کہانی
اِن باتوں سے ہم کو کچھ سروکار   کچھ مُلک کی سے کیجئے گا تکرار
محروم نہ فائدہ سے رہیئے   تازہ کوئی حالِ مُلک کہیے
مَیں نے کسی پرچہ میں ہے دیکھا   سرکار نے حکم ہے یہ بھیجا
دیسی جو سول میں ہوویں داخل   اٹھارہ برس کے ہُوں وُہ کامل
کم اس سے جو ہووے یا زیادہ   لازم ہے کرے نہ وُہ ارادہ
میعاد جو کی ہے یہ معیّن   سرکار کے دل پہ کیا گئی ٹھن
کیوں دیسیوں کا ہے دل دکھاتی   کیوں ایسے قیود ہے لگاتی
ظاہر ہے کہ تا دوازدہ سال   ناداں رہتے ہیں یہاں کے اطفال
پھر غیر زباں کا اُن کو پڑھنا   انگریزی میں رفتہ رفتہ بڑھنا
تقدیر جو ہووے پھر کہیں سرس   اٹھارویں انٹرنس ہو پاس
پھر جس کے سول کے ہوں ارادے   فرمائیے کیا کرے وہ بارے

دیکھیگا یہ وقتیں جو حائل — کاہیں کو سول میں ہوگا داخل
بس تھی نہ یہ بندش معیّن — تحصیل کریں وہ جا کے لنڈن
بہتر اس سے تو تھا یہی یار — لیتی نہ سول کا نام سرکار
جی میں یہ خیال تو نہ آتے — دل یوں تو نہ پیچ و تاب کھاتے
یہ تو ہے بعینہ وہی حال — اُڑ جاؤ فلک پہ بے پر و بال
کھلتا نہیں کچھ یہ حال کمبخت — سرکار ہے دیسیوں سے کیوں سخت
کہتا ہے کوئی یہ افترا ہے — صاحب تمہیں خیر ہے یہ کیا ہے
اِس عقل کے ناخن آپ لیجے — بڑھ بڑھ کے نہ یوں کلام کیجے
سرکار ہے اپنی عدل گستر — آتا نہیں مجھ کو اس کا باور
کرتا ہے کوئی جو اُسکی خدمت — پاتا ہے بڑی وہ قدر و رفعت
کرتا ہے جو کام ایسے ویسے — پاتا ہے خطاب کیسے کیسے
تب عدل کا اس کے حال کھلتا — سرکار جو ہوتی ظلم پیشا
کیا بھول گئے وہ عہد حضرت — گھر میں بھی نہ امن کی تھی صورت
کچھ تم سے معاوضہ ہے لیتی — اعزاز کے عہدے ہے جو دیتی
یہ اس کی فقط عنایتیں ہیں — پھر اس پہ بھی یوں شکایتیں ہیں
لفٹنٹ کوئی بنا دے تم کو — حلوا کھانے کا منہہ تو کر لو
اِس بحث سے بس اُٹھایئے ہات — زیبا نہیں چھوٹا منہہ بڑی بات
بولا وہ جواب میں بحسرت — یہ طرفہ اُٹھاتے ہو قیامت
خدمت کا عوض وہ ہم کو دیتی — یا اُلٹا معاوضہ وہ لیتی
ہیں کیا یہ خیال اُلٹے پلٹے — جاتے ہیں پہاڑ بانس اُلٹے
کہلایئے جو بجسم حاصل — یہ فخر خطاب سب ہے باطل

ہاں امن ہیں جو کہو بجا ہے
پر اسکا جواب تم پہ کیا ہے

جو ظلم میں پہلے تھیں بلائیں
گر عدل سے بھی دے اُٹھائیں

ان دونوں میں فرق پھر ہوا کیا
یہ عدل تو عدل حق سے ٹھہرا

وہاں ظلم سے مضطرب تھے رہتے
یہاں عدل سے لوگ دُکھ ہیں سہتے

وہاں لُٹتا تھا ظلم سے زر و مال
یہاں عدل سے خلق ہے تبہ حال

اچھا تو ہوا وُہی نہ یہ نیک
دونوں کا مآل جب ہوا ایک

تا دِل میں اِس کے پر یہ کہہ دو
معنے تو ہے ایک لفظ ہیں دو

اور ہاں جسے افترا بتایا
سارا ہے وہ چشم دید میرا

مضمون کہیے تو وُہ دکھا دوں
اخبار ابھی یہاں منگا دوں

پھر میری خطا معاف کیجیے
معقول جواب اسکا دیجیے

سرکار ہی سے اگر چھپائیں
پھر کس کو یہ دردِ دل سنائیں

واجب ہے مریض پر فقط عرض
درمان و دوا طبیب پر فرض

اسواسطے میں نے یہ کہا تھا
دوگے کوئی مشورہ تم اچھا

پر آپ نے بات ہی اُڑا دی
کیا خُوب ہے داد واہ وا دے

سیدھا جو جواب تھا نہ بارے
اُلٹا الزام تو نہ دیتے

پر آپ کی اس میں کیا خطا ہے
کچھ وقت ہی اور آ گیا ہے

ہر چند پھرا صبا سا ہر سُو
پائی نہ یہ حُبِّ قوم کی بُو

غمخوار کوئی نظر نہ آیا
پایا جسے خود غرض ہی پایا

اپنوں ہی کی جب بُری متیں ہیں
ادبار کی یہ علامتیں ہیں

سرکار پہ کچھ نہیں ہے الزام
اپنے ہی کئے ہوئے ہیں یہ کام

خیر اسکا تو جانے دیجیے ذکر
پر ایک تو سخت ہے ہمیں فکر

افلاس ہو یا فراغ دستی — ہم سب تو گذار دینگے اپنی
پر جو کہ ہمارے بعد ہونگے — کیونکر وہ بھرینگے پیٹ اپنے
گھیرینگی جو اُن کو یہ بلائیں — آخر دینگے وُہ بد دُعائیں
دیکھینگے مصیبتیں جو بھاری — رو دینگے وُہ جان کو ہماری
غفلت نہیں ہم کو یُوں مناسب — ہر اُن کی بھی فکر کچھ تو واجب
اتنا بھی نہ چاہیے تغافل — بہتر نہیں ملک سے تساہل
نادان نہیں باخبر ہو یارو — گر تنگ ہو ہاتھ پاؤں مارو
سرکار سے گر کروگے فریاد — ممکن ہے نہ دے تمہاری وُہ داد
عادل ہے کرم ہے عام اس کا — فریاد رسی ہے کام اُس کا
مانگوگے حقوق تم جو اپنے — بخشیگی وُہ سارے شاد ہوکے
پر ایسے ہی ہتھکنڈے جو رہتے — تو ملک کو خیر باد کہیے
برتینگے جو یُوں ہیں آپ سستی — پھر ہو چکی قوم کی درستی
کس خواب میں تم پڑے ہو صاحب — ڈھیلے نہ بنو کڑے ہو صاحب
سمجھو اسے تم سے کیا ہُوں کہتا — پچتاؤگے کھوکے وقت ایسا
یہ ذکر جو کرچکا وُہ سارا — تھا پھر تو جواب کا نہ یارا
سب بولے نہ آگے کچھ کہو اب — تھوڑی رہی رات سو رہو اب
برخاست ہوا یہ سُنکے جلسہ — پکڑا سب نے گھرونکا رستہ
عاشق اب خامہ روک لیجے — یُوں طُول کلام کو نہ دیجے
جانے دو بڑھاؤ اب نہ قصّہ — اَوروں کا بھی رات میں ہے حصّہ
مضموں کو اگرچہ ہوگیا طُول — ارباب سخن میں پر ہے مقبول
جو حبِّ وطن ہیں دل میں رکھتے — معذور رکھینگے تجھ کو سارے

سید احمد کریم عاشق

برقِ مضطر

نُور ہی نُور ہے وُہ گورا بدن ہے میرا ہُوں فلک سیر۔ چمن چرخِ کہن ہے میرا
اشکِ صد پیچ وخمِ زلف شکن ہے میرا دامنِ ابرِ گہر بار وطن ہے میرا
آتشیں جسم ہے صُورت مری نُورانی ہے
دل کی بےچین ہُوں۔ ہنستی ہُوئی پیشانی ہے

مَیں چمک کر فرشِ نُور بچھا دیتی ہُوں جلوۂ حُسنِ نظر سوز دکھا دیتی ہُوں
گوشۂ دامنِ چلمن کو اُٹھا دیتی ہُوں ہوشِ خورشیدِ قیامت کے اُڑا دیتی ہُوں
عشوہ و ناز میں یکتائے زمانہ میں ہوں
حُسن اور عشق کا دلچسپ فسانہ میں ہُوں

طُور پر جلوۂ محبوب دکھایا مَیں نے بُرقعۂ شاہدِ اسرار اُٹھایا مَیں نے
نقشہ ہنگامۂ محشر کا جمایا مَیں نے خواب سے دیدۂ مُوسیٰ کو جگایا مَیں نے
رازِ سربستہ کو یُوں کھول دکھایا مَیں نے
دیکھنے والا یہ سمجھا کہ چھپایا مَیں نے

اضطرابِ دلِ بیتاب کا نقشا میں ہُوں رقصِ مذبوحِ محبّت کا تماشا مَیں ہُوں
عکسِ آئینۂ نیرنگِ زمانا مَیں ہُوں طفلِ کمسن کی طبیعت کا نمونا مَیں ہُوں
چلبلاہٹ ہے اِک آفت کی مری رگ رگ میں
شوخیاں قہرِ قیامت کی بھری رگ رگ میں

کیا بتاؤں تجھے تفصیل کہ مَیں کیا کیا ہُوں اسمِ اعظم کا ہُوں میں دستخطِ پُر مضموں
زخمِ شمشیرِ محبت کا فشانِ گلگوں بخیۂ چاکِ گریبانِ سحابِ مجنوں

افعیِ ابرِ سیہ کی ہوں زبانِ مضطر
ریچینِ ابروے برآشفتۂ سرکشِ دلبر

جب شہِ ابر کا کرتا ہے چڑھائی لشکر — ہو نہ ہو خواہ کسی طور کا رستہ میں خطر
دورِ گردوں کا لگا لیتی ہوں دم میں چکر — طرفۃ العین میں آجاتی ہوں واپس پھر کر

شش جہت گھومنا اک آن میں دم ہی میرا
وسعتِ ہفت فلک ایک قدم ہے میرا

جب زمانہ میں ہی گھنگھور گھٹا چھا جاتی — رخِ ہستی پہ شبِ تار نقاب آجاتی
جانِ غربت میں مسافر کی ہی گھبرا جاتی — اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہوں جب آجاتی

دم میں کر دیتی ہوں فانوسِ جہاں کو روشن
از زمیں تا بفلک کون و مکاں کو روشن

ماہِ ساون میں ہے جب میری سواری آئی — فتنۂ حشر کے انداز دکھاتی آتی
ابلقِ ابر کو چابک ہوں لگاتی آئی — راہ میں گرد تو ہم کو اُڑاتی آتی

پا نہیں سکتا ہے تیزی میں تو ہم مجھکو
ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہو جاتا ہی خود گم مجھکو

میں نے قدرت سی ہے بےچین طبیعت پائی — اپنی بےچین طبیعت پہ ہے قدرت پائی
آتشِ عشقِ حقیقی کی حرارت پائی — شاہدِ حسن کی شوخی و شرارت پائی

منع اک جا پہ ہے پل بھر کا ٹھہرنا مجھکو
رات اور دن میں کہیں یاد ہی بھی دھرنا مجھکو

نہیں آتا کسی بیکس پہ ترحم مجھکو — کھیل بچوں کا ہی اک مشقِ تظلم مجھکو
شور و فریاد ہے آوازِ ترنم مجھکو — گریۂ ابر پہ آتا ہے تبسم مجھکو

دل لگی خرمنِ دہقان سی مجھے بھاتی ہی

بلبلِ زار کی قسمت پہ ہنسی آتی ہے

چمکا ہر چند سرِ طور شرارا میرا جلوہ افروز ہوا حُسن خود آرا میرا
تُو نے ناصر نہ مگر سمجھا اشارا میرا چشمِ ظاہر سے کیا تُو نے نظارا میرا

جلوہ افزا میں ہُوئی آئینہ سیما ہوکر
مٹ گئی اور تری ہستی کا تماشا ہوکر

ناصر

جُوئے آب

غیرتِ باغِ اِرم ایک نظارا تیرا رشکِ فردوسِ بریں ایک تماشا تیرا
ہائے وُہ شام و سحرگاہ کا جلوہ تیرا دِلِ مُشتاق ہوا جاتا ہے شیدا تیرا

درد مندوں کے لئے باعثِ آرام ہے تو
نام سے جس کے ہو راحت وہ دلارام ہے تو

واہ کیا شان ہے کیا رُعب ہے کیا ہے شوکت واہ کیا زور ہے کیا شور ہے کیا ہے قوت
آہ پہنا یہ ترا آہ تری یہ وسعت اُف تری شوخ ادائیں تری پیاری صُورت

چاندنی چاندنی سب کہتے ہیں ہم جانتے ہیں
کوئی ہو تجھ سے مقابل کہیں ہم مانتے ہیں؟

ٹھنڈی ٹھنڈی تُجھے چُھوکر جو ہوا آتی ہے غنچۂ خاطرِ ناکام کھلا جاتی ہے
نُور کی تیری جھلک چاند کو شرماتی ہے تیری یہ طرزِ خرام آہ غضب ڈھاتی ہے

چھیڑنا ساحلِ ستیا کا تجھے بھاتا ہے
واہ شاباش ہے کیا ناز کا ڈھب آتا ہے

چاندنی رات میں دیکھے کوئی تیرا جوبن — ہائے وُہ رُوپ کہ قربان ہو صحنِ گلشن
وُہ سماں نُور کا اور بادِ صبا کا وُہ چلن — وُہ سکوں چار طرف چھایا فدا جس پہ سخن

تنِ نازک کا وُہ نقشہ کہ خجل آئینہ
شرم سے آب ہو بلّور غضب وُہ سینہ

دِن کو وُہ کھیلنے سُورج کی کرن کا آنا — ناز و انداز کا رنگین وُہ تانا بانا
آہ وُہ جوش میں چلتے ہُوئے تیرا گانا — باتوں باتوں میں اِک عالم کو لُبھا لیجانا

چھیڑنا بادِ صبا کا وُہ تجھے مستی سے
ہائے وُہ چین بجبیں ہونا ترا شوخی سے

دامنِ کوہ سے اُٹھلا کے نکلنے والی — ساحتِ دشت میں انداز سے چلنے والی
رنگ ایک آن میں لاکھوں ہی بدلنے والی — سبزہ و گل کے قریب آ کے مچلنے والی

تو ہی تزئین ہے کھیتوں کے بیابانوں کی
تو ہی تفریح ہے حیوانوں کی انسانوں کی

آہ اے نشۂ بیخود کُنِ پیمانۂ حُسن — آہ اے کیفیتِ بادۂ جانانۂ حُسن
ہائے کیا بات تری شورشِ میخانۂ حُسن — واہ شاباش تجھے او دلِ دیوانۂ حُسن

تو سلامت رہے دُنیا میں الٰہی دائم
زندگی اپنی ہے تیرے ہی تو دم سے قائم

سیّد نذیر حسین

فصل بہار

گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے — ہر طیر نغمہ سنج سرِ شاخسار ہے
تڑپے ہے رُوح سُنکے پرندوں کے چہچہے — مستِ مئے سرود ہے جو ہوشیار ہے
تیاریوں میں بسکہ ہے قدرت لگی ہوئی — میدان میں تہیّہ صد لالہ زار ہے
سرگرم ہیں جو ایسے ہی قدرت کے کارکن — کل لالہ زار ہوگا جو اب کوہسار ہے
صحرا کو کھینچتی ہے دلِ زار کو اُمنگ — بیٹھا رہے جو گھر میں یہ کس کو قرار ہے
محسوس کون باغ کی کرتا نہیں کشش — ہے کون دل پہ آج جسے اختیار ہے
ق
نکتہ بڑا لطیف ہے یہ اے رفیقِ سیر — جنگل میں جو درخت کہ بے برگ و بار ہے
نوشاہ ہے کہ بیاہ کے دن ہیں بہت قریب — میلا لباس [۱] اس لئے اسکا شعار ہے
سہرے کے دن یہ پہنیگا پوشاکِ مخملی — ہے اس کا بیاہ نام یہ جس کا بہار ہے

مخمل کا فرش باغ میں سبزہ بچھا چکا — اب نو عروسِ گل کا فقط انتظار ہے
کچھ حظ اُٹھالے تو بھی کہ دو دن ہیں سیر کے — ناداں بہارِ باغ کا کیا اعتبار ہے
مُنہہ موتیوں سے گل کا بھرا ہے بہار نے — جو قطرہ اُس کا ہے دُرِ شاہوار ہے
غنچے کھِلے ہیں یا ہیں کھُلے نافہ ہائے مشک — یہ صحنِ بوستاں ہے کہ مُلکِ تتار ہے
تیری ہی لگ نہ جائے نظر اے نگاہِ شوق — تو دیکھتی تو چہرۂ گل کا نکھار ہے
دُنیا میں رنج اگر نہیں راحت کے ساتھ ساتھ — لالے کا دِل بہار میں کیوں داغدار ہے

---

[۱] بعض مقاموں کے رواج کیطرف اشارہ ہے کہ مستورات دولہا کو سہرے کے دن کہ کچھ دن پہلے کپڑے بدلنے نہیں دیتیں۔

…تل طفل کرے رقص کیا عجب — جوشِ بہار دشمنِ جان و قرار ہے
…تے سبزہ ہی سبزہ ہر اک جگہ — تا نگاہ کیا ہے زمرد کا تار ہے
…ے وُہ طبیعتِ موزوں بہار میں — گاتا ہر ایک پرند مثالِ ہزار ہے
…ل و زمرد سبزہ ہیں کہ رہے — کلکِ بہار بسکہ جواہر نگار ہے
…چمن میں سبزہ و گل جو کوئی کہے — معشوقِ باغ سبزہ خط و گلعذار ہے
…سم بہار جنوں خیز بیخودی — ق جوشے ہے بے قرار ہے بے اختیار ہے
…ہے جھومتے ہیں شجر کوہ و دشت میں — جوشِ جنوں سے دامنِ گل تار تار ہے
…ہا کو زلفِ حسیناں کہوں نہ کیوں — مشکِ تتار صحنِ چمن کا غبار ہے

نیرنگ

ہمارا خُدا

ہمارا تمہارا جو ہے اک خُدا — وُہی ہے سزاوارِ حمد و ثنا
فنا سب کو اسکو بقائے دوام — وُہی تھا وُہی ہے وُہی ہو مدام
…نزا کار ہے وحدہٗ لاشریک — نہ اس کا مماثل نہ اُس کا شریک
…اسی نے جلائے دلوں کے چراغ — اُسی نے کھلائے دماغوں کے باغ
…اسی سے ملی ہم کو عقلِ سلیم — کیا اُس نے ہم کو ادیب و حکیم
…اسی نے دیا آنکھ کو ہے یہ نور — اُسی کا ہے رُوح و رواں میں ظہور

اُسی سے ملی ہم کو ہر آگہی اُسی سے ہے رکھتا بشر آگہی
اُسی کا ہے پھیلا ہوا سب یہ نور ہے جُوں شمع ہر سمت اس کا ظہور
جہاں تک کیا عقلِ انساں نے کام دلیلوں سے اُس نے بنا دی نظام
مگر عقل کا کام اس میں نہیں نہ صانع کو صنعت بتائے کہیں
ہے جس طرح سے ہم میں اک ایسی شے کہ وُہ جانتی دیکھتی سُنتی ہے
اِسی طرح اِک رُوحِ اعظم تمام ہے ہر جزو اور کل کی دانائے عام
حکیم و علیم اور دانا ہے وُہ سمیع و بصیر و توانا ہے وُہ
وُہی ہر زباں میں نمودار ہے خُدا ۔ گاڈ ۔ اللہ ۔ نرا کار ہے

(اشہری)

تازہ غزلیں

کُشادہ دستِ کرم جب وُہ بے نیاز کرے نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
بٹھا کے عرش پہ رکھا ہی تو نے اے واعظ خُدا وُہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
اثر غضب کا دُعائے قدح میں ہے ساقی کوئی اِسے بھی ذرا داخلِ نماز کرے
جواب ملتا ہے لَوْلَاکَ مَا عَرَفْنَا کا کوئی جو عجز کے دہن کو یاں دراز کرے
پرانے کفر کو تازہ کروں یہ کہہ کہہ کر مدینہ وُہ ہے کہ کعبہ جدھر نماز کرے
مری نگاہ میں وُہ رند ہی نہیں ساقی جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے
مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

شعاعِ نور کو تاریکیِ جہاں میں نہ ڈھونڈ — یہی ہے شمع اگر دل کو تو گداز کرے
نہیں ہے فرق محبت میں اور غلامی میں — یہ عشق وہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے
سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے — یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے
تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل — جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے
غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو — کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اقبال

مصوری کا تصور سے کام لیتے ہیں — نظر میں ہوتا ہے ہم جسکا نام لیتے ہیں
ہر ایک صبح کو خمخانۂ کرم سے ترے — لنگوٹے ہاتھوں میں گلرنگ جام لیتے ہیں
ملی پلک سے پلک لڑتے ہی نظر سے نظر — بلا نشہ اور یہ یوں مے کا جام لیتے ہیں
کہاں ہے عالمِ پیری میں شغلِ میخواری — فقط دوا کی طرح صبح و شام لیتے ہیں
مثالِ ساغرِ مے ہیں وہ لوگ سرگرداں — جو سر پہ بارِ رفا و انام لیتے ہیں
کریم زور دکھاتے ہیں دستگیری میں — ہمیشہ گرتے ہوؤں کو یہ تھام لیتے ہیں
بلا کا ہے ترے عشاق میں ثباتِ قدم — پہاڑ رنج و مصیبت کے تھام لیتے ہیں
بھرینگے خمکدۂ دل مئے تولا سے — یہ بادہ ہم سے شربِ دوام لیتے ہیں
جگر پہ دیتے ہیں تیغِ نظر کا اک چرکا — اشارہ سے جو کبھی وہ سلام لیتے ہیں
ادب سے کہتے ہیں روشِ نگاہِ ناز و ادا — وہ اپنے عاشقوں کا جب سلام لیتے ہیں

حبیب۔ لا دُر و لعلِ گرانبہائے سخن
پسند کرکے حضور نظام لیتے ہیں

حبیب

دل ہی میں لیچلے صبا دل کی اس آرزو کو ہم — دے نہ سکے پیام کچھ طرۂ مشکبو کو ہم
مطلب دل تو ہیں بہت چپ نہ رہیں تو کیا کریں — لائیں زباں کہاں سے آہ آپ سے گفتگو کو ہم
انکے پیام پر وثوق ہے تو ہمیں بہت مگر — روک رکھیں کہاں تلک جان بہانہ جو کو ہم
اشک بھر آئے جس جگہ اٹھ گئے اس مقام سے — آج تلک بچائے ہیں عشق کی آبرو کو ہم
سینۂ تنگ ہو گیا دامن وحشت سے فزوں — دل میں بہت لئے رہے عشق کی ہاؤ ہو کو ہم
روئیں جب اپنے حال پر تب کہیں ہو ادا اپنا — ہو نہ مری نماز اگر ترک کریں وضو کو ہم
بلبل و گل کی چشمکیں اپنی طرف ہیں باغ میں — لائیں کہاں سے اس گھڑی نرگس فتنہ خو کو ہم

شاد بہت ہیں غلغلئیں بزم میں اہل بزم کو
دینگے یہی غزل کسی مطرب خوش گلو کو ہم

شاد

دل لگانا کوئی آفت ہی سہی — اب تو جھیلینگے مصیبت ہی سہی
کب کہا میں نے کہ دل سے چاہو — اسے وہ منہ دیکھے کی الفت ہی سہی
مردہ منتظر حشر ہوں میں — آپ کا نام قیامت ہی سہی
میں بھی ہوں عشق میں رسوائے جہاں — حسن میں آپ کی شہرت ہی سہی
ہے مسافر کو نگہ بھی کافی — نہیں الفت تو مروت ہی سہی
مجھ سے ہو انس تو احساں کیجے — غیر سے آپ کو نفرت ہی سہی
ہم بھی یاد آئینگے سر چڑھ کے کبھی — بھول جانا تری عادت ہی سہی

کچھ تو لایا ترے در سے نیرنگ
آخری دید کی حسرت ہی سہی

نیرنگ

کسی بیگانہ خو سے آشنائی ہوتی جاتی ہے / زمانے بھر سے پیدا اک لڑائی ہوتی جاتی ہے

سرورِ وصل کی مہمانیوں کے اب تو ساماں ہیں / الم ہائے جدائی سے جدائی ہوتی جاتی ہے

وفورِ شوق کا امید سے پیمانِ الفت ہے / ہجوم یاس سے ناآشنائی ہوتی جاتی ہے

نگاہِ ناز از خود مائلِ عاشق نوازی ہے / مبارک میری قسمت آزمائی ہوتی جاتی ہے

مکدر تھے وہ اک عالم سے لیکن میری قسمت سے / کدورت مٹتی جاتی ہے صفائی ہوتی جاتی ہے

محبت جس سے بیگانے تھے وہ اب اسکی اپنی ہیں / عداوت اُن کی اپنی تھی پرائی ہوتی جاتی ہے

رہ و رسمِ وفا کے جان و دل سے اب وہ شیدا ہیں / جفا کافور رخصت بیوفائی ہوتی جاتی ہے

برائی سے وہ سب پیش آتے تھے زمانے میں / برائی وہ مرے حق میں بھلائی ہوتی جاتی ہے

وہ کل تک اچھے اچھے جسکی نظروں میں نہ جچتے تھے / اسی کے دل میں آج اپنی سمائی ہوتی جاتی ہے

جہاں پابندی رسمِ زمانہ حد سے بڑھ کر تھی / وہاں دامِ تکلف سے رہائی ہوتی جاتی ہے

وہ اک دن تھا کہ مجھ سے بات کرتے وہ جھجکتے تھے / یہ اک دن ہے کہ ہر دم ہاتھا پائی ہوتی جاتی ہے

رکھتے ہیں جو سوزِ قومی دلفگاروں کی طرح / قوم پر دیتے ہیں جاں وہ جاں نثاروں کی طرح

کچھ کبھی اپنے سے بیگانے سے اتراتے نہیں / ملتے ہیں ہر ایک سو آمیزگاروں کی طرح

روکتے حکمت سے ہیں وہ اُن شریروں کو مدام / جو اچھلتے پھرتے ہیں ہر سو شراروں کی طرح

دوستوں کو انکے صدموں سے بچاتے ہیں سدا / دشمنوں میں رہتے ہیں وہ دوستداروں کی طرح

اس جہاں میں ہیں عزیز اور اُس جہاں میں سرخرو / جو رہے دنیا میں دائم دینداروں کی طرح

جن میں وسعت تو نہیں بھرتی ہیں پر وسعت کا دم / شہسواروں میں ہیں ملتے نے سواروں کی طرح

رو دینگے شبنم کی صورت لالہ ساں گل کھاکے داغ / آج ہنستے ہیں کسی پر جو اناروں کی طرح

اب تو ہم زائر بنے ہیں انکے جب مر جائینگے / قبر اپنی بھی بنے گی ان مزاروں کی طرح

طرح حالی پر غزل لکھی بدل کر قافیہ
دیکھ لو مضطر نہ دیکھی ہو جو یارو کی طرح

عبداللہ بیگ مضطر دہلوی

منتخباتِ سالک

حُسنِ ملیح عارضِ جاناں پہ خط کہاں ۔۔۔ روئیدگی ذرا نہ ہو نکلے جہاں نمک
شکل ملیح دوست ہے سالک خیال میں ۔۔۔ گفتار سے نکیونکہ ہو مسری عیاں نمک

کیا ایسی چیز ہے کہ کہیں ہم نہ جائے دل ۔۔۔ جائے پر اس طرح کہ کسی پر نہ آئے دل
آواز بیٹھ جائے تو مجبور ورنہ ہم ۔۔۔ کرتے رہینگے بیٹھے ہُوئے ہائے ہائے دل
ہم اور اُسکو دیکھ سکیں بزمِ غیر میں ۔۔۔ سالک ابھی تو دیکھئے کیا کیا دکھائے دل

مجھ سے خود رفتہ کو کیا لذّتِ وصلِ جاناں ۔۔۔ وُہ جو آئیں تو بھی ہے آپ میں آنا مشکل
کھو دیا کرتے ہیں عشّاق اسی طور سے جاں ۔۔۔ تم نے پروانے کے جل جانے کو جانا مشکل
کس سیاہی سے خدا جانے لکھا کرتے ہیں ۔۔۔ خطِ تقدیر جبیں سے ہے مٹانا مشکل
کام سالک نکل آتا ہے وُہ نادانوں سے ۔۔۔ جان لیتے ہیں جسے مردمِ دانا مشکل

مایوس و نا امید ہیں کیا مُدعا سے ہم ۔۔۔ کہتے ہیں اور کہتے ہیں کس التجا سے ہم
ہے حسرتِ پیام تو رشکِ پیام بھی ۔۔۔ خط دیکے پھیر لیتے ہیں بادِ صبا سے ہم

کاش اے سپہر تجھ سے ہی کہتے تو سہل تھیں ۔ وُہ خواہشیں جو رکھتے ہیں اُس بیوفا سے ہم
ہے چارہ گر کو لاف مداوائے دردِ عشق ۔ مُنہہ پر تو کچھ بھی کہہ نہیں سکتے حیا سے ہم
کہتے رقیب ہی کی طرح سے تو مانتے ۔ عرضِ وصال کرتے ہیں کیوں التجا سے ہم

آخر تو لائینگے کوئی آفت فغاں سے ہم ۔ حُجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم
تم آگئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون ۔ آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم
یہ جستجو ہے یار کی خودرفتگی نہیں ۔ کیا جانے کتنی دُور گئے اس جہاں سے ہم
بے اختیار رازِ نہاں اُن سے کہدیا ۔ مجبُور آپ ہوگئے اپنی زباں سے ہم
یہاں جس کی جستجو ہے وُہ منزل ہی اَور ہے ۔ ملتے نہیں ہیں جان کے خود کارواں سے ہم

سر جُھکا کر بند کر لیتے ہیں آنکھ ۔ ڈھونڈتے ہیں کس گلی کی راہ ہم
دشتِ اُلفت کو گئے بیٹھے ہیں طے ۔ نام کو ہیں سالکِ گمراہ ہم

حُسن کی کس شے میں یکتائی نہیں ۔ واہیں یُوں آنکھیں کہ بینائی نہیں
تُو ہمارے ساتھ ہے ہر حال میں ۔ ہم کو خلوت میں بھی تنہائی نہیں
کب ہوئیں آنکھیں تصوّر میں بھی بند ۔ کب تری صُورت نظر آئی نہیں
نُورِ ذاتِ کبریا ہر شے میں ہے ۔ کس صفت میں جلوہ آرائی نہیں
بند تھیں آنکھیں تو کچھ پردہ نہ تھا ۔ کُھل گئیں آنکھیں تو بینائی نہیں

دیکھنے میں آئینے کے مجھ کو بھی کرلو شریک ۔ کیا مزا آتا ہے تم کو دیکھکر تنہا بہار

انتخاب لاجواب کیوں اسقدر ہر دلعزیز ہو گیا ہے؟

اوّل یہ کہ اس قسم کے دلچسپ اور مفید لائٹ لٹریچر کا ایک بھی رسالہ اُردو زبان میں شائع نہیں ہوتا۔

دوم یہ کہ باوجودیکہ یہ ہفتہ وار ہے۔ اسکے دلچسپ مضامین کی مجموعی مقدار ماہوار رسالوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

سوم۔ یہ کہ اس کے مضامین ٹھوس طویل بھدّے اور مشکل نہیں ہوتے۔ بلکہ نہایت سہل پُرمذاق دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں اور اسی لئے ہر پرچہ میں بیسیوں مختلف مضامین ہوتے ہیں۔

چہارم یہ کہ اس میں آجتک پندرہ بیس اعلیٰ درجہ کے دلچسپ سلسلہ وار ناول انگریزی۔ ترکی۔ فرانسیسی۔ بنگالی و ہندی وغیرہ زبانوں سے ترجمہ ہو کر اور طبع زاد بھی چھپ چکے ہیں۔ اتنے ناول آج تک کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں نہیں چھپے ہونگے۔

پنجم یہ کہ اس میں مشاہیر عہد کا ایک عظیم الشان باتصویر سلسلہ چھپا ہے کہ جس میں آج تک ہندوستان اور دنیا کے ۲۶۰ مشہور لوگوں کے حالات اور تصویریں چھپ چکی ہیں۔ کیا صرف یہی سلسلہ بجائے خود اس پرچہ کو نہایت دلچسپ اور مفید بنانے کیلئے کافی نہیں ہے۔

اگر مخزن کے اِس صفحہ میں زیادہ گنجائش ہوتی تو ناظرین کو بتلایا جاتا کہ انتخاب کے اس قدر ہر دلعزیز ہونے کی چھٹی یا ساتویں یا آٹھویں۔ نویں اور دسویں وجہ کیا ہے لیکن مجبورًا اسکو یہاں ختم کر کے باقی وجوہات معلوم کرنے کے لیئے آپ کو انتخاب کا پرچہ منگانے کی سفارش کی جاتی ہے۔ جو آپ کے لکھنے پر مفت نذر ہوگا+

منیجر انتخاب لاجواب لاہور

[illegible]

جوہر تحقیقات

قیمت فی جلد [illegible]

تمام مسائل مذہبی - اخلاقی - ملکی وغیرہ کا فیصلہ قطعی بدلائل معقول و منقول جیسا اس کتاب میں ہی ویسا آج تک دیکھنے و سننے میں نہیں آیا۔ مشتے نمونہ فہرست مضامین یہ ہی :-

باب اوّل

ہندوؤں کے تمام عقائد و رسمیات کی حمایت و صداقت

(۱) خدا کی ہستی کا ثبوت و اوصاف عبادت سے فائدہ و بہترین طریقہ

(۲) پیغمبر و اوتار کی بحث معجزوں کی پڑتال - اوتاروں کے اصل معنی

(۳) الہام کی ضرورت - حق کی شناخت - وید - قرآن - بائبل وغیرہ کا مقابلہ -

(۴) تناسخ :- ارواح کا مسئلہ تناسخ کے قابل ہی یا نہیں بحث ہر پہلو پر

(۵) قیامت و پیدائش کی نسبت ہر مذہب کے خیالات و حقیقت

(۶) محبت پرستی گناہ ہی یا ثواب - اس کے فائدے و نقصان - قدرتی میلان -

(۷) دیوتا - جانور - درختوں کی پوجا - سورج کو جل چڑھانا - ہون کرنا وغیرہ -

(۸) تیرتھ - بت - میلے - تہوار - گنگا اشنان - کتھا کا پھل

(۹) شرادھ - مُردہ جلانا - دشوتن وغیرہ اصول و فلسفی دقائق و علمی باریکیاں -

(۱۰) چوٹی - جنیئو - تلک - گرہن - مہورت - جنم پتر - جوتش - تقدیر تدبیر وغیرہ -

(۱۱) گوشت خوری - ذات پات - پنچایت - فرقہ - جانکٹ فیصلی

(۱۲) گاؤ و برہمن - خیرات ہر کام میں - اتنی گرو - پرہت وغیرہ

(۱۳) ناستک - انگلستان کے فری تھنکروں کی حجتوں کے جواب لاجواب - ہر اعتراض کا کاٹ -

(۱۴) عالموں کی جدید تحقیقاتیں - تمام شاستر اور عقل کا نچوڑ - فلسفہ کا عجیب استعمال نئی طرز پر -

باب دوم

آجکل ہندوؤں کی حالت - اصلیت سے بہک کر دور نکل گئے ہر بات کے معنے بدل ڈالی الٹی سمجھ اور اندھیر نے اصول کی گری اندرونی بھید کی باتیں - ہر ایک رسم کا خاکہ ذکر کی چوٹ - ہر صفحہ عبرت خیز واقعات سے پُر ہی - تمام خوبیوں کی جگہ خرابیاں دکھائی ہیں - خبردار - کیا ہندو مذہب دنیا میں قائم رہ سکتا ہی -

باب سوم

مذہب کی ضرورت - تعصب سے فائدہ - ہماشن و مذہبی مباحثہ کی حد مناسب - علم و عقل و مذہب کا اتفاق - انتظام سوسائٹی - دین و دنیا کا لگاؤ - مذہبوں کی ایجاد - مذہب و خدا کے نام پر ظلم و بے ایمانی کی عنایت - دوسروں کو سمجھانیکا حق - مذہب بدلنے سے فائدہ اور نقصان - موجودہ مذاہب کی خوبیاں خرابیاں - اور انکا باہم موازنہ - رفاہ عام کے قواعد - نیشنل فوائد کی حفاظت - ہر دو اور ہندو مذہب کا برادرانہ تعلق - ہندو مسلمانوں کا نفاق بے دھڑک کی سی عقلمندی کی نادانی - گاؤ کشی و میلوں پر جھگڑا و دنگہ تصفیہ جائز و اختیاری - آریہ سماج و دھرم سبھا وغیرہ کی فقیہ نزی تعلیم نسواں - پردہ - شادی بیاہ کان - قواعد برادری - طریق خیرات پر آنا و کانزائو - انگریزی حکومت و تمدن کی شکایات اور اسکی برکتیں - غذائی جکڑ پٹی کا ہتھیار -

باب چہارم

اور ضمیمہ علیحدہ - سستی کے مستند شیوں کو لئے آخری اصول یہ سب سچا اور اچھا عالمگیر قدرتی مذہب کیا ہی - اب ہم کو کیا کرنا چاہئے ہماری تمام شکایتوں و مصیبتوں کا علاج ہمارے ہاتھ میں ہی اور بہت سہل و ترقی قوم کی

اس کتاب کے ملنے کا پتہ :- بابو سیارے لال مینیجر پربودھ - ودیا ساگر دفتر - علیگڈھ

پنڈت ہیمراج وید وشارد سب ایڈیٹر بھارت بھگنی پترکا کا ویدک اوشدھالیہ بسرپرستی مسٹر روشن لال صاحب بی۔ اے بیرسٹر

ایٹ لا لوہاری منڈی لاہور

معزز صاحبان امرت ادویات کے اشتہارات دینے والوں نے کوئی الفاظ اس قسم کے نہیں چھوڑے جنکو لکھ کر ایک سچا آدمی اپنی سچائی کو ظاہر کرے۔ اسلئے ہم بالکل سادہ اور مختصر الفاظ میں عرض کرتے ہیں۔ کہ آپ مہربانی کر کے ہماری ادویات کا پہلے نمونہ منگا کر تجربہ کریں۔ ہماری تحریر کے مطابق ہوں۔ تو دوائی منگوائیں ورنہ جانے دیں۔

نین امرت روغن ۔ یہ روغن آنکھوں کے جملہ امراض مثلاً جالا۔ دھند۔ غبار۔ موتیابند۔ ککرے۔ پانی کا نکلنا۔ سرخی۔ جلن وغیرہ کو چند روز کے استعمال سے بیخکنی کر دیتا ہے اگر چھ ماہ تک مطابق ہماری ہدایت کے استعمال کیا جاوے تو عینک کی حاجت نہ ہوگی۔ قیمت فی شیشی جو ایک سال کے لئے کافی ہوگی صرف عہ سوا محصول ڈاک وغیرہ نمونہ ۲ آنہ۔ دو شیشی اکٹھی منگوانے پر معہ محصول ڈاک صرف دو روپے +

خان بہادر جناب ڈاکٹر سید امیر شاہ صاحب ایل۔ ایم۔ ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور تصدیق کرتے ہیں کہ پنڈت ہیمراج وید کے تیار کردہ نین امرت تیل کو میں نے (پیوٹا وغیرہ) اور آنکھوں کے گرد دیں استعمال کیا اور اسکو مفید پایا۔

پنڈت شیو دت صاحب شرما مہامہوپادھیائے ہیڈ پروفیسر سنسکرت سپرنٹنڈنٹ سنسکرت ڈیپارٹمنٹ اورینٹل کالج لاہور یونیورسٹی پنجاب:۔ میں نے پنڈت ہیمراج وید وشارد کے تیار شدہ موم کے تیل اور نین امرت تیل کی پریکٹس کی۔ موم کے تیل کی ایک دفعہ کی مالش سے میرے انگوٹھے کا درد دور ہو گیا۔ درد دور کرنے کے لئے یہ ایک عجیب دوا ہے۔ نین امرت تیل کی تعریف ہو نہیں سکتی۔ ہم یاستے ہیں آنکھوں کی ہر ایک بیماری کو دور کر کے بینائی کی طاقت کو بڑھاتا ہے۔

مولوی عبدالحکیم صاحب شمس العلماء پروفیسر سپرنٹنڈنٹ پرشین ڈیپارٹمنٹ اورینٹل کالج و فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کلانور ضلع گورداسپور کے پنڈت ہیمراج صاحب کا نین امرت روغن کا تجربہ کیا گیا جن اشخاص کو یہ دوائی دی گئی پنڈت صاحب کے ثناخواں ہیں اور مجھ کو اپنے خاص تجربہ سے عیاں ہو گیا کہ یہ دوائی ضعف بصارت۔ تاریکی چشم۔ دھند۔ آنکھوں سے پانی جانا وغیرہ امراض چشم کے لئے نہایت مفید ہے +

مولوی مفتی محمد عبداللہ شمس العلماء ہیڈ مولوی و سپرنٹنڈنٹ اورینٹل کالج لاہور فیلو پنجاب یونیورسٹی و پریذیڈنٹ انجمن اسلامیہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ نین امرت تیل آنکھوں کے لئے مفید دوا ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ لوگ اس کے استعمال کرنے پر میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔ اس لئے میں پبلک سے اس سے فائدہ اٹھانے کی سفارش کرتا ہوں۔

پنڈت ہیرانند صاحب شاستری ایم۔ اے میکلوڈ سنسکرت ریڈر پنجاب یونیورسٹی و سنسکرت پروفیسر اورینٹل کالج گورنمنٹ و دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور:۔ میں پنڈت ہیمراج وید وشارد کو بخوبی جانتا ہوں۔ وہ سچے ایماندار اور محنتی نوجوان ہیں۔ انہوں نے بہت تیاری کر کے اپنے سنسکرت چکتساؤں کو پڑھ کر اپنا دوائی خانہ کھولا ہے جسمیں چند بہت مفید ادویات تیار کی ہیں۔ میں نے نین امرت روغن کا استعمال کرتا ہوں یہ آنکھوں کے لئے نہایت ہی عمدہ دوا ہے۔ اسلئے میں اس روغن و نیز مصطگی سومی کے تیل کی جو میرے تجربہ میں آ چکی ہے پبلک کی فلاح کے لئے بہت زور سے سفارش کرتا ہوں +

عرقِ ماء اللحم انگوری

اور

درازیٔ عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاق حسنہ سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعف دماغ اور تاریکی چشم۔ سر کا گھومنا چکرانا تھوڑی سی کام سے دل گھبرانا جس روز دو چار گھنٹہ بیٹھ کر کام کرنا پڑے۔ سر درد ہو جانا بھوک کا بند ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگنا اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملے تو صبح کو کوفت اعضا کی معلوم ہونا چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہنا۔ ایک صاحب نے عرق ماء اللحم کا استعمال شروع کیا اور دوسرے صاحب مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ سرخ و سفید ہو گیا اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو پچکے ہوئے تھے پر ہو کر رنگت چمکنے لگا تو دوسرے مختلف دوائیں کھانے والے نے دوست سے تعجب سے پوچھا یار کیا بات ہے تم تو چار بجے کے بعد چھ ساڑھے چھ بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر ہوا خوری کے لئے تیار۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں عرق ماء اللحم انگوری دوا ایجاد ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ صبر نہ کر سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیج دو۔

اب ان دونوں کلکٹروں کا سارٹیفکیٹ ملاحظہ کیجیے جب ڈسٹرکٹ سول سرجن اور دو دیگر معزز حکام کا علاج کیا اور ناکامیاب ہوا دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ آٹھ آنہ کا ٹکٹ بھیجئے یہ سارٹیفکیٹ صحت یافتہ کا بھیج دونگا قیمت فی بوتل ۲ تین بوتل ۵ چھ بوتل ۱۰ فی درجن ۱۸ مزید [illegible] کی کفالت ہوگی [illegible]

حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہوری موچی دروازہ (اعلان شرائط)

مخزن

ایک مشرقی مغرب میں

(از شیخ عبد القادر)

پیارے مخزن! ہر چند میں تجھ سے دُور ہوں - مگر تجھ سے جُدا نہیں - وُہ حسرت آلود نگاہیں جو وقتِ رخصت میری طرف اُٹھی تھیں - اور وُہ لبِ خاموش جس سے تُو نے یہ کہا تھا - کہ اب ہمیں کس کو سونپے جاتے ہو - مجھے خُوب یاد ہیں - میں نے چلتے چلتے تیری تسلّی کے لئے دو تین وعدے کئے تھے - ایک تو یہ کہ خدمتِ ترتیبِ مضامین سے بُعدِ مکانی مجھے سبکدوش نہ کریگا - دُوسرے یہ کہ باقاعدہ مضمون نگاری کا فرض میرے معمولی فرائض پر ایک اضافہ ہو جائیگا اور تیسرے یہ کہ میں تجھے ماہوار اپنے سفر کے حالات لکھتا رہونگا - ان تینوں وعدوں کا میں پابند ہوں اور بشرطِ خیریت رہونگا - تیری محبت میرے دل میں ہے - اور رہیگی - ویسے تو تیرے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور ہوتا جاتا ہے - اور میری خدمتگذاری کچھ تیری زیست کے لئے لازم نہیں - بہت سے دوست ہیں جو تیری حالت کو سنبھال سکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو مجھ سے بہتر اس فرض کو انجام دے سکتے ہیں - مگر یہ تیرا احسان ہے کہ تو حقِ دیرینہ کے لحاظ سے مجھے بھی مصروفِ خدمت رکھنا چاہتا ہے - مگر بے تکلف برطرف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کو جو تین وعدے تو نے مجھ سے لئے

انمیں سے پہلے دو کی تو تعمیل آسان ہے۔ مگر حالاتِ سفر کی جو بیخ لگادی ہے۔ اسکا نباہنا ذرا مشکل ہے۔

سفرِ یورپ بالعموم اور سفرِ انگلستان بالخصوص اِندنوں ایک ایسی معمولی بات ہوگئی ہے۔ اور ہمارے ابنائے وطن میں سے اتنے لوگ اب آئے دِن اس منزل کو طے کرتے ہیں۔ کہ اس کے حالات کا بیان ایک پیشِ پا اُفتادہ مضمون بنگیا ہے اب کوئی ایسی نئی باتیں کہاں سے ڈھونڈھ کے لائے۔ جنہیں پڑھ کر اہلِ ہندوستان محظوظ اور مستفید ہوں اور یہ نہ کہیں کہ وُہی داستانِ کہن جو سو بار پڑھ چکے ہیں۔ دُہرائی جارہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک معمولی روزنامچے یا سفرنامے میں نیا رنگ بھرنا تو قریب محال ہے۔ لیکن اگر کوئی اِن چیزوں کی معمولی روِش سے جُدا ہو کر چلے۔ اور بجائے یہ قلمبند کرنے کے کہ آج فلاں مقام پر پہنچے اور کل فلاں مقام پر ہونگے۔ یا آج بیمار ہوگئے اور کل تندرست تھے۔ یا آج گرمی نے ستایا اور کل جاڑا بہت پڑا تھا۔ اپنی ذاتی قوتِ مشاہدہ سے کام لے۔ تو اب بھی اِس معمولی سفر میں بہت کچھ رکھا ہے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اور سب کچھ جانے دو۔ آدمی مغرب کو مشرقی آنکھ سے دیکھے۔ تو جیتے جیتے پر نگاہ رُکتی ہے۔ اور تفاوت نظر آتا ہے۔ یہی ایک میدان اتنا وسیع ہے۔ کہ عمر بھر اسمیں اشہبِ خیال دوڑایا کرے۔ اور نتیجے نکالتا رہے۔ کون سی چیز مغرب کی اچھی اور قابلِ تقلید ہے اور کون سی بات مشرق کی بہتر ہے اور قابلِ نگہداشت۔ ہمارے اکثر بھائی جو ایشیائی ممالک سے اِدھر آتے ہیں۔ وہ اس اصُول پر کاربند ہوتے ہیں۔ کہ یہاں کے نظارے یہیں کی عینک لگا کر دیکھنے چاہئیں۔ اس لئے سب سے پہلے وہ اپنے آپ کو یہاں کے رنگ میں پُوری طرح رنگ لیتے ہیں۔ اور پھر سیر

شروع کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مغرب کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اور اس کے خیالات اور عادات کی تہ کو پہنچنے کے لئے یہ طریق زیادہ مفید ہو۔ مگر اپنی اپنی پسند ہے۔ میں تو پہلے طریق کا زیادہ قائل ہوں اور ایک دم بھر کے لئے اِس خیال کو جدا نہیں کر سکتا۔ کہ میں مشرقی ہوں۔ میرا گوشت۔ پوست۔ استخوان سب مشرقی آب و ہوا میں نشو و نما پائے ہوئے ہیں۔ چال ڈھال میں مشرق کا رنگ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دماغ مشرقی تربیت کے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ اب میں کوئی دوسری عینک چڑھا بھی لوں۔ تو درست کہاں بیٹھتی ہے۔

مشرق اور مغرب کا تفاوت وطن سے نکلتے ہی نظر آنے لگتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بالعموم بمبئی باب لنڈن ہے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہوتے ہی جونہی کسی نے مغرب کی طرف رخ کیا۔ وہ اسکی حد اثر میں آگیا۔ جہاز کیا ہے۔ ایک شہر رواں ہے مغربی دنیا کا ایک چھوٹا سا قصبہ جس میں ہزار پانسو زن و مرد بستے ہوں۔ فرض کیجئے کہ کسی نے اسکو پہیئے لگا دیئے ہیں اور وہ چل رہا ہے۔ خدا جانے ہمارے ملک میں ہزار میں کتنے آدمی ایسے نکلینگے جنکے ذہن میں کوئی صحیح اندازہ جہاز کی کیفیت کا موجود ہو۔ جو لوگ بحری سفر کر آئے ہیں۔ اور جن کی تعداد بمقابلہ کروڑوں کی آبادی کے بالکل قلیل ہے۔ انکو چھوڑ کر۔ میرا خیال ہے کہ بمشکل ہزار میں دو تین آدمی ایسے ہونگے۔ جنہیں معلوم ہے کہ آج کل کا ایک دخانی جہاز کس قدر وزن دار۔ کتنی گنجایش والا کتنی آسایش والا اور سوائے خاص حوادث کے جو خشکی اور تری دونو جگہ یکساں ممکن ہیں۔ کتنا محفوظ ہوتا ہے۔ اگر یہ بات عام طور پر معلوم ہو۔ تو یقیناً وہ خوف و خطر جو لاکھوں دلوں میں سفرِ بحری کے متعلق جاگزین ہے۔ بالکل دُور ہو جائے۔ اور کوئی شخص اپنے عزیز کو سفرِ بحری کے لئے رخصت کرتے ہوئے۔ اس سے زیادہ متفکر نہ ہو۔ جتنا ریل کے ایک لمبے سفر کے لئے سوار کراتے وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت

جہاز کا سفر صرف احتمالِ علالتِ بحری کو چھوڑ کر (جو کبھی دو چار دن سے زیادہ نہیں ستاتی۔ اور ایک عُمدہ مسہل کا اثر رکھتی ہے) ریل کے سفر سے بدرجہا آرام کی چیز ہے۔ اور اگر حُسنِ اتفاق سے سمندر میں تموّج یا تلاطم نہ ہو۔ تو جہاز کا سفر۔ خصُوصًا اوّل دوئم درجے میں سفر کی مشابہت سے بالکل خارج ہو جاتا ہے۔ جہاز پر پہنچتے ہی افسرانِ جہاز مسافروں کی رہبری کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور انکو اپنے اپنے کمروں کی راہ بتاتے ہیں۔ ایک ایک کمرے میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین مسافروں کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ سفید گدیلے بچھے ہوتے ہیں۔ اُن پر تکیئے دھرے ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی نشست کے نیچے اُس کا اسباب حفاظت اور ترتیب سے رکھا ہوتا ہے۔ کیونکہ سوار ہونے سے پہلے اسباب جہاز والوں یا اُنکے ایجنٹوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ سوار ہونے کو آدمی آرام سے ہے۔ یک بینی و دو گوش یا بہت ہوا تو ایک چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لئے جاتا ہے۔ اسی کمرے میں ہاتھ مُنہہ دھونے کے لئے پانی۔ سلفچی۔ تولیا۔ صابون موجود رہتا ہے اور آرائش کے لئے آئینہ بھی حاضر ہوتا ہے۔ اس میں متمکن ہو گئے تو اختتامِ سفر تک نہ کہیں اسباب اٹھوانا نہ گاڑی بدلنا۔ نہ شور۔ نہ غُل۔ نہ چیخ پکار۔ اور یہ سب باتیں ریل میں جان کھاتی ہیں۔ متمکن ہونے کے بعد برآمدے میں نکل آؤ یا چھت پر چلے جاؤ۔ تو ہر شخص کی اپنی اپنی آرام کُرسی موجُود ہے۔ عام نشست کے لئے آراستہ کمرے موجُود ہیں کہیں چند آدمی بیٹھے گنجفہ کھیل رہے ہیں کہیں شطرنج۔ چھت پر ایک طرف لوگ ورزش کے لئے ٹہل رہے ہیں۔ دوسری طرف طرح طرح کے کھیل ہیں۔ یہانتک کہ گیند بلّا بھی۔ کھانے کی گھنٹی ہُوئی اور سب لوگ ایک وسیع ہال میں جمع ہُوئے۔ جس میں بیسیوں میزیں لگی ہیں۔ ان پر دسترخوان قرینے سے چُنے ہیں۔ پانی ہے۔ برف ہے۔ چاء ہے۔ میوے ہیں۔ قفلیاں ہیں۔ اور نفیس انگریزی کھانے ہیں۔

چار وغیرہ کے اوقات ملا کر دن رات میں پانچ دفعہ کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ بیٹھے ہُوئے کھا رہے ہیں۔ دوستوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ بولتے ہیں۔ اور سفر طے ہو رہا ہے۔ بعض اوقات تو اچھے جہاز میں ذرا سی جنبش بھی نہیں معلوم ہوتی۔ آدمی اچھی طرح لکھ سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ قلم کو لغزش ہو۔

اب اس سے زیادہ آرام کا سفر اور کیا ڈھونڈھتے ہو۔ ہمارے ہاں اکثر لوگ اپنے خیال میں جو جہاز کی تصویر کھینچتے ہیں۔ تو وہی پُرانے سندباد کے زمانے کے جہاز خیال میں لاتے ہیں۔ جو بادبانوں کے زور سے چلتے تھے اور جنکا ناخُدا آئے دن اپنے سر کے بالوں کو نوچتا اور اپنے گالوں کو پیٹتا تھا۔ اور چلّا کر کہتا تھا۔ اَے بھائیو۔ طُوفان کے آثار ہیں اور ابھی جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔ یا چٹانوں کے قریب آگیا اور اب ٹکر سے بچنا محال ہے۔ اِس مقابلہ سے میرا یہ مقصد نہیں۔ کہ مَیں اُن زمانہ قدیم کے جہاز رانوں کی قدر گھٹاؤں۔ میرے دل میں اُنکی نہایت تعظیم ہے۔ اگر وُہ نہ ہوتے تو نہ یہ اس زمانے کے عُمدہ اور محفوظ جہاز ہمیں نصیب ہوتے اور نہ کسی کو یہ سمندر کے راستے معلوم ہوتے۔ یہ اُنہیں کے کارنامے ہیں۔ کہ آج ہم اس آسانی سے سفرِ بحر کر سکتے ہیں۔ ہر فن میں موجد اور ابتدائی بُنیاد ڈالنے والے قابلِ شکریہ ہوتے ہیں۔ گو اُنکا کام بمقابلہ بعد کے ترقی یافتہ کام کے بے ڈول ہی ہو۔ مگر میرا یہ مطلب ہو۔ کہ اس سفر کی جو مشکلات تھیں اُن کا تو انہی جوانمرد اور باہمت دلیروں کے ساتھ خاتمہ ہوگیا اور اس زمانہ میں تو مسافر کے لئے یہی رہ گیا ہے کہ آنکھیں بند کرکے جہاز پر بیٹھ جائے۔ وہیں بیٹھا ہُوا آرام سے سویا کرے۔ کھاتا پیتا رہے ٹہلتا رہے۔ پڑھتا رہے۔ لکھتا رہے اور پندرھویں سولھویں دن ساحلِ یورپ پر جا پہنچے۔ ہم ۱۴- مئی ۱۹۰۴ء کو بمبئی سے چلے اور ۲۸- مئی کی صبح کو مارسیلز

تھے ۔ جہاں سے ریل نے ۲۴ گھنٹے میں لنڈن پہنچا دیا ۔ اب اگر اس سفر کو بھی
ہندوستان میں بڑا کمال سمجھیں اور اس کے مسافر کو یُوں رخصت کریں ۔ جیسے
کسی بڑے خطرہ میں ڈالتے ہیں ۔ تو ہمارے ہموطنوں کی مرضی ۔ سوائے اس کے
کہ دُنیا اُن کی پست ہمتی پر ہنسے اور کیا ہو سکتا ہے ۔ اور یہی وُہ بات ہے جس
میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب میں فرق نظر آتا ہے ۔ فرنگستان کے لوگ
ہوتے ہیں کہ خوش و خرّم ۔ ایک ایک دن کو جو سمندر پر گذرتا ہے ۔ اور جس میں
انہیں سمندر کی صاف اور رُوح افزا ہوا نصیب ہوتی ہے ۔ غنیمت جانتے ہیں
اور ایک نسخۂ صحت سمجھتے ہیں ۔ جسے فارغ رہنے ہنسنے کھیلنے اور آسان اور
دلچسپ کتابیں پڑھنے سے مدد دیجاتی ہے ۔ تاکہ جب کام کا وقت آئے تو اس وقت
کا آرام نفع بخشے ۔ مگر ہمارے ہموطن ۔ اگر جہاز پر ہوتے ہیں ۔ تو عمُوماً افسُردہ ۔
پریشان اور دن گنتے نظر آتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں ۔ کہ اس تفاوت کا ایک
سبب یہ بھی ہے کہ وُہ لوگ اپنے گھروں کو جا رہے ہوتے ہیں اور یہ اپنے گھروں
سے نکلے ہیں ۔ مگر اس وجہ کے اثر کو چھوڑ کر بھی بہت فرق باقی رہتا ہے ۔ جو
مشرقی اور مغربی طبائع کے اختلاف کا نتیجہ ہے ۔ ہمارے ساتھ کئی بیوپاری تھے ۔
جنہیں دیکھ کر مَیں بہت خوش ہُوا ۔ کہ اب ان لوگوں میں بھی اُبھرنے کی اُمنگ
پَیدا ہو چلی ۔ وُہ اپنے بیوپار کو بڑھانے کی غرض سے عازم سفر ہوئے تھے ۔ جب
چار پانچ دن جہاز پر بیٹھے اُنہیں ہو چکے ۔ تو اُن میں سے ایک کو مَیں نے دیکھا کہ
اُسے وحشت ہونے لگی ۔ بارہا چشم پُر آب ہو کر مجھ سے کہتا تھا ۔ گھر میں خدا کا دیا
سب کچھ تھا ۔ کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا ۔ مَیں نے تو مُفت میں یہ دردِ سر مول
لیا ۔ اپنا عافیت میں بیٹھا ہوا تھا ۔ اب کب تین چار مہینے ختم ہوں اور کب گھر جاؤں ۔
کسی اُستاد کے شعر میں ذرا سی مداخلت بیجا کیجائے تو ہمارے دوست کے عین

حسبِ حال تھا :-

اس کشمکش سے بحر کی کیا کام تھا ہمیں

اے جلبِ منفعت ترا خانہ خراب ہو

گھر چھوڑنا بیشک گراں گذرتا ہے۔ مگر جو قومیں دُنیا میں بنی ہیں اور پھلی پھُولی ہیں۔ اُنکی تاریخیں پڑھو اور غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی گھر گھُسنے پن سے ترقی نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان میں ایک کثیر حصّہ آبادی کا آریہ نسل سے ہے۔ اگر انکے آباؤ اجداد وسط ایشیا سے نقل مکانی نہ کرتے۔ اور اپنے جوہر دُوسرے ممالک میں اپنے سے کم شائستہ اقوام پر ظاہر نہ کرتے۔ تو جو نام اس نسل نے دُنیا کے مختلف حصّوں میں پیدا کیا ہے۔ اُس کا وجود بھی نہ ہوتا۔ جب ہندوستان کے آریوں نے اپنے آپ کو اسی ملک کی چار دیواری میں محدود کر لیا اور اس کے باہر خصُوصًا براہ سمندر جانا معیوب ٹھہرایا۔ تو گویا اُنہوں نے مستقل زوال کا پیش خیمہ نصب کر دیا اور آخر کار ہر حملہ آور کے جور و جفا کا تختۂ مشق رہ گئے۔ اُنہی کے یورپین بھائیوں نے ہمت اور سیر و سیاحت کو اپنا شعار بنایا اور وُہ کیا بذریعہ تجارت اور کیا بذریعہ فتوحات اطرافِ دنیا میں پھیل گئے۔ وُہ بھی ماؤں کے بیٹے ہی ہیں جو ہر سال انگلستان سے مصر۔ مغربی افریقہ۔ جنوبی افریقہ۔ ہندوستان۔ آسٹریلیا جزائر غرب الہند وغیرہ ممالک کی طرف لاکھوں نکلتے ہیں اور جن میں سے ہزاروں واپس نہیں آتے۔ مگر وُہ سب خواہ کسی کام میں مریں ایک معنی میں شُہدا قوم ہیں۔ کہ اپنی قوم کی عزت اور شُہرت قائم رکھنے اور اپنے آپ کو اس کے لائق افراد بنانے کا سودا سر میں لیکر جاتے ہیں اور یا اپنی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں یا اسی میں جان ہار دیتے ہیں۔ یہ ہوتے ہیں نشان بڑھنے والی قوموں کے اور یہ ہیں خیالات جن میں اہل مشرق کی روِش اہل مغرب سے جُدا ہے۔

جہاز کو عموماً راستے میں بہت تھوڑے تھوڑے وقت کے لئے صرف تین مقامات پر ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ عدن۔ سویز اور پورٹ سعید تینوں مقامات مشہور اور قابلِ دید ہیں۔ برا ہو اس طاعون کا کہ دریائے شور پر بھی یہ نہیں تو اس کا نام ہماری جان کا عذاب بنا رہتا ہے۔ دو جگہ تو مڈیکل معائنہ ہوا۔ اور اسی شبہ سے کہ کسی مسافر کے اندر وبا کے جرثوم نہ گھسے ہوں۔ اہلِ جہاز کو خشکی پر جانے اور بندرگاہ کی سیر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اب سوائے اس کے کہ دور سے ان مقامات کو دیکھتے۔ یا دوربینیں تختۂ جہاز پر بیٹھے لگایا کرتے۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس شوق میں بھی قدرتی طور پر مغربی لوگ مشرقی مسافروں سے بے انتہا بڑھے ہوئے تھے۔ وہ تو دوربینیں گلے میں لٹکائے پھرتے تھے اور ایک لمحہ بھر کے لئے اُن کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے۔ اور ہم تھے کہ ایک آدھ نظر دیکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ نہرِ سویز عجائباتِ دنیا میں سے ہے اور اس میں داخل ہوتے ہی عجب فضا کا سین ہے۔

پورٹ سعید تو رات کے وقت پہنچے۔ وہاں اگر اُترنا ملتا بھی تو اس وقت کون جاتا۔ بجلی کی روشنی نے بندرگاہ میں تو رات کو دن بنا رکھا تھا۔ اس بندرگاہ سے نکلکر گویا یورپ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور ہوا میں غیر معمولی خنکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ع

ٹھنڈی ٹھنڈی ترے کوچے سے ہوا آتی ہے

جبھی تو یہ گوری رنگت۔ یہ سنہرے بال۔ اور یہ بلوریں آنکھیں۔ پیدا ہوتی ہیں۔ جنھوں نے آج کل ایک زمانے کو مفتون بنا رکھا ہے اور جن پر خود ان بالوں والے اور ان آنکھوں والے اتنے نازاں ہیں۔ کہ انہیں اوروں کو اپنے جیسے انسان سمجھنے میں کلام ہے۔ ہاں جو لوگ اُن میں غور و فکر کی قابلیت رکھتے ہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ اصل وجہ فضیلت اُن کا علم وکمال ہے۔ نہ کہ رنگ و روغن۔ رنگ روغن نے سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے۔ مگر سونا وہی اُنکے عقلی جوہر ہیں۔ جنکی بدولت دُخان اور بجلی اور ہوا اور شعاعیں انسان کی خدمت میں لگا دی گئی ہیں۔ اور بہت سی قدرتی طاقتوں کو ایک حد تک مطیع فرمانِ انسانی بنا لیا ہے۔ یہ وہ جوہر ہیں جنکی تلاش میں مشرقی لوگوں کو یہاں آنا چاہیئے۔ ورنہ زُلف و چشم و بناگوش و خال کی اُنکے ہاں کیا کمی ہے۔ اِنسان فطرتاً جدت پسند ہے۔ مغرب کے لوگ مشرق میں کسی کی ملاحت کے شیدائی بنجاتے ہیں۔ اور مشرقی مغرب میں کسی کی صباحت کو دیکھ کر پھڑک جاتے ہیں۔ پھڑک جانا تو ایک طرف۔ وُہی انداز اپنے میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُس کا نتیجہ تو وُہی "کوّا چلا ہنس کی چال" ہی رہتا ہے۔

مارسیلز بھی اب بحری تجارت کا ایک بڑا مرکز بنگیا ہے۔ اور اس کے بندرگاہ میں اتنے جہاز پڑے رہتے ہیں۔ جنکا شمار کرنا آسان نہیں۔ ہر ایک پر اُس کی قوم کا جھنڈا لہراتا ہے۔ کوئی سواریاں لے چکا ہے۔ اور چلنے کو ہے۔ کوئی ابھی آ کے ٹھہرا ہے۔ کوئی دو تین دن سے آیا ہوا ہے اور سستا رہا ہے۔ کوئی زیرِ مرمت ہے اور درست کیا جا رہا ہے۔ کسی کے انتظار میں لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ جب ہمارا جہاز لنگر ڈالنے کو تھا۔ تو اُس کے سامنے کا پلیٹ فارم عورتوں مردوں اور بچوں سے پُر تھا۔ عورتیں اکثر سودا بیچنے والی تھیں۔ بہت سی تو پھولوں کے گلدستے لائی تھیں۔ کہ مسافر اُترتے ہی خرید لینگے۔ یا اُن کے دوست جو استقبال کو آئے ہونگے وُہ اُنکو تحفے دینگے۔ کچھ کھلونے لائی تھیں۔ کچھ اور چیزیں میوے وغیرہ۔ اُنکی مستعد رفیت کا یہ عالم تھا۔ کہ وقتِ انتظار سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے ہاتھ میں جرابیں وغیرہ بُننے کا کام لیئے

ہُوئے تھیں۔ مردوں میں کچھ تو مسافروں کے دوست احباب تھے اور کچھ مختلف کمپنیوں کے قائم مقام۔ ٹامس کک کے ایجنٹ۔ کنگ کمپنی کے ایجنٹ۔ گرنڈلے گروم کے ایجنٹ۔ اپنے اپنے مسافروں کا اسباب سنبھالنے۔ اُنکے ریل کے ٹکٹ درست کرانے اور انکو ہر طرح کی اطّلاع اور آسائش بہم پہنچانے کے لئے آمادہ تھے۔ یہاں یہ انتظام نہایت اعلیٰ اور مفید ہے۔ بچّے بالعموم مفلس لوگوں کے جمع تھے۔ جو بھیک مانگنے کو وہاں آئے تھے۔ اور گا گا کر منّتیں کرتے تھے۔ اور ٹوپی ہاتھ میں لیکر دستِ سوال پھیلاتے تھے۔ عام تموّل کے درمیان اس درجہ کے افلاس کا نظّارہ جو ہندوستان کے عام افلاس کی یاد تازہ کرتا تھا۔ دلخراش تھا۔ ہم نے گاڑی لی اور ایک سرسری نظر سے مارسیلز کے بازاروں اور اس کے گرد و نواح کو دیکھا۔ پیرس سے تو اُسے کوئی نسبت نہیں۔ مگر بجائے خود نہایت سُتھرا اور سیر حاصل شہر ہے۔ شام کو ریل میں سوار ہُوئے۔ چاندنی رات تھی اور باہر کی دُنیا کچھ نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ دو رویہ باغات ہیں جن میں سے ریل گذر رہی ہے۔ صبح کو جو اچھی طرح دیکھا تو معلوم ہوا کہ مُلک فرانس مارسیلز سے لیکر پیرس تک گویا ایک مسلسل بے نظیر باغ ہے۔ بلا مبالغہ ایک چپّہ بھر زمین نہیں نظر آئی۔ جو سرسبز نہ ہو۔ یا بوئی جوتی نہ جاچکی ہو (یہاں کی کاشتکاری کی تفصیل اخبار زمیندار کا حصّہ ہے۔ اگر موقعہ ملا تو وہاں مفصّل لکھونگا) پیرس ہوتے ہوئے ہم کیلے پہنچے اور وہاں سے پھر ایک چھوٹے سے جہاز پر سوار ہو کر گھنٹہ بھر میں ساحل انگلستان پر تھے۔ ڈوور سے ریل ملی۔ جس نے تین گھنٹے میں لنڈن پہنچا دیا۔ ۲۹ مئی کی رات لنڈن میں آئی۔ اب یہاں کچھ عرصہ کے لئے قیام ہوگا۔ اور مجھے بجائے سیر و سیاحت کی داستانوں کے مقامی تجربات اور مشاہدات کا حال سُنایا کرونگا۔ لو۔ اب خدا حافظ۔ ع پھر ملینگے اگر خدا لایا +

مشرقی

یہود سے بدسلوکی

یہود کا طبعی میلان کچھ خصوصیت سے تجارت کی طرف نہیں تھا - ابتدائی زمانہ میں گلہ بانی - کاشتکاری یا اور پیشوں میں مصروف رہے - جب سلطنت مقدونیہ کا ستارہ اوج پر ہوا - اور مختلف قوموں کے باہمی تعلقات بڑھ کر تجارت کا شوق ہر دل میں پیدا ہوگیا - اُسوقت البتہ یہودیوں نے بھی پر پرزے نکالے تاہم انکی تجارت محدود تھی - لیکن جب وُہ مختلف ملکوں میں نکالے گئے تو مجبوراً انہیں وُہ پیشے اختیار کرنے پڑے جو انکے آبائی پیشوں سے بالکل مختلف تھے - جن قوموں سے انہیں پالا پڑا اُنسے حسد کرتی تھیں اور انکو زمین کا مالک دیکھنا یا کسی اور معزز پیشے میں مصروف پانا انکی دلی جلن کا باعث ہوتا تھا اور وہ ہر قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے میں دریغ نہ کرتی تھیں - پس تجارت انہیں نہایت آسانی اور قدرت کے مطابق ذریعۂ معاش سُجھائی دیا - اور جب انہوں نے اِسے اختیار کرلیا تو اس میں انہیں ایک خاص مہارت اور ہوشیاری حاصل ہوتی گئی - انکی کامیابی نے ان میں ایک نئی طبیعت اور ایک نیا مادہ پیدا کر دیا - جو انکے اسلاف میں معدوم تھا - اس تجارت کے جوش نے انہیں مُلک مُلک میں پھیلا دیا - حتّٰی کہ جہاں دیکھو سود یہودہی نظر آتے تھے - سلطنت رُوم کے عہد زوال میں یورپ اور ایشیا کے درمیان جو کچھ تعلق تھا وُہ یہود ہی کی بدولت تھا -

اِس عجیب انقلاب کے بعد انہیں ایک نئے مذہب سے واسطہ پڑا - جو یونانی - رومی اور ٹیوٹن مذہبی خیالات سے بالکل پاک تھا - یہود کو یہ توقع تھی کہ نیا مذہب اسلام ان بمقابلہ اور قوموں کے بہتر سلوک کریگا - چنانچہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا - ایسے محر

شاذ ہیں کہ مُسلمانوں نے اُنپر ایسی سختی کی ہو جو اُس سختی سے زیادہ ہو جو انہیں نصاریٰ کے ہاتھوں سے پہنچی ورنہ عموماً مسلمان اُن سے نہایت شفقت سے برتاؤ کرتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود عرب میں - بابل میں - ٹرکی میں پھیل گئے - بڑے بڑے شہروں میں انکے محلّے کے محلّے آباد تھے - جابجا انکے مدارس تھے جہاں انکے مذہبی پیشوا لوگوں کے ہجوم کو اپنے جوشیلے مذہب کی تعلیم دیتے تھے - مُسلمانوں کے ساتھ ساتھ وُہ شمالی افریقہ میں پہنچے اور انہیں اپنی مقدرت کے موافق اسپین کی فتح میں کافی مدد دی -

مورز کی تہذیب کی روشنی پھیلنی شروع ہُوئی - جس نے مغرب میں فلسفہ کی چنگاری کو منوّر کر دیا - ہنرور اور پیشہ ور گروہوں سے شہر آباد ہو گئے - شاعری جس نے اخلاق و اطوار کی اصلاح کی - گھر گھر پھیل گئی - بہت سے سائنس کے مسائل دریافت ہوئے - یہ وُہ زمانہ تھا جب عیسائی ملکوں میں جہالت کی تاریک رات چھائی ہُوئی تھی یہود کے لیئے یہ زمانہ ترقی کے واسطے خاص تھا - خلفا کے زمانہ میں انہیں مُسلمانوں کے برابر آزادی حاصل تھی - انکی کوششیں مفید نتیجوں کے پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں -

شرقیین کے عہد حکومت میں بنی اسرائیل نہایت خورم و شاداں تھے - انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہُوئی - شارلیمین کے زمانہ میں بھی اُن سے نرمی کیجاتی تھی اور انکی عزت کیجاتی تھی - چنانچہ اُس نے جو پیغام ہارون رشید کے دربار میں بھیجا وہ اسحٰق یہودی ہی کے ہاتھ تھا - سوائے خاص موقعوں کے یہود اسکی دوستی کا دم بھرتے تھے اور اس کے مدد تھے - شارلیمین کے جانشینوں کے عہد میں انہیں اور بھی عروج ہُوا - لیکن عہد وسطیٰ میں ہم اُنپر قتل اور ظلم کے نہایت خوفناک واقعات سے تاریخ کے صفحے سیاہ پاتے ہیں -

عیسائیوں کا کوئی فرقہ یا کوئی قوم اپنے آپ کو اس الزام سے بری نہیں کر سکتی کہ

اُنھوں نے یہود کے ساتھ بعید از انسانیت سلوک کئے ہیں - انکو ستانا اور تکلیف دینا ثواب سمجھا جاتا تھا - جو شیلے عیسائی کہا کرتے تھے کہ جب ہمیں کافروں سے خصومت رکھنی ہی ہے تو پھر کیوں نہ ہم اُنسے اپنے مُلک میں بھی لڑیں - بہادرانہ طبیعت کے لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت اپنی شجاعت کی نسبت سے یہود کے ساتھ زیادہ بُرا سلوک کرتے تھے - رچرڈ اوّل سینٹ لوئیس اوّ فرانس - فرڈیننیڈ - اسیبلاؔ - لیوتھر - میر یا تھیریسا اِسی گروہ میں سے ہیں -

مگر تہذیب اور شائستگی اس قوم کی جو ایسی بیرحمی سے شکار کی گئی ایک بڑی حد تک ممنون ہے - یہود ایک تجارت پیشہ قوم ہو گئے تھے - علوم اور سائنس کی ترقی میں انکا بھی بڑا حصّہ ہے - اُنھوں نے یونانی تصانیف کو عربی میں ترجمہ کیا - جہاں سے وہ السنہ یورپ میں فوراً نمودار ہوئیں - اور مغرب کے نئے دارالعلوم تک پہنچیں - طب میں بھی اُن کا حصّہ کچھ کم نہیں ہے - عموماً وہ کتابوں کے شائع کرنے والے اور مترجم تھے - ادب میں بھی دخل رکھتے تھے - اُنکے مدارس مونٹ پلر فرانس - سلرنو اٹلی میں - سویل اسپین میں - علما اور سائنس کے تجربہ کرنیوالوں سے بھرے ہوئے تھے - جس زمانہ میں دنیا بھر میں شک اور ضعیف الاعتقادی کا زور تھا وہ قریب قریب اس سے بچے ہوئے تھے -

یہودیوں پر ظلم و تعدی کی حکایات نصاریٰ کی تواریخ میں بھی پائی جاتی ہیں - سائیسوٹ شاہ سپین کے عہد میں سب سے پہلے اُنپر ظلم ہونا شروع ہوا - چنانچہ وُہ خوشی خوشی اسلامی حکومت کو عیسائی حکومت پر ترجیح دیکر وہاں سے نکلے اور اسلامی ممالک میں جا کر بسے جہاں کہ وُہ مسلمانوں کے برابر برابر برادرانہ تعلقات کے ساتھ پھولتے پھلتے رہے - صلیبی لڑائیوں میں اُنھوں نے کوئی حصّہ نہیں لیا اگرچہ وُہ اُس دیوانہ وار مذہبی جوش سے کچھ عرصہ تک بچے رہے - گو اُنکا زمانۂ امن

بہت تھوڑا تھا۔ ۱۲۱۲ء میں جب مورز کے مقابلہ میں عیسائیوں کو ایک بڑی بھاری شکست ہوئی (اور جس شکست کا باعث یہ بتایا جاتا تھا کہ بادشاہ ایک یہودن کی محبت میں مدہوش تھا) بارہ ہزار یہودی سخت بیرحمی سے تہ تیغ کئے گئے۔ موت سے بچنے کے لئے بہت سے یہودی برائے نام عیسائی ہو گئے۔ اگرچہ وُہ اسی ظاہری مذہبی تبدیلی کی بدولت اعلیٰ مرتبوں پر پہنچے مگر حقیقتہً وہ دل میں یہودی ہی تھے۔ ایک زمانہ میں اُن لوگوں کی حالت جو اپنے مذہب کی پابندی کھلم کھلا کرتے تھے۔ بہتر تھی اُن سے جو بظاہر عیسائی تھے اور دل میں یہودی ۔ ۱۴۹۲ء میں ایک حکم نافذ کیا گیا کہ یہودی اگرچہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور بلند مرتبہ بھی ہیں فوراً اس سرزمین سے نکل جائیں ۔ ملکہ اسیبلا نے جو اپنی ذات سے تو بری طبیعت کی عورت نہ تھی ۔لیکن چونکہ پادریوں کا اثر اسپر بہت زیادہ تھا اس تجویز کو منظور کرلیا۔ فرڈیننڈ محض اپنی پولیسی کی وجہ سے (کیونکہ اُس میں انسانی ہمدردی تو کچھ ایسی نہ تھی) ایک عرصہ تک سوچتا رہا۔ اور آخر کار جب فیصلہ کیا تو بیان کیا جاتا ہے کہ محل میں ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ ایبرنل ایک یہودی جو ایک بلند مرتبہ اور قابل آدمی تھا اور بلحاظ اس اثر کے جو اسکو اپنی قوم پر حاصل تھا اور اس عزت کے جو اُس کے دشمن کرتے تھے دانیال پیغمبر سے مشابہ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ کے سامنے گیا اور اُنکے پاؤں میں گر گیا ۔ گڑگڑا کر اُس نے التجا کی کہ میری قوم کی جلاوطنی کا حکم منسوخ کیا جائے ۔تین لاکھ ڈکٹ (جو تقریباً دس لاکھ یا اکیس لاکھ روپیہ کے برابر ہوسکتے ہیں) اُس نے اس کی عوض میں پیش کرنے چاہے ۔ اتنے میں طرقومیدہ نامی ایک پادری صلیب ہاتھ میں لئے ہوتے برآمد ہوا۔ اور بادشاہ اور ملکہ کے سامنے بے خطر ایک مختصر تقریر کی۔ اور اُن دونوں بادشاہوں کو ایک رحم کے فعل سے مانع ہوا جو غالباً اُس کی غیر موجودگی میں اُن سے سرزد ہوتا۔

کونسی حکایت اس سے زیادہ اندوہناک ہوسکتی ہے اور کونسا نظارہ اس سے زیادہ دردناک ہوسکتا ہے۔ جسوقت یہود اس ملک سے رخصت ہونے لگے۔ وُہ اسپین کو اپنا وطن سمجھنے لگے تھے۔ اور اس سے اسی قدر محبت کرتے تھے جتنی انہیں کنعان سے تھی۔ رخصت ہوتے وقت وہ اپنے بزرگوں کی قبروں سے مل مل کر روئے۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے الوداع کیا۔ بعض انکی قبروں کے پتھروں کو اپنی اس آوارگی میں ساتھ لیئے پھرتے تھے۔ راہوں میں ان مہاجرین کی قطاریں کی قطاریں چلتی دکھائی دیتی تھیں۔ بعض اوقات وُہ نقارہ بجاتے تھے۔ جسکا حکم انکے بزرگوں اور پیشواؤں نے اس مصلحت سے دیا تھا کہ مبادا ان مصیبت زدوں کے دل بالکل بیٹھ جائیں اور وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ انکے سروں پر یا تو انکے مقدس قانون کے نوشتے تھے۔ یا کچھ سرمایہ جسقدر وُہ اٹھانے کے قابل تھے۔ زرخیز زمینیں کپڑے کی چیتھڑوں کے عوض میں زبردستی اُن سے خریدی جاتی تھیں۔ عمدہ سے عمدہ محل ایک خچر کے تبادلہ میں لے لیا جاتا تھا۔ بڑی بڑی رقمیں جو انکی واجب الادا تھیں ضبط کر لی گئیں۔ غرض ہر طرح وُہ ظالموں کا شکار بنے۔ روپیہ پیسہ کو جو کچھ وُہ ظالموں کے ہاتھوں سے بچا سکے اُنہوں نے خچروں کے زینوں میں اور گٹھڑیوں میں چھپا چھپا کر رکھا اور بندرگاہوں کی طرف چلے۔ دُنیا بھر میں صرف تُرک ہی ایک ایسی قوم تھی جس نے مہربانی اور شفقت سے انہیں خوش آمدید کہا۔ جو لوگ مراکو یا الجیریا میں گئے۔ انہیں غلام بنا بنا کر بیچا گیا۔ انہیں فاقوں مارا گیا۔ اور بیرحم لوگ اس خیال سے کہ وُہ جواہرات اور اشرفیاں نگل گئے ہیں۔ انکے پیٹوں کو چاک کر دیتے تھے۔ سب عیسائی سلطنتیں انکے واسطے مثل دیوار کے ایک سد تھیں اٹلی نے البتہ اُن پر کسی قدر رحم کیا۔ مگر یہ رحم مطلقاً خودغرضی پر مبنی تھا۔ پوپ سے کسی مہربانی کی توقع اسکی نیک دلی پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی خودغرضی پر

چنانچہ تھوڑے دن بعد ہی اٹلی میں بھی نہایت دردناک واقعات پیش آئے۔

پرتگال میں اوّل اوّل نرم سلوک کی اُمید ہوئی اور بہت سے بے خانماں وہاں چلے گئے۔ لیکن یہاں کے بادشاہ کی شادی اسپین کی شاہزادی سے ہوئی اور یہاں بھی انہیں پہلے سے بھی زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ صرف ملک بدر ہونےکا حکم انہیں دیا گیا۔ بلکہ انکے بچے تک بھی اُن سے چھین لئے گئے کہ انہیں عیسائی بنائیں یہانتک کہ مائیں مایوس ہو ہو کر اپنے لخت جگروں کو دریاؤں اور کنوؤں میں ڈالدیتی تھیں اور آپ خودکشی کرلیتی تھیں۔ قتل و غارت کی جس قدر بھی حکایتیں سُنی جائیں وُہ قریب قریب سب یقین کے قابل ہیں۔ اسپین سے جو لوگ نکالے گئے وُہ نہ صرف ساہوکار۔ سوداگر۔ اطبّا اور علما ہی تھے۔ بلکہ اُن میں زراعت پیشہ اہل حرفہ اور مزدور بھی تھے۔ یہود کے اسپین سے رُخصت ہوتے ہی تہذیب و شائستگی نے بھی اس ملک کو خیرباد کہا۔ آبادی بہت کم ہوگئی۔ باشندے دِل شکستہ ہوکر ہمت ہار بیٹھے۔ اور زمین ایسی ویران ہوئی کہ اب تک اُسی حالت میں پڑی ہے۔

اِس کے دوسو برس بعد بھی اسپین کا تعصب کم نہ ہوا۔ ۱۶۸۰ء میں چارلس ثانی کی شادی کے موقعہ پر ایک دردناک واقعہ کا وقوع قابلِ توجہ ہے۔ میڈرڈ میں ایک مربع میدان میں ایک چبوترہ پر شاہی خاندان کی نشست کے لئے ایک بلند اور ممتاز جگہ بنائی گئی۔ درباری زرق برق کی پوشاکیں پہن پہن کر آئے۔ راہبوں کے جوق کے جوق آئے۔ اور عوام کی تو کچھ شمار ہی نہ تھی۔ آٹھ بجے کے قریب وُہ غمناک منظر جسے موت کا جلوس کہنا بجا ہے دیکھنے میں آیا۔ آگے آگے تقریباً سو سیاہ پوش جنکا کام آگ جلانا اور دہکانا تھا نیزے ہاتھوں میں لئے تھے۔ اُنکے پیچھے راہبین کے گروہ نظر آئے۔ اُنکے پیچھے پیچھے اُمرا اور اَور درباری صلیب اور جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوئے آرہے تھے۔ اِس تزک و شان کے ساتھ مظلوم

یہودی جن میں مرد و عورت دونو تھے آئے۔ سب کی نظریں انہی پر پڑی تھیں اور سب کو انہی سے دلچسپی تھی۔ کیونکہ یہ بیچارے زندہ جلائے جانیوالے تھے۔ اور صرف اس گناہ میں کہ انہوں نے مذہبِ عیسوی کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک ایک موٹے اور زرد رنگ کے کپڑے کا فرغل پہنے ہوئے تھا۔ جنپر اودے رنگ کی آگ کے شعلوں۔ بھوتوں۔ سانپوں اور صلیب کی شکلیں منقش تھیں۔ انکے سروں پر لمبی لمبی نوکدار ٹوپیاں تھیں۔ اور گلے میں ایک تختی تھی جس سے ہر ایک کا نام اور گناہ معلوم ہو جاتا تھا۔ عرصہ تک قید خانے کے اندھیرے اور سیل کے اثر سے انکے چہرہ کے رنگ زرد تھے۔ مگر آج یہ لوگ خوش معلوم ہوتے تھے کہ انکی تکلیفیں اور مصیبتیں اس دن ختم ہو جائینگی۔ جب یہ دہلانے والا جلوس شاہی مقام کے سامنے سے گذرا تو ایک سترہ برس کی لڑکی جسکا حسن باوجود ان مصائب کے بھی زائل نہ ہوا تھا۔ ملکہ کی طرف مخاطب ہوئی اور چلا کر کہنے لگی "اے نیکدل ملکہ کیا تو اتنی قدرت نہیں رکھتی کہ میری جان بچالے۔ میری ماں نے مجھے اپنے دودھ میں اپنا مذہب گھول کر پلایا ہے۔ تو کیا مَیں اس مذہب کے واسطے جان دیدوں"؟ ملکہ کے آنسو بھر آئے اور اُن سے اپنا منہہ پھیر لیا۔ اور اگر وُہ اس کی سفارش بھی کرتی تو شاید اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈالتی۔ یہ لڑکی زار و قطار روتی ہوئی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنی قسمت کا لکھا بھگتنے کے واسطے چلی گئی۔ سورج ڈھلنے کے قریب بھجن گائے گئے اور یہ مصیبت زدہ گروہ ہلاکت کے کنارہ پر پہنچگیا۔ شہر کے ایک طرف ایک پتھر کا چبوترہ تھا جسکے چاروں کونوں میں چار پیغمبروں کے بُت جنکی صورتیں بگڑ گئی تھیں کھڑے تھے۔ جو شخص اپنے گناہوں سے اس آخری وقت میں پشیمان ہوتا اُسکو جلانے سے پہلے پھانسی دیجاتی تھی۔ اوّل مُردوں کی ہڈیاں جلائی گئیں اور پھر زندہ گنہگار دہکتے ہوئے انگاروں میں جھونک دیئے گئے۔ خود بادشاہ

ایندھن کے گٹھوں میں آگ لگاتا پھرتا تھا۔

جرمنی میں بھی یہودیوں سے کچھ اس سے کم بُرا سلوک نہیں کیا گیا۔ ایک دفعہ جب مَیں یہودیوں کے قدیم معبد کی سیر کر رہا تھا تو میرے ہمراہی نے مجھے ایک قصّہ سُنایا۔ کہ زمانہ قدیم میں ایک دفعہ صرف اس لئے کہ یہودیوں سے نفرت زیادہ کیجائے۔ ایک مُردہ بچہ عیسائیوں نے خفیہ طور سے یہودی کے گھر میں ڈالدیا۔ اور سازش کرنے والوں نے فورًا مقدمہ دائر کیا۔ تفتیش کے بعد بچہ ملا۔ اور بیگناہ یہودی خُون کے مرتکب قرار دے گئے۔ شہر کے حاکم نے حکم سُنا دیا کہ اگر قاتل برآمد نہ ہُوا تو یہودیوں کے سربرآوردہ اور معزز لوگ اُبلتے ہُوئے تیل کے کڑاہے میں ڈالدیئے جائینگے۔ وقت سر پر آگیا۔ راہب اور دیگر معزز لوگ گرفتار کرلئے گئے اور انکے اظہار لئے جانے لگے۔ جو اذیت انہیں دیجانیوالی تھی اسکی تیاری انکی آنکھوں کے سامنے ہونے لگی۔ کہ یکایک دو اجنبی آئے۔ اور اپنے آپ کو مجسٹریٹ کے حوالے کرکے کہا کہ اس جرم کے کرنے والے ہم ہی ہیں۔ اُبلتے ہُوئے تیل میں اُنہیں فورًا جھونک دیا گیا۔ نیک اور پاک دروغ انکے لبوں پر تھا۔ اور بیگناہی نے انکے چہروں کو منوّر کر دیا تھا۔ دوسروں کی جانیں بچانے کے واسطے اپنی جانیں اُنہوں نے خوشی خوشی قربان کر دیں۔

جرمن میں یہودیوں کی خونریزی بھی اسی سال جب بلیک ڈیتھ (طاعون) نے یوروپ میں ہلاکت پھیلائی تھی شروع ہُوئی۔

اس وبا میں یورپ کے ایک چوتھائی آدمی مر گئے۔ لیکن ان مرنے والوں میں یہودیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جسکی وجہ ایک تو انکا علیحدہ اور ایک طرف رہنا اور دوسرے انکا سادہ اور صاف طریقہ معاشرت تھا۔ لوگوں کو شبہ ہُوا کہ یہودی کیوں نہیں مرتے۔ اور اس شُبہ کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مختلف قسم کی رپوٹیں

تراشی گئیں کہ یہودی کنوؤں اور چشموں میں زہر ملا دیتے ہیں اور یہ کہ ٹولیڈو کے راہبوں نے یہ تجویز کی ہے کہ تمام عیسائیوں کو تباہ کر دیں۔ اس کے ثابت کرنے کی ہر ایک طرح کوشش کی گئی اور ایک غریب کو ایذا دیکر اور اُسپر ظلم کر کے اقرار کرالیا گیا۔ بس۔ یہودیوں پر لوگ ٹوٹ پڑے۔ اور بہتیروں کو برباد کر دیا۔ سٹرلیس برگ میں دو ہزار پھانسی چڑھا دیئے گئے۔ اور اُنکی لاشیں آگ میں ڈالدیں اور مقامات پر چونکہ اُنہیں اپنی قسمت میں یہی لکھا معلوم ہوتا تھا۔ یہودیوں نے خود اپنے گھروں میں آگ لگا دی اور خود بھی جلکر خاک ہو گئے۔

انگریزی تاریخ سے شروع ہی زمانہ میں یہودیوں کی انگلستان میں موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ سیکسن اہل برطانیہ سے لڑتے رہے اور اہل ڈنمارک سیکسن سے۔ مگر یہودیوں کے ساتھ دشمنی متفق علیہ تھی۔ کینوٹ بادشاہ نے اُنہیں نکالدیا۔ اور یہاں سے انہوں نے نورمنڈی میں پناہ لی۔ ولیم فاتح کے زمانہ میں وُہ پھر انگلستان میں چلے آئے۔ کچھ دنوں تک گو انکے ساتھ یہاں مہربانی سے سلوک کیا گیا۔ ولیم ثانی خصوصیت سے اُن پر شفیق تھا۔ اُس نے عیسائی اور یہودی عُلماؤں میں ایک مذہبی مناظرہ کرایا اور قسم کھائی کہ اگر عیسائی مذہب کو شکست ہوئی تو فورًا یہودی ہو جاؤنگا۔ لیکن یہ عنایات چند روزہ تھیں۔ رچرڈ اوّل کے زمانہ میں انہیں پھر انہی مصائب کا سامنا پڑا جن سے کچھ دنوں کے واسطے امن مل گیا تھا۔

بیوقوف یہودی نئے بادشاہ کی عنایت حاصل کرنے کے خیال میں اسکی تخت نشینی کے دربار میں عُمدہ عُمدہ لباس پہنکر آئے جن پر قیمتی جواہر جڑے تھے۔ اِس بیدین قوم کی موجودگی ایسے مبارک موقعہ پر فال بد سمجھی گئی۔ ویسٹمنسٹر ایبے سے نکل جانیکا اذن نوٹا گیا۔ لنڈن میں کوئی یہودی گھر ایسا نہ تھا جو قتل و غارت سے بچا ہو۔ دارالخلافہ

میں جب یہ حالت نہ ہو تو باہر ملک میں جتنا ظلم ہو تھوڑا ہے ۔ یورک میں ایک ایسا
اندوہناک واقعہ ہوا جسکی مثال صرف یہودہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے ۔ یہودیوں نے
اس قلعہ میں پناہ لی ۔ اور جوشیلے عیسائی پادریوں کا مقابلہ کیا ۔ انہوں نے مذہبی
جوش کی آگ سب جگہ پھیلادی اور فتوےٰ دیدیا کہ جو شخص ایک بے دین کا خون کریگا
بخات اسی کا حصّہ ہے ۔ خود صلیب ہاتھوں میں لئے ہوئے لڑتے تھے ۔ تھوڑی ہی
دیر کے بعد یہودیوں کو معلوم ہوگیا کہ اب مقابلہ بے سُود ہے ۔ یورک کا ایک راہب
جو ایک مقدّس اور عالم آدمی تھا اپنی قوم سے اس طرح مخاطب ہوا " اے بنی اسرائیل
آج ہمارا اور ہمارے باپ دادوں کا خدا اپنے مقدّس قانون (کتاب مقدّس) کے لئے
جانیں دیدینے کا حکم کرتا ہے ۔ اس قانون کی پابندی ہماری قوم نے ابتداہی سے
کی ہے ۔ اِس قانون کی ہم نے ابتک باوجود ان تمام مصائب کے جو سب قوموں
سے ہمیں پہنچے اور باوجود اس مقید حالت کے خوب حفاظت کی ہے ۔ کم سے کم
جو ہم کرسکتے ہیں وہ اپنی جانیں کھپادینا ہے ۔ موت ہماری آنکھوں کے سامنے
کھڑی ہے ۔ اگر ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جانوں کو خدا کے حوالے کردیں جیساکہ
ہمارے بزرگوں نے کیا ہے ۔ تو ہم عیسائیوں کی (جو بھیڑیوں کی طرح ہمارے خون کے
پیاسے ہیں اور ہمیں دیکھ دیکھ کر غرّاتے ہیں) ایذاؤں سے بچ جائینگے ۔ خدا ہمیں
بلا رہا ہے ۔ اس کے فضل کا مستحق ہمیں بننا چاہئے " یہ ضعیف العمر اس قدر کہکر رو پڑا ۔
رات ہوگئی تھی ۔ محاصرین اپنے ہتھیاروں ہی کی طرف متوجہ تھے کہ قلعہ کے اندر شعلے
بلند ہوئے ۔ مردوں نے اپنی بیویوں اور اپنی اولادوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور
پھر ایک ایک نے ایک دوسرے کو بڑوں نے چھوٹوں کو ۔ اور بڑوں کو اُنکے بوڑھے
راہب نے آخر میں وہ اکیلا کھڑا رہگیا ۔ مرد عورت ۔ بچوں بوڑھوں کی لاشیں خاموش
اُس کے گرد ڈھیر کے ڈھیر پڑی تھیں ۔ دہکتے ہوئے شعلوں میں نہ صرف مال و متاع

بلکہ لاشیں تک ڈالدی گئیں۔ ضعیف العمر نے آخر الامر اپنا بھی کام تمام کر ڈالا اور اپنے ساتھیوں میں مل گیا۔ فاتحین کے لئے صرف ایک خاک کا ڈھیر چھوڑ گیا جو پانسو جانیں تلف ہونے کا نتیجہ تھا۔

ایک صدی تک تو باقیماندہ یہودی جس طرح سے بھی ہوسکا انگلستان میں رہے۔ لیکن ایڈورڈ اوّل نے جو ایک نیک اور بڑا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔ انکو بالکل نکال دیا۔ ان جلاوطنوں کی تعداد تقریبًا سولہ ہزار پانسو تھی۔ اسوقت سے چار صدیوں تک پھر انگلستان کی زمین پر کسی یہودی کا نقش پا تک بھی نہیں دیکھا گیا۔ کروموئل نے انہیں پھر اجازت دی مگر بہت سی پابندیوں اور شرائط کے ساتھ۔

لنڈن برج کے ایک محراب کے نیچے پانی نہایت زور سے بہتا ہے۔ دریا میں جس وقت مد و جزر کسی خاص درجہ تک پہنچتا ہے تو پانی ایک عجیب طرح چکر کھایا کرتا ہے۔ لوگ یقین کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ کہ پانی کا اس جگہ اس طرح چکر کھاتا بیان کیا جاتا ہی کہ اس محراب کے نیچے گذشتہ زمانہ میں یہودیوں کا ایک گروہ غرق کر دیا گیا ہے اور شور مچانا اُسی دن سی شروع ہوا ہی جس دن اُن یہود مظلوموں کے مرتے وقت کی چیخیں اس جگہ خاموش کر دی گئیں۔ گویا پانی بھی جس نے ایک پوشیدہ اور درد ناک واقعہ میں حصہ لیا اپنے اُوپر پشیمان ہوتا ہی اور اپنی خفیہ پشیمانی کی تکلیف کو آج تک اس صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

اٹلی میں جو تکلیفیں یہودیوں کو پہنچیں وہ مقابلۃً اور قوموں کے سلوک سے کم خوفناک ہیں۔ خاص شہر روم میں یہودیوں کی قسمت کا دار و مدار پوپ ہی کی ذات پر محدود ہوتا تھا بعض دفعہ تو وہ نہایت انسانیت سے انکی حفاظت کرتے تھے اور بعض دفعہ اپنی خودغرضی سی انہیں قتل کرڈالتے یا آگ میں جھونک دیتے۔ جنوبی حصہ اٹلی میں یہودی خاص طور پر پیشہ ور تھے۔ رنگریز، معمار، لوہار، سنار، ریشم کے کام کرنیوالے وغیرہ قریب قریب یہودی ہی تھے۔

میں جب یہ حالت نہ ہو تو باہر ملک میں جتنا ظلم ہو تھوڑا ہے۔ یورک میں ایک ایسا اندوہناک واقعہ ہوا جسکی مثال صرف یہود ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ یہودیوں نے اس قلعہ میں پناہ لی۔ اور جوشیلے عیسائی پادریوں کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے مذہبی جوش کی آگ سب جگہ پھیلادی اور فتوٰی دیدیا کہ جو شخص ایک بے دین کا خون کریگا نجات اسی کا حصہ ہے۔ خود صلیب ہاتھوں میں لئے ہوئے لڑتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد یہودیوں کو معلوم ہوگیا کہ اب مقابلہ بے سود ہے۔ یورک کا ایک راہب جو ایک مقدس اور عالم آدمی تھا اپنی قوم سے اس طرح مخاطب ہوا " اے بنی اسرائیل آج ہمارا اور ہمارے باپ دادوں کا خدا اپنے مقدس قانون (کتاب مقدس) کے لئے جانیں دیدینے کا حکم کرتا ہے۔ اس قانون کی پابندی ہماری قوم نے ابتدا ہی سے کی ہے۔ اس قانون کی ہم نے ابتک باوجود ان تمام مصائب کے جو سب قوموں سے ہمیں پہنچے اور باوجود اس مقید حالت کے خوب حفاظت کی ہے۔ کم سے کم جو ہم کر سکتے ہیں وہ اپنی جانیں کھپا دینا ہے۔ موت ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اگر ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جانوں کو خدا کے حوالے کردیں جیساکہ ہمارے بزرگوں نے کیا ہے۔ تو ہم عیسائیوں کی (جو بھیڑیوں کی طرح ہمارے خون کے پیاسے ہیں اور ہمیں دیکھ دیکھ کر غراتے ہیں) ایذاؤں سے بچ جائینگے۔ خدا ہمیں بلا رہا ہے۔ اس کے فضل کا مستحق ہمیں بننا چاہئے"۔ یہ ضعیف العمر اس قدر کہکر رو پڑا۔ رات ہوگئی تھی۔ محاصرین اپنے ہتھیاروں ہی کی طرف متوجہ تھے کہ قلعہ کے اندر شعلے بلند ہوئے۔ مردوں نے اپنی بیویوں اور اپنی اولادوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور پھر ایک ایک نے ایک دوسرے کو بڑوں نے چھوٹوں کو۔ اور بڑوں کو انکے بوڑھے راہب نے آخر میں وہ اکیلا کھڑا رہگیا۔ مرد عورت۔ بچوں بوڑھوں کی لاشیں خاموش اس کے گرد ڈھیر کے ڈھیر پڑی تھیں۔ دہکتے ہوئے شعلوں میں نہ صرف مطرہا ومتاع

بلکہ لاشیں تک ڈالدی گئیں۔ ضعیف العمر نے آخر الامر اپنا بھی کام تمام کر ڈالا اور اپنے ساتھیوں میں مل گیا۔ فاتحین کے لئے صرف ایک خاک کا ڈھیر چھوڑ گیا جو پانسو جانیں تلف ہونے کا نتیجہ تھا۔

ایک صدی تک تو باقیماندہ یہودی جس طرح سے بھی ہوسکا انگلستان میں رہے۔ لیکن ایڈورڈ اوّل نے جو ایک نیک اور بڑا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔ انکو بالکل نکال دیا۔ ان جلا وطنوں کی تعداد تقریبًا سولہ ہزار پانسو تھی۔ اسوقت سے چار صدیوں تک پھر انگلستان کی زمین پر کسی یہودی کا نقش پا تک بھی نہیں دیکھا گیا۔ کروموئل نے انہیں پھر اجازت دی مگر بہت سی پابندیوں اور شرائط کے ساتھ۔

لنڈن برج کے ایک محراب کے نیچے پانی نہایت زور سے بہتا ہے۔ دریا میں جس وقت مد و جزر کسی خاص درجہ تک پہنچتا ہے تو پانی ایک عجیب طرح چکّر کھایا کرتا ہے۔ لوگ یقین کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ کہ پانی کا اس جگہ اس طرح چکّر کھاتا بیان کیا جاتا ہے کہ اس محراب کے نیچے گذشتہ زمانہ میں یہودیوں کا ایک گروہ غرق کر دیا گیا ہے اور شور مچانا اُسی دن سے شروع ہوا ہے جس دن اُن یہود مظلوموں کے مرتے وقت کی چیخیں اس جگہ خاموش کر دی گئیں۔ گویا پانی بھی جس نے ایک پوشیدہ اور دردناک واقعہ میں حصہ لیا اپنے اوپر پشیمان ہوتا ہے اور اپنی خفیہ پشیمانی کی تکلیف کو آج تک اس صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

اٹلی میں جو تکلیفیں یہودیوں کو پہنچیں وُہ مقابلۃً اَور قوموں کے سلوک سے کم خوفناک ہیں۔ خاص شہر رُوم میں یہودیوں کی قسمت کا دارومدار پوپ ہی کی ذات پر محدود ہوتا تھا بعض دفعہ تو وُہ نہایت انسانیت سے انکی حفاظت کرتے تھے اور بعض دفعہ اپنی خود غرضی سے انہیں قتل کر ڈالتے یا آگ میں جھونک دیتے۔ جنوبی حصہ اٹلی میں یہودی خاص طور پر پیشہ ور تھے۔ رنگریز معمار و نیار یا سُنار۔ ریشم کے کام کرنیوالے وغیرہ قریب قریب یہودی ہی تھے۔

جس وقت یہودی انگلستان اور جرمنی میں طرح طرح کی مصائب کا شکار بن رہے تھے۔ اُنکے بھائی فرانس میں قابلِ رشک حالت میں تھے۔ شہر و دیہات میں پھیلے ہُوئے تھے۔ کھیتی کرتے تھے باغ لگاتے تھے۔ غرض زراعت۔ دستکاری طبابت اور علم۔ ہر ایک شے میں حصہ لیتے تھے۔ زیادہ تر تجار اور ساہوکار تھے۔ آسمان اُن کے موافق تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی قتل وغارت کی مصیبت اُن پر بھی پڑجاتی تھی۔ سنہ ۱۱۸۰ء میں جب فلپ اگسٹس تخت پر جلوہ افروز ہُوئے۔ تو یہاں بھی وُہ ہی مثال اختیار کی گئی۔ بادشاہ اور رعایا دونوں نے ملکر چکی کے دو پاٹوں کی طرح بیرحمی سے یہُودیوں کو کچلنا اور پیسنا شروع کیا۔ اُنکے مال و متاع زبردستی چھین لئے گئے۔ جہاں ایذا دہی سے فائدہ متصوّر نہ ہوتا تو قتل سے کام لیا جاتا۔ حتّٰی کہ لُٹے کھُسٹے جو باقی رہے انہیں سرحد سے باہر نکل جانیکا حکم دیدیا گیا۔ مقدس سینٹ لوئیس جسکو تاریخ اور فسانوں نے آسمان پر چڑھا دیا۔ یہودیوں کو چوپایوں کی طرح خرید و فروخت کرتا تھا۔ اور اُسنے اُنکی محبوب اور مقدّس کتاب جو مصائب اور تکالیف میں انکی تسکین کا سبب ہوتی تھی زبردستی چھین کر برباد کرتا۔ سنہ ۱۳۰۶ء میں جس دن یروشلیم برباد کیا گیا اُسی دن ایک لاکھ مرد۔ عورت اور بچّے مال و متاع سب چھین کر بے خانماں مُلک سے نکالدیئے گئے۔

مشہور لیُوتھر جو بہت بڑا مذہبی ریفارمر تھا۔ اس کا قول ہے "میرے بھائی عیسائیو! جان لو۔ اور اس میں شک نہ کرو۔ کہ شیطان کے سوا تمہارا کوئی دشمن اس قدر سخت کینہ ور۔ اور زہریلا نہیں ہے جیسا کہ ایک یہودی" +

(ترجمہ انگریزی)   **خواجہ لطیف احمد** (علیگڈھ)

غور

"تم لوگ غور کو" خدا کہتا ہے "بہت ہی کم کام میں لاتے ہو" - اسکی صداقت کو کوئی جُھٹلا نہیں سکتا - یہ اُسکا کلام ہے جو انسانی فطرت کا صانع ہے - اور بیشک اگر ہم ذرا بھی اپنی حالت پر انصاف کی نظر ڈالیں تو ہم کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ ہم اپنی زندگی کی گھڑیاں کس بے پروائی سے گذار رہے ہیں !

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی عمر کا زیادہ حصّہ نقل کرنے میں گذارتے ہیں - ہم عام لوگوں کی زندگی کے افعال زیادہ تر دُوسروں سے سیکھے ہوئے ہوتے ہیں - بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قوّتِ غور کو کام میں لانے والے ہوں - اور دُنیا کی کل عمدہ اور لطیف چیزوں کی طرح جہاں اسکی طرف سے بے توجہی اور بے پروائی کی گئی تو یہ قوّت اِس درجہ جلد بوسیدہ ہو جاتی ہے کہ پھر میرا ساتھ دینے سے ہمیشہ معذور رہتی ہے ! اور اس کے برخلاف اگر اسکی پرورش پر ہمیشہ نظر رہی تو میری زندگی کی اس سے بڑھکر کوئی رفیق نہیں - صرف رفیق نہیں - بلکہ رہنما اور ہادی !

میری دُنیاوی اور رُوحانی ترقی صرف اسی ایک قوّت کی بدولت ہے - جو جتنا زیادہ غور کرنے والا اور سوچنے والا ہوگا اُسی قدر زیادہ پارسا معزز اور شریف النفس ہوگا ایک غور کرنے والے دماغ کے لئے کسی اُستاد کی ضرورت نہیں - وُہ قدرت کی ضخیم کتاب میں سب چیزیں پاتا ہے - اُسکو قاہرہ کی ایک ٹوٹی ٹھیکری اور روما کی ایک شکستہ اینٹ وہ سبق سکھلا دیگی جو مشہور مصنفوں کے موٹی کتابوں کے صفحے نہیں سکھلا سکتے! وہ ایک ناشپاتی کے گرنے سے وُہ سبق لے لیتا ہے جسکو صدیاں بڑے بڑے ہولناک پتھروں کے گرنے سے نہ لے سکیں - وُہ سیاست مدن کے اصُول کو اپنی گھر کی چہار دیواری

میں سیکھ لیتا ہے ۔ فوج کی کمان لینا اسکولڑکپن کے بعض شریر کھیل سکھلا دیتے ہیں اور ریل کیسی حیرت میں ڈالنے والی چیز کی ایجاد کو اپنی ایک پُرانی چا کی کتلی سے سیکھ لیتا ہے!

بیشک اس طرح کی سوچنے والی طبیعتوں پر فطرت کا خاص احسان ہوتا ہے جو دُنیا کو انکا ممنون بنا دیتی ہے! پھر بھی قدرت نے کسی دماغ کو بے سلوک نہیں چھوڑا اور یہ انکی نہایت درجہ احسان فراموشی ہوگی جو اپنے صانع کا شکر نہ کریں ۔ یعنی اُس سے کچھ کام نہ لیں ۔ دُنیا کے وُہ لوگ جنہوں نے صرف نقل کرنا سیکھا ۔ انہوں نے کچھ نہیں سیکھا اور خدا کی امانت کا حق بُھلا دیا ۔ صانع عالم کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اُس کے بندے "غور" کو کام میں لائیں اور اس طرح اپنے کو اس قابل بنائیں کہ فطرت کی دی ہُوئی قوتوں سے پُورا پُورا وُہ کام لیں جنکے لئے وہ بنائی گئی ہیں ۔

لیکن میری جماعت میں ایسی سوچنے والی طبیعتوں کا نہایت ہیبت ناک کال ہے اور بہت ہی قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنکو ہم سوچنے والا اور غور کرنے والا کہہ سکیں ۔ ہم میں اب صرف نقل کرنے والے لوگ رہ گئے ۔ میری جماعت میں اب ابو نصر فارابی کیوں نہیں ہوتا؟ رازی اور سینا کے سے لوگ ہم میں اب کیوں نہیں پیدا ہوتے ابن خطاب کا سا مدبر ہم میں پھر کیوں نہیں کھڑا ہوتا؟ اس لئے کہ غور کرنے والے لوگ نہ رہے ۔ بغداد ۔ قرطبہ اور اب اسکندریہ کی وُہ گلیاں نہ رہیں جنمیں ہم زبردست دماغوں کو غور میں ڈوبا ہوا پاتے ہوں اور جنکی انگلیوں اور ہاتھوں کی حرکت سے دُنیا متحرک ہو رہی ہو!!

جب قدما کا زمانہ ختم ہوگیا تو ہم میں ویسے لوگوں کی کمی ہوتی گئی ۔ غور کرنیوالے دماغوں کے چراغ گل ہوگئے اور دفعتاً ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک تاریکی دوڑ گئی! جب ہم میں یہ لوگ نہ رہے تو میرے ذخیرہ میں اضافہ ہونا کم ہوگیا اور ترقی کی دوڑ میں ہم پیچھے پڑ گئے ۔ ہم میں لوگ تو پیدا ہوتے رہے لیکن کچھ جوہر نہیں دکھلایا

کتابیں تو تصنیف ہوتی تھیں لیکن پُر مغز نہیں - قصّہ گو اور شاعروں کا دریا بہ گیا لیکن حکیم اور مدبّروں کا کال پڑ گیا - عُلما بہت گذر گئے لیکن علمی ذخیرہ کو بڑھا کر نہ گئے - آخر وُہ کونسا زبردست سبب تھا جسکے یہ حسرت ناک نتیجے ہُوئے ؟ قوتِ غور کیطرف سے بے توجہی !

یہی چیز انسانی ہے جسکی وجہ سے اُسکا اس قدر اعزاز کیا گیا کہ اُس کے صانع نے اُسکو اپنا خلیفہ کہا - اور اُس کے آگے فرشتوں کے سر جھکوائے ! اگر یہ قوت نہ ہوتی تو ابراہیم اجرامِ فلکی اور خدا میں تمیز نہ کر سکتے !!! یہی قوت تھی جسکی بدولت آمنہ کے یتیم بچے کو رسالت کا مہتم بالشان کام سُپرد ہوا ! - یہ وُہ لوگ ہیں جنکا دماغ بچپن سے لیکر موت تک لگاتار غور میں مصروف رہا -

یہ وُہ قوت ہے کہ جس کی طرف سے بے توجہی کرنی خُدا کے سب سے بڑے فرض کو بھُولنا ہے - ہم اسی لیئے بنائے ہی گئے ہیں - غور کرتے کرتے مرجائیں - پالنے سے لیکر موت کی چارپائی تک میرا دماغ لگاتار غور میں مصروف رہنا چاہیئے اور میری زندگی کے سارے افعال کہرے غور کے نتیجہ ہونے چاہئیں - ہم اس لئے نہیں بھیجے گئے کہ جو دیکھیں سو کریں بلکہ جو سوچے وُہ کریں - دُنیا میں بڑے بڑے لوگوں کی زندگی قابلِ تتبّع بنائی جاتی ہے لیکن یہ تتبّع نہایت ہی مشکل کام ہے - اُسکی زندگی ہمکو راہ بتا سکتی ہے لیکن چلنا نہیں سکھا سکتی - اور تم کو چلنا سکھانے والی چیز غور ہے ! زمانہ ایک سا نہیں رہتا - وقت ہمیشہ بدلتا رہتا ہے - موقعے کبھی یکساں نہیں رہتے - ان موقعوں میں بھی اپنی ہی بل بوتے سے کام لینا پڑیگا اور وُہ بل بوتے ہمارے غور ہیں -

اگر عاقلانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو بہت سوچا کرو اور اس لاجواب جوہرِ دماغ سے وُہ کام لو جسکے لیئے وہ بنایا گیا ہے اسکی مشق کرو اور اس میں کمال پہنچاؤ اور اس طرح دُنیا کو اپنے پیچھے کچھ زیادہ سمجھدار چھوڑ مرو !!

: غور کرنے کے لئے قدرت کی ضخیم کتاب کے بے شمار صفحے کھلے ہوئے ہیں انکا گہرا مطالعہ کرو اور آنے والی نسلوں کو ممنون کر جاؤ۔ دنیا انہیں کو یاد رکھنے والی ہے۔ جو اُس پر احسان کر گئے۔ لوگ اُنہیں کی عزت کا گیت گا ئینگے جو انکو فائدہ پہنچا گئے۔ تاریخ انہیں پر فخر کریگی جو اپنے لگاتار غور کے نتیجہ سے لازوال چیز چھوڑ گئے !!

جزیرہ ساموس پر میری نگاہیں کیوں اس عزت سے پڑتی ہیں؟ اِس لئے کہ یہیں سے وہ زبردست فیلسوف نکلا تھا جو دنیا کو زیادہ سمجھدار چھوڑ کر مرا۔ اثینہ کے قیدخانہ کے گرد دنیا کیوں رو رہی تھی؟ اِس لئے کہ ایک عالی دماغ اور خُداترس شخص کے اعضا وہاں غیر متحرک ہو گئے تھے اور فائدہ جو دنیا کو اُسکی ذات سے مل رہا تھا۔ بند ہو گیا تھا! غزالی کے حجرہ کی میری آنکھوں میں کیوں اتنی وقعت ہے؟ اِس لئے کہ ایک لگاتار غور کرنے والا یہاں رہتا تھا جو اَب نہیں ملا! محمد کے غار پر میری نگاہیں کیوں اس قدر عزت سے پڑتی ہیں۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ اسی سنسان جگہ میں ایک معزز دماغ جھکا رہتا تھا۔ جسکی پلکیں غور کے بوجھ سے بند رہتی تھیں !!!

علی محمود (از بانکی پور)

مُعلّم النسوان ۔ یہ وہ مفید کارآمد اور نتیجہ خیز لکچر ہے جو ہمارے مکرم خان بہادر میرزا شجاعت علی صاحب نائب ریاست مرشدآباد نے بمقام بمبئی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ اجلاس میں دیا تھا۔ میرزا صاحب کو تعلیم نسواں سے جو خاص دلچسپی ہے وُہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ آئے دن اُنکی کوششوں سے مفید نتائج مترتب ہوتے رہتے ہیں۔ اِس لکچر میں مرزا صاحب نے نہایت عالمانہ قابلیت سے ضرورت تعلیم نسواں کو ثابت کیا ہے جو صاحب اِس لکچر سے مستفید ہونا چاہیں میرزا صاحب کے پاس پتہ ذیل پر درخواست بھیجیں۔ (نمبر ۷ روڈن سٹریٹ۔ شہر کلکتہ) +

اجمیر کی جمعرات

اِنسانی زندگی میں بقول ایرانی فلاسفر کے "ہر نفسے کہ فرو میرود ممدِ حیات است و ہر نفسے کہ برون مے آید مفرّحِ ذات" کا معاملہ ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ کاہش بھی ہے کہ ہر نفس کے ساتھ زندگی بھی کم ہوتی جاتی ہے اور جو وقت گذرتا ہے وُہ اِس کا مصداق ہے ؎ غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی + گردوں نے گھڑی عُمر کی اک اَور گھٹا دی۔ باوجود اس کے انسان ہمیشہ آنے والے دِل خوش کن وقت یا دن کا منتظر رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خواہش رہتی ہے کہ درمیانی عرصہ جلد ختم ہو جائے اور کوئی بھُولے سے بھی اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ اِس طرح گویا وُہ اپنی عُمر جلد ختم ہو جانے کا خواہشمند ہے۔ سینکڑوں آدمی شام اودھ کے اِنتظار میں گھڑیاں گنتے رہتے ہیں اور ہزاروں صاحبدل صبح بنارس کی یاد میں اختر شماری کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح ان دو مقامات کے دو خاص وقت دردمند دلوں کی تسکین کا باعث ہوتے ہیں اسی طرح بعض مقامات کے خاص خاص روز اپنی دلفریبیوں کے باعث اپنے مشتاقوں سے اِنتظار کراتے ہیں چنانچہ اُن میں سے ایک اجمیر کی جمعرات ہے۔

جمعرات کے دن اُس وقت جبکہ دھوپ میں کسی بگڑ کر جانے والے کی دلکش ادا کا نقشہ آجاتا ہے اور وُہ کسی دامنِ ناز بچا کر جانے والے کی طرح لمبے لمبے قدم رکھتی بھاگی ہوئی چلی جاتی ہے۔ شہر کے ہر ایک حصّہ سے سینکڑوں آدمی درگاہِ حضرت خواجہ علیہ الرّحمۃ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک بڑے وسیع میدان میں نہایت شاندار عمارت ہے جس میں متعدد مسجدیں۔ معابد۔ مزار۔ شاندار مکانات اور بڑے بڑے صحن بنے ہوئے ہیں اور بیچ میں حضرت کا مزار مقدّس ہے جس کے

اوپر ایک رُعب ڈالنے والا طلائی گنبد ہے۔ مزار کے چاروں طرف ایک نُقرئی کٹہرہ ہے۔ مختلف رنگوں کے قیمتی پتھروں کا پچکاری کا فرش ہے اور در و دیوار پر سُنہری کام ہو رہا ہے جو ہندوستان کے بادشاہوں اور رؤسا کی فیاضی اور خوش اعتقادی کا اپنی زبانِ حال سے ثبوت دیتا ہے۔ اِسی طرح بعض مساجد سے سلاطینِ مُغلیہ کی عقیدتمندی کا پتہ لگتا ہے۔ یُوں تو اس عمارت میں ہر وقت ہی ہر مذہب و ملت کے آدمیوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ مگر خاص جمعرات کی شام کو ایک نہایت ہی دلنشین سماں ہوجاتا ہے۔ صدر دروازہ کے قریب آتے ہی دماغ خوشبوؤں سے معطر ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہیں گلفروشوں کی بہت سی دُکانیں ہیں جہاں پھُول غنچے کے جامہ سے اور غنچے درختوں کے کُنج سے بیقراری کے ساتھ نکل کر اُسی طرح پہنچ جاتے ہیں جس طرح پیاری پیاری صورت والیاں جوشِ جوانی کی ترنگ میں اِشتیاقِ زیارت پُورا کرنے کے لئے درگاہ میں آجاتی ہیں۔ ہر ایک حِصّہ میں لوگوں کے غول کے غول خراماں اور سرگرمِ گفتگو دکھائی دیتے ہیں۔ اِسی طرح دو ایک جگہ دُنیا کی حوروں کے مجمعے ہوتے ہیں اور پھر ساتھ ہی مُشتاقانِ دید کے جھمگھٹے جو جمعرات کی حاضری اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہر ایک دیکھنے میں چاق چوبند اور ساز و یراق میں دلپسند۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دُنیا کے بیفکرے یہیں جمع ہوگئے ہیں جو باوجود ایسے بزرگ مقدس کے مزارِ پُرانوار پر حاضر ہونے کے دین و دُنیا کے تفکرات سے فارغ البال ہیں۔ یہ کہنا چاہیئے کہ نازفروشی و نازآفرینی اور حُسن پرستی کا بازار لگا ہوا ہے اور کیا تعجب ہے جو دامانِ شرم بھی گُستاخ ہاتھوں کی شوخیوں سے چاک ہوجاتا ہو۔ علاوہ اِنکے اور زائرین بھی جوق جوق آتے ہیں اور اپنی اپنی حیثیت کے موافق چڑھاوہ چڑھاتے ہیں جس کے ذریعہ سے خُدامِ درگاہ کو مفت خوری کے سامان میسّر آتے ہیں۔ قبلِ مغرب دو چار مقامات پر کوئی نہ کوئی خوش الحانی کے جوہر دکھانے

بھی بیٹھ جاتا ہے اور نوخیز و با مذاق طبیعتوں کو کشاں کشاں اپنی طرف بُلا لیتا ہے۔ ایک دروازہ کے سامنے کوئی زاہد فریب خواجہ حافظ کے کلام معجز نظام سے دلوں کو ہلا رہا ہے اور ان اشعار کی تکرار ہے ؎

اے فروغِ حسنِ ماہ از روئے رخشانِ شما ۔ آبروئے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما
عزمِ دیدارِ تو دارد جان برلب آمدہ ۔ بازگردد یا برآید چیست فرمانِ شما

تو دوسرے دروازہ کے سامنے کوئی باکمال قوال ان اشعار پر صوفیوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا رہا ہے۔ ؎

بوئے نافہ کاخر صبا زان طرہ بکشاید ۔ ز تابِ جعدِ مشکینش چہ خون افتاد در دلہا
بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید ۔ کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہردم ۔ جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

حجروں اور چھوٹی چھوٹی صحنچیوں میں جاکر دیکھئے تو کچھ مردانِ باخدا تلاوتِ قرآن اور تسبیح و تہلیل میں مصروف پائے جائینگے۔ غرضکہ انہیں اشغال میں وقت گذر جاتا ہے۔ اور قریب کی مسجد شاہجہانی سے جو سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ مؤذن اَللّٰہُ اَکبَرْ کی دل ہلا دینے والی آواز بلند کر دیتا ہے اور کچھ لوگ پابندی کے خیال سے اور کچھ شرما شرمی اس سفید عمارت کا راستہ لیتے ہیں اور کچھ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے ہیں۔ اسی وقت "بلند دروازہ" پر جو واقعی اسم بامسمّٰے ہے۔ نوبت بجائی جاتی ہے۔ جو تمام شہر میں اپنا غلغلہ پہنچا دیتی ہے۔ اور رنگ برنگ کی چڑیاں اُڑ اُڑ کر ادھر سے اُدھر اُن عالی شان درختوں پر بیٹھتی جاتی ہیں جو احاطہ درگاہ میں واقع ہیں اور دُور دراز کا سفر طے کئے ہوئے زائرین کو آرام پہنچاتے ہیں۔ انکا چہچہا کر باتیں کرنا اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر بیٹھنا کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ جن پہلی شاخوں پر وہ بیٹھتے ہیں وہ خود بھی خوشی سے جھومنے لگتی ہیں۔ اور اُنکے پروں سے مختلف

آوازیں باجے کی طرح نکلتی ہیں جن میں زیروبم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
بعد نماز سب سے پہلے گنبد مزار مبارک کے اندر روشنی ہوتی ہے اور چند لوگ شمعیں اپنے سروں پر رکھکر کچھ فارسی اشعار حضرت اقدس کی تعریف میں پڑھتے ہیں جن میں یہ بار بار آتا ہے ؎

خواجۂ خواجگاں معین الدین اشرف اولیائے روئے زمیں

اس کے بعد تمام درگاہ میں جمعرات کی غیر معمولی روشنی ہوتی ہے۔ جا بجا جھاڑ قندیلیں اور فانوس لٹکائے جاتے ہیں۔ جو وصل نصیب عشاق کے دل کے کنول کی طرح روشن ہو جاتے ہیں۔ اور اب تمام عمارت ایک بقعۂ نور معلوم ہوتی ہے۔
جب تاروں کی گلکاری آسمان کو کسی کی جبینِ ناز بنا دیتی ہے اور جب وہ منھ بند کلیاں جنہوں نے روز روشن میں ذرا ذرا مسکرا کر عنادل میں ایک شور برپا کر دیا تھا اور وہ شرمیلے غنچے جنہوں نے دن میں تھوڑا سا نقاب اپنے منھ سے سرکا کر دیکھنے والوں کو اپنی پیاری دلفریب نازک صورت کی طرف متوجہ کر دیا تھا پھولوں کی طرح کھل جاتے ہیں یعنی تقریبًا آٹھ بجے پھر لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خاصکر عورتوں کا ایک مجمع کثیر ہو جاتا ہے۔ جنکی پردہ داری رات کی سانولی سہانی تیرگی اچھی طرح کرتی رہتی ہے۔ مگر شوقین لوگ ہیں کہ وہ بار بار اسی انبوہ میں ہو کر گذرتے ہیں۔ جب کافی مجمع ہو جاتا ہے تو مزار مبارک کے صدر دروازے کے سامنے مجلس حال و قال منعقد ہوتی ہے جسکو ایک شاہی دربار کا نمونہ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔ سجادہ نشین صاحب نہایت تزک و احتشام کے ساتھ جلوہ افروزِ مجلس ہوتے ہیں اور چوبدار و نقیب اپنے اپنے قرینے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف صوفیاء کرام کا جماؤ ہوتا ہے اور دوسری طرف عوام کا۔ اور قوالی شروع ہو جاتی ہے ؎

سخی سرکار ہے تیری - معین الدین اجمیری :
تیرے دربار جو آوے - مرادیں دل کی وُہ پاوے

یہ اشعار ہیں جو بہت سے صافی دلوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا دیتے ہیں - یہ ایک باقاعدہ جلسہ ہوتا ہے - جس کے متعلق کچھ ضوابط مقرر ہیں جو مقررہ متوسلینِ درگاہ کو (نہ کہ عوام کو) مٹھائی تقسیم ہونے کے بعد برخاست ہوجاتا ہے - اور لوگ اپنے اپنے کارنامے بیان کرتے ہوئے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور گویا اُسی وقت سے آنے والی جمعرات کا انتظار شروع ہوجاتا ہے - ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد رُوئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

یہ مختصر حالات ہیں اجمیر کی جمعرات کے جبکہ ایک غیر معمولی چہل پہل ہو جاتی ہے - اور جس سے متعلقینِ درگاہ کو ایک معقول رقم ملجاتی ہے - کیونکہ اُنکو روشنی وغیرہ میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا بلکہ اِسکا بار خزانہ درگاہ پر ہے جو جائداد موقوفہ کی آمدنی اور ہز ہائی نس نظام کی دریا دلی سے معمور ہوتا ہے - اِس آمدنی سے رفاہ عام کے کام بھی انجام پذیر ہوتے ہیں - جیسے شفا خانہ و مدرسہ - مگر اُنکی حالت بھی ایسی ہی ہے جیسی انتظام جائدادِ وقف کی یا مسلمانوں کے اور اوقاف کی - زیادہ افسوس اسکا ہے کہ یہ آمدنی بھی مسلمانوں کو مُفت خوری کا عادی بناتی ہے جس مرض کی وجہ سے قوم کی تباہی یقینی ہے -

اگر زندگی باقی ہے تو آیندہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے تاریخی حالات جو نہایت دلچسپ ہیں ہدیہ ناظرین کئے جاوینگے - کیونکہ جو کتابیں سوانح عمری کی لکھی گئی ہیں میرے خیال میں اُن میں سے کوئی افراط و تفریط سے خالی نہیں ہے - علاوہ اسکے بوجہ انتہائی عقیدتمندی بہت سی باتیں خلافِ قیاس اُن میں درج کردی گئی ہیں - یار زندہ صحبت باقی +

نیاز احمد (از میرٹھ)

تاریخ کوہ نور

لاہور کے عجائب خانہ کے اس ہال میں جہاں صوبہ کی صنعت و حرفت کے نمونہ دھرے ہوئے ہیں۔ بائیں طرف لاثانی ہیرے کوہ نور کا کنٹر کا تراشا ہوا نمونہ موجود ہے۔ ایک وقت میں یہ ہیرا ہندوستان کے سابقہ فرمانرواؤں کی زیب و زینت رہ چکا ہے۔ یہ وہی مشہور ہیرا ہے جس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے بازو میں پہنا کرتا تھا اور ۱۸۵۱ء کی ہائیڈ پارک کی نمایشگاہ میں اسکوائوزلر صاحب نے پیش کیا تھا۔

اس مشہور ہیرے کی تاریخ بہت سے مبالغہ آمیز قصوں کے سبب سے کالعدم ہوگئی ہے۔ ہندوؤں کے افسانوں کے مطابق یہ پایا جاتا ہے کہ یہ ہیرا مہابھارت کے مشہور ہیرو راجہ کاما کی ملکیت تھا۔ جو تقریباً (۳۰۰۰) تین ہزار برس قبل مسیح راج کرتا تھا۔ ایرانی یہ کہتے ہیں کہ یہ ہیرا مع دریائے نور کے بادشاہ افراسیاب اپنے تن پہ درباری جلوسوں کے موقعوں پر زیب کرتا تھا۔

دریائے نور بھی ایک مشہور ہیرا ہے جو کہ وزن میں ۱۸۶ قیراط ہے شاہنشاہ ایران کے خزانے میں اب تک موجود ہے اور دنیا میں بیش بہا جواہر ہے۔ اس کے بعد اسکا کچھ پتا نہیں چلتا لیکن ایک عرصہ کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یہ گوالیا کے مشہور راجہ بکرماجیت کے قبضے میں آیا جسکو سلطان ابراہیم لودہی نے پانی پت کی مشہور لڑائی ۱۵۲۶ء میں اپنی مدد کے لئے بلایا تھا اور آخر کار بڑی جوانمردی سے لڑکر سلطان کے پہلو میں جان دی۔ اسوقت اس راجہ کا کنبہ اور اس کی نسل کے دوسرے سردار ابراہیم کے نام سے شہر آگرہ پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ فتح کے بعد جب بابر نے ہمایوں کو دارالسلطنت آگرہ کو حاصل کرنے کے لئے روانہ کیا

توہمایون نے بڑی مہربانی سے اس خاندان کو لوٹ اور غارت سے بچایا اور اُنکے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

انہوں نے اس کے تشکریہ میں بہت سے قیمتی زیورات اور جواہرات اور بیش قیمت پتھر گذرانے ۔سلطان ظہیرالدین بابر بادشاہ لکھتے ہیں ۔ انکے درمیان ایک ہیرا تھا جسکو سلطان علاءالدین نے حاصل کیا اور ایسا بیش قیمت تھا کہ جوہریوں نے اس کے نرخ کا اندازہ دنیا کا آدھا روزانہ خرچ خرچ لگایا ۔اسکا وزن آٹھ مثقال یا ۳۲۰ رتی ہے ۔جب میں آگرہ پہنچا توہمایون نے پیشکش کے طور پر حاضر کیا اور میں نے اسکو اپنے بیٹے ہی کو واپس کردیا۔

یہ ہیرا جب راجہ بکرماجیت کے خاندان نے ہمایون کو حوالے کیا تو ہم کو معلوم ہوا کہ ہندو راجہ کے پاس سے آیا ۔لیکن بابر کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکو سلطان علاءالدین نے ۱۳۰۶ئ میں حاصل کیا لیکن پھر یہ پتا نہیں لگتا کہ یہ مسلمانوں سے نکل کر کس طرح ہندو راجہ کے قبضہ میں آیا ۔تاہم سلطان بابر کے حوالے سے جو ایک باریک بین شہنشاہ تھا ۔ہم یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ اسکو خلجی شہنشاہوں نے قریباً دو صدی پہلے ہی ہندو مالکوں سے لے لیا تھا تب سے برابر مسلمانوں کے قبضہ میں رہا ۔ دراصل یہ ہیرا اسوقت ابراہیم لودھی کی ماں نے شہنشاہ کو پیش کیا تھا ۔

ایک ہیرا جسکو ڈاکٹر برنیر نے لاثانی کہا ہے بادشاہ شاہ جہان غازی کو میر جملہ نے نذرانا جوکہ اس سے پہلے عبداللہ قطب والی گولکنڈہ کا وزیر تھا اور جواہرات کا سوداگر بھی تھا ۔اور آخرکار کسی سبب سے رنجیدہ خاطر ہوکر شاہجہان کی طرف جا ملا ۱۶۵۶ئ میں گولکنڈہ کی فتح کے لئے امیر جملہ نے فوج کی کمان افسری پانے پر یہ لاثانی ہیرا شاہ جہان کے حضور میں پیش کیا ۔

اب یہاں یہ حیرانی ہوتی ہے کہ کس طرح مغلوں کے ہاتھ سے نکل آیا اور میر جملہ کے

پاس پہنچا لیکن یہ شبہ کچھ یوں اس طرح دُور ہوجاتا ہی کہ جب ہمایون ایران کو بھاگا تو پیچھے انقلابِ زمانہ سے یہ دکن کے فرمانرواؤں کے قبضہ میں پہنچا۔ اور اسی طرح سے میر جملہ نے اپنے قابو میں کر لیا ہوگا۔

بعض مصنف لکھتے ہیں کہ ہیرا کوہ نُور میر جملہ نے گولکنڈہ کی کان میں پایا تھا اور وہ ہیرا جسکا حال بابر نے لکھا ہے وُہ اور ہے لیکن یوروپین سیاحوں نے یہی رائے قائم کی تھی۔ کہ یہ قدیم ہیرا ہے مثلاً ارسکن پروفیسر مسکیلین اور جنرل کننگ ہم وغیرہ سب اسی بات پر متفق ہیں کہ گریٹ مغل ڈائمنڈ جس کا حال ٹیورنیر نے بیان کیا ہے وہی ہے جسکا ذکر شہنشاہ بابر نے کیا ہے۔"

سنہ ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب نے اپنے شاہی خزانہ کے زیورات ایک فرانسیسی جوہری سوداگر ٹیورنیر نامی کو دکھلائے جس میں اس کے بیان کے مطابق اس نے ایک ہیرا دیکھا کہ جو وزن میں ۳۱۹ رتی تھا۔ اس ہیرے کو ٹیورنیر مغل اعظم کے ہیرے کے نام سے پکارتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو کہ یہ وہی ہیرا ہے کہ جسکو ڈاکٹر برنیر نے لاثانی کہا ہے۔ اور بابر کا ہیرا جسکا حال تذکرہ بابری میں ہی۔ اس کا وزن جتنا کہ ٹیورنیر نے جانچا ہے ٹھیک بابر کے تذکرہ سے منطبق ہے۔ ٹیورنیر لکھتا ہی کہ مغل اعظم کا ہیرا وزن میں ½ ۳۱۹ رتی ہے۔ اسکی چمک نہایت ہی شفاف خالص پانی کی سی ہے۔ وضع نہایت خوبصورت صرف کنارے پر ایک چھوٹا سا چپٹا داغ ہے۔ وہ اس ہیرے کی قیمت ۱۸ شلنگ۔ ۸۷۹۲۴۵ پونڈ کا تخمینہ لگاتا ہی۔

سنہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی کو لُوٹا تو اُس نے شاہی جواہرات میں اسکو دیکھ کر کوہ نُور کا لقب دیا جو ایک نہایت ہی مناسب نام ہی یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ ہیرا خاص نام سے پکارا گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یہ ہیرا نادر شاہ کو محمد شاہ شہنشاہ دہلی سے بھائی چارہ کے طور پر پگڑی بدلتے ہوئے ہاتھ لگا۔ لیکن دیگر مورخ اس

واقعہ کو بالکل غلط بتاتے ہیں۔

جب نادر شاہ نے ۱۷۴۷ء میں فتح آباد علاقہ خراسان میں وفات پائی تب یہ
ہیرا مع تخت کے علی قلی خاں عرف علی شاہ کے تصرف میں آیا جس نے نادر کو
سر ولیم جان سکے تذکرہ کے مطابق اپنے چچا کا تاج اور تخت حاصل کرنے کے لئے
قتل کیا تھا۔

علی شاہ کے اندھا کئے جانے اور تخت سے اتارے جانے کے بعد یہ ہیرا
نادر شاہ کے پوتے شاہ رخ مرزا کے پاس آیا جو مشہد میں اپنے محل میں کنارہ کش
ہوگیا وہاں اسکو آغا محمد خاں بانئے خاندان قاچار نے قید کرکے کوہ نور حاصل کرنے
کی غرض سے نہایت سخت تکلیف دی لیکن لاحاصل۔

پھر ۱۷۵۱ء میں شاہ رخ مرزا نے احمد شاہ دُرّانی کو اسکی خدمات کے عوض میں
عطا کیا۔ احمد شاہ کے مرنے کے بعد یہ اس کے بیٹے جانشین تیمور شاہ کی میراث
میں آیا۔ جب اس کی بھی رحلت کا وقت قریب آیا تو اس نے یہ اور مع شاہی جواہرات
کے اپنے بڑے بیٹے شاہ زمان کو سونپا۔ آخرکار اسکو بھی اس کے بھائی محمد شاہ
نے اندھا کرکے تخت سے اتار دیا۔ لیکن ہیرے کو اس نے ایک تدبیر کے ساتھ
حفاظت میں رکھا۔ پھر یہ اس کے بھائی شاہ شجاع کے قبضہ میں آیا۔ مسٹر ایلفنسٹون
کے بیان کے مطابق یہ ہیرا مع دیگر جواہرات کے حجرے کی اس دیوار کے اندر مخفی کیا
ہوا پایا گیا تھا۔ جس میں زمان شاہ مقید تھا۔ جب مسٹر موصوف نے شاہ شجاع سے پشاور
میں ملاقات کی تو اس نے شاہ شجاع کے بازو میں پہنا ہوا دیکھا۔ اور اشارہ سے
بتاتا ہے کہ یہ وہی ہیرا ہے جس کا ذکر ٹیورنیر نے کیا ہے۔

جب ۱۸۱۳ء میں شاہ شجاع اپنی بیوی وفا بیگم کے ساتھ مدد کے لئے لاہور آیا
تو رنجیت سنگھ نے جو کہ اخیر عمر میں خزانہ کے جمع کرنے کی بڑی ہوا و ہوس رکھتا تھا۔

شاہ شجاع کو تین لاکھ روپیہ نقد پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر اور کابل کا تخت حاصل کرنے کے لئے مدد دینے کے وعدے پر اسکو کوہ نور کے دینے پر مجبور کیا۔ یہ دلچسپ واقعہ جس کے سبب شاہ شجاع ہیرا دینے پر مجبور ہوا۔ اُن لوگوں نے جنہوں نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے۔ اِس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

یکم جون ۱۸۱۳ء کو مہاراجہ نے فقیر عزیزالدین - بھائی گوربخش سنگھ اور جمعدار کھوسلا سنگھ کو شاہ شجاع کے پاس ہیرا طلب کرنے کو بھیجا۔ شاہ نے جواب دیا کہ مہاراجہ کو بذاتِ خود آنا چاہیئے۔ اس خوشخبری کے سُننے میں مہاراجہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ دائیں اور بائیں سواروں کو بطور باڈی گارڈ کے لیکر اور ایک ہزار روپیہ نقد اپنے ہمراہ رکھ کر شاہ کے رہنے کی جگہ مبارک حویلی کو روانہ ہوا۔ شاہ نے نہایت افتخار کے ساتھ مہاراجہ کا استقبال کیا۔ دونو بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔

آخرکار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بے قرار ہو کر اپنے ایک مُلازم کے کان میں شاہ کو مُلاقات کی غرض جتانے کے لئے کہا۔ نوکر نے حکم کی تعمیل کی۔ شاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اپنے ایک نوکر کو آنکھ سے اشارہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد دریدہ جامہ میں لپیٹا ہوا لایا۔ اور برابر برابر فاصلہ سے دونوں کے بیچ میں رکھ دیا۔ آپس میں دوستی قرار دی گئی اور دونوں کے درمیان بھائی چارہ کے طور پر پگڑی بدلی گئی ہیرا کھولا گیا۔ رنجیت سنگھ نے اسکو پہچان کر اس ہیرے کی قیمت دریافت کی۔ شاہ نے جواب دیا۔ کہ اس کی قیمت لاٹھی ہے۔ میرے باپ دادا نے اسی طرح سے حاصل کیا۔ اور تم نے مجھ سے بہت تکلیف کے بعد قابو کیا۔ اور تمہارے بعد ایک اور بادشاہت قائم ہوگی اور اسی طریقوں سے تم کو بھی اس سے محروم کریگی۔ مہاراجہ نے اس کلام سے کوئی غصہ نہیں کھایا۔ اور چپکے سے جیب میں ڈال کر محل کو روانہ ہوگیا۔

محل میں داخل ہونے کے بعد مہاراجہ نے ایک بڑا دربار منعقد کیا اور شہر

اس موقع کی یادگار میں روشنی کی گئی۔ لیکن بدبخت اور مقید شاہ شجاع کے تنگ و تاریک قیدخانہ میں ایک بھی چراغ نہ جلایا گیا۔ وُہ وعدہ جو مہاراج نے شاہ شجاع سے کیا تھا۔ کبھی وفا نہ ہوا۔

موت سے دو گھنٹے پہلے رنجیت سنگہ نے اپنے تمام جواہرات لانے کا حکم دیا۔ اور دیگر خیرات میں اُس نے اپنی عاقبت کی خیر کے لئے یہ وصیت کی کہ کوہ نُور ہیرا جگن ناتھ مندر میں بُت کی زیبائش کے لئے بھیجا جائے۔ اور اپنے ہاتھ سے پانی چھڑکنے کی آرزو کی۔ جو کہ ہبہ نامہ کا ایک نشان ہوتا تھا۔ لیکن بیلی رام مہتمم توشہ خانہ نے اس وجہ سے کہ یہ بھی حق وارث کا حصّہ ہے۔ اس کے برآمد کرنے سے انکار کیا۔ کھڑک سنگہ اور نونہال سنگہ کے مرنے کے بعد جب شیر سنگہ پنجاب کا راجہ قرار دیا گیا۔ تو گلاب سنگہ نے اپنے نئے مہاراجہ کو مبارکباد دی اور آداب بجالاکر خود اپنے ہاتھ سے مہاراجہ کو کوہ نور دیا۔

۱۸۴۹ء میں جب سرکار انگریزی نے پنجاب کو فتح کیا اور دلیپ سنگہ تخت سے دست بردار ہوا تو قاعدہ کے مطابق بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کو دیا۔ جا کر جان لارنس کی حفاظت میں رکھا گیا۔ بوسورتھ سمتھ لارڈ لارنس کی سوانح عمری میں کوہ نور کا عجیب واقعہ بیان کرتے ہیں۔

جان لارنس جبکہ دُنیا کے آرام بخوبی میسّر تھے۔ دولت کی طمع سے ایک لاپروا شخص تھا۔ اور کبھی شاذ و نادر ہی اپنے کوٹ اور کالر کی درستی میں التفات کرتا تھا۔ اس موقع پر جب ہیرا اسکو سپرد کیا گیا تو اُس نے نہایت ہی لاپروائی سے ایک ٹین کی چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اور اس خیال کو فراموش کر دیا۔ چھ ہفتے کے بعد لارڈ ڈلہوزی کے پاس سے ایک پیغام آیا کہ وہ ہیرا بلکہ مہارانی قیصرہ ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے۔ یہ مضمون پڑھکر جان لارنس صاحب

یت پریشانی اور اضطراب کی حالت میں دوڑے ہوئے گھر میں آئے۔ جاتے ہی اپنے
پرانے خدمتگار کو بلایا۔ کہ تھوڑا عرصہ ہوا - ڈل! کیا تم نے ایک ڈبیا جو کہ میری پاکٹ
تھی - دیکھی ہے ؟

اُس نے کہا ہاں صاحب ڈبیا کو میں نے آپکے ایک صندوق میں رکھا ہوا ہے۔ جان
س صاحب نے اسکے لانے کا حکم دیا۔ نوکر دوڑا ہوا لایا۔ صاحب نے کہا کہ اسکو کھولو۔ کھولا گیا
چھا کہ کیا ہے؟ کہا صاحب کچھ نہیں ہے۔ مگر ایک کنٹر کا ٹکڑا ہے۔ تب جان لارنس
پریشانی دُور ہوئی - ۱۸۵۲ء میں یہ آٹھ ہزار پونڈ کی لاگت سے پھر تراشا گیا - جس طریقہ سے کہ
رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے حاصل کیا بخوبی معلوم ہو گیا ہے - شاہ شجاع جو کہ سکھ دربار
بھروسہ کر کے مہمان ہو کر آیا - یہاں اس بدبخت مظلوم کے ساتھ یہ سلوک ہوا - کہ زندان
مقید کیا گیا - اور بجائے اس کے کہ اسکی مدد کی جاتی اور اسکو کابل کا تخت دلایا جاتا
کے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ اسکو اپنی ہی پونجی سے محروم کر دیا - اور اُس نے اس مشرقی
کی قدیم رہنمونی کا خیال نہ کیا - کہ مہمان کی کیا خاطر مدارات ہونی چاہئے - نہیں نہیں -
س نے اس کے برخلاف انکو توڑ کر اپنے نام پر تخت دھبا لگایا - شاہ موصوف آخر کار اپنی
شمندی سے قید خانہ سے بچ کر سرکار انگریزی کے پاس لودیانہ مدد کے لئے چلا آیا - جہاں
ہربان گورنمنٹ نے اس کے ساتھ نہایت اچھی طرح سے سلوک کیا - اور اس کی ہر طرح
مدد کی -

آجکل یہ بیش قیمت ہیرا ہماری فیاض مہربان گورنمنٹ انگریزی کے پاس ہے جو کہ اب اس ملک
حق وارث ہے -

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت　　رفت و منزل بدیگرے پرداخت

ہونا چاہئے کہ یہ ہیرا جسکی عمر ہندو افسانوں کے مطابق چار ہزار برس ہوتی ہے کس طرح دست بدست شہنشاہوں
قبضہ میں آیا - لیکن اسکی قابض زندہ نہ رہے - اور حسرت اور ناامیدی کے ساتھ دنیا سے کوچ کر گئے +

(مستند جعفر حسین جم

پروازِ وقت

کہاں ہیں وہ گذشتہ نسل کے لوگ جو ہماری طرح اس ہستی کی نمائشی بھڑک کے پیچھے رواں - اپنے کام میں کوشاں سلطنت اور امورِ ملکی کی تجاویز میں مستغرق صراط مستقیم سے گم گشتہ اور دل آویز باتوں کے فدائی تھے ؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو چند ہی سال ہوئے اس مصروفِ تماشا گاہِ ہستی کے محرک اور رُوح رواں تھے ؟ کہاں ہیں وہ کسان جو اس زمین پر رہتے تھے جہاں اب تم ہو ؟ کہاں ہیں وہ پسینے بہاتے والے مزدور جو کبھی تمہارے گھروں اور گاؤں کے مکین تھے ؟ کہاں ہیں وہ واعظ جو نیکی کے سبق کی تلقین کرتے تھے اور اس دُنیا کی نمائشوں سے خبردار ؟ اور کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنے متبرک دنوں میں طلبِ عبادت پران مکانوں میں آ جمع ہوتے تھے - جس جگہ اب تم متمکن ہو ؟ آہ ! اب اُنکی جائے سکونت بے مہر قبر ہے - یعنے فراموشی اور سکوت کی دُنیا ! اُنکے نام تک بھی صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں اور انکے اپنے ہی بچے انہیں اپنی یاد سے بُھلا بیٹھے ہیں - انکے ہاتھوں کی محنت شاقہ یا تو خس وخاشاک کے نیچے دب گئی ہے اور یا زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے اُسے بالکل ویران کر دیا ہے - ہم انہی آبا و اجداد کی اولاد ہیں اور اس حیرت انگیز اور پُرہیبت نعیبے کے وارث -

یہ وقت جس میں مَیں رہتا ہُوں - دُنیا کی اس بڑی تواریخ کا ایک لمحہ ہے - جو ساعت کی تیزروی ہے اور عارضی خوشی کا خواب - یہ شہابِ ثاقب کی ایک فوری جھلک ہے اور ایسا نازک پھول ہے جو آسمان کی ذراسی تیوری سے بھی مُرجھا جاتا ہے - یہ ایسی کہانی ہے جسکی یاد یُونہی فراموش ہو جاتی ہے - اور یہ ایسا دن ہے جسکو شبِ دراز کا سکوت دھندلا اور تاریک کر دیتا ہے - تھوڑے سے ہی سالوں کے بعد ہمارے سر

اس سرزمین کو سونپ دی جائینگے اور سبزہ انکا قبر پوش ہوگا۔ آئندہ نسل کے لیئے ہماری قبریں جولانگاہ ہونگی۔ وُہ ہمارے لیئے چند اِک دن روتے رہینگے۔ چند اک مہینے ہماری باتیں بھی کیا کرینگے اور چند اک سال یاد بھی رکھینگے پھر اس کے بعد ہمارا نام اِس دارِ ہستی سے مِٹ جائیگا اور کوئی نام لیوا تک بھی باقی نہ رہیگا۔

تمام دل آویز بیانوں میں سے یہ بات مجھ پر بہت اثر کرتی ہے کہ ایک صدی کے بعد یہ دُنیا پھر ایسی کی ایسی ہو جائیگی۔ لوگ اِسے بسا اوقات ضرب المثل کے پیرائے میں ایسی دل لگی کے ساتھ جو اسکی وقعت سے آگاہ نہیں ہے اِستعمال کرتے ہیں۔ ایک سو سال بعد۔ اللہ اکبر! کس تیزی سے یہ صدی اپنے اختتام پر آئیگی۔ آجکا دن ڈھل جائیگا اور اس طرح کے کچھ دن ایک سال بنجائینگے۔ پھر سال کے بعد سال گذریگا اور کچھ سال ایک صدی بنجائینگے۔ یہ تھوڑا تھوڑا سا وقفہ وقت کا مجتمع ہو کر اس عظیم عرصہ روزگار کو بھر دیگا۔ جو تصوّر کی نظروں میں اتنا دراز اور لاانتہا نظر آتا ہے۔

آنیوالی صدی اس تباہی کو دیکھیگی۔ ہر ایک جاندار چیز جو آج نظر آتی ہے دُنیا سے نابود ہوگی۔ وُہ معصوم بچّہ جو ماں کی چھاتی سے لپٹا ہوا ہے۔ صرف اپنے پوتوں کی یاد ہی رہجائیگا۔ زندگی اور شعور کا یہ منظر جو میرے روبرو ہے تاریکی اور نفرت انگیز جگہ سے مبدّل ہوجائیگا۔ وُہ لوگ جو میری آواز اب سنتے ہیں۔ خود بھی بولنے سے عاری ہونگے۔ اُنکی یاد اس صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہوگی اور اُنکا جسم حشرات الارض کی مہمانیوں میں صرف ہوگیا ہوگا اور کیڑے مکوڑوں کی اُنپر بسر ہوگی۔ امتدادِ زمانہ اُنکی تابوتوں کو برباد کریگا اور اُنکی ہڈیاں نئی قبروں کے ایک طرف پھینکدیجائینگی۔ کیا یہی سب چیزوں کا انجام ہے؟ کیا یہی مآلِ کار ہر انسان کا ہے؟ اور کیا یہی اختتام ہے اسکی مصروف زندگی کا؟ کیا بجز دفن اور قبر کے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اس یاس بھری تصویر کی مایوسی کو کم کرسکے اور ان وحشتناک خیالوں کو دُور کرسے؟ کیا ہم ضرور ہمیشہ کے لیئے خاک میں سوئینگے اور اس آسمانی روشنی کو دائمی الوداع کہ جائینگے؟

نور (ترجمہ)

چاند

اے قمر کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی رات کے دامن میں ہے گویا سحر سوئی ہوئی
میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
حسن کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے چاندنی میں تیری اک تسکینِ غم آمیز ہے
قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو زرد رُو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو
گھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دور چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور

ہاں اتر آ میرے دل میں ساتھ لیکر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں
میں رہِ منزل میں ہوں تو بھی رہِ منزل میں ہے تیری محفل میں ہے جو سنسان میرے دل میں ہے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے
انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل
پھر بھی اے ماہ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے یعنے میں صیاد ہوں جسکا وہ آہو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

اقبال

قصیدۂ مدحیہ

(بتقریب سالگرہ حضور ملک معظم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دام ملکہ واقبالہٗ)

دیکھ لے قادرِ بے چون و چگوں کی قدرت — گنج وحدت میں جو منظور ہو سیرِ کثرت
آسماں رنگ بدلتا ہے زمیں پر کیا کیا — رنگ لاتی ہے نئے۔ روز زمیں کی حرکت
صفحۂ دہر پہ جم جاتے ہیں کیسے نقشے — بنتی ہے عالمِ ایجاد کی کیسی صورت
دھوپ چھاں کا ہی دوپٹہ کبھی انعامِ زمیں — کبھی چادر ہے ستاروں کی فلک کا خلعت
کہتے ہیں جسکو جہاں ہے وہ طلسمِ نیرنگ — ایک سی رہتی ہی نہیں اس میں کسی کی حالت
ہے لڑکپن کو کبھی جوشِ جوانی کی خوشی — کبھی پیری کو جوانی کی ہے تازہ حسرت
آج ہے ذوق جسے نشہ اُسے کل ہوگا — آج عشرت ہے تو موجود ہے کل کو عسرت
چشمِ بینا کو ہیں موجود مثالیں۔ لاکھوں — کروٹیں لی ہیں زمانے نے بدلکر رنگت
اک زمانہ تھا کہ بابل کو تھی حکمت کی چاہ — اک زمانہ تھا کہ آرمن کی تھی کامل صنعت
کبھی غلبہ تھا عرب کا کبھی تھا اوجِ عجم — روم کو تھی کبھی یونان پہ حاصل سبقت
عرش تھی علم و ہنر کا کبھی ارضِ یونان — روشنی جسکے کمالات کی تھی مہر صفت
مصر کا ایک زمانہ تھا کہ میناروں سے — اونچی رفعت میں تھی دانشوری و اہلیت
کبھی خمخانۂ عالم میں فلاطوں تھا مُغاں — کبھی بقراط۔ ارسطو کی کبھی تھی شہرت
راحِ حکمت سے کبھی شیشۂ لقماں تھا پُر — گنجِ قاروں کی کبھی روح رواں تھی دولت
حیف۔ یہ پھول تھے جس ملک میں وہ گلشنِ ملک — ہوگیا جور سے جلادِ خزاں کے۔ غارت
وہ بھی انسان تھے جو مرگئے پر جیتے ہیں — یہ بھی انسان ہیں جیتے ہیں مگر مُردہ صفت
پہلے بھی ہوتا تھا پیدا انہیں ہر فردِ بشر — پہلے بھی تھی۔ یہی ترکیب۔ یہی تھی صورت

کس لیے اب نہیں اگلی سی وہ باتیں یارب　　کس لئے اب ہے زمانے کی دگرگوں حالت؟
یہ سبب ہے کہ جہالت کی گھٹائیں آئیں　　یہ سبب ہے کہ وہاں ظلم کی چھائی ظلمت
علم کے نور سے تھی عقل کو توقیرِ فروغ　　علم کی شمع سے تھی بزم کو اُنکی زینت
ہاتھ آتی ہے نہیں روشنی عظمت یاں　　کُنجِ تاریک میں کرتے ہیں جو ہر دم محنت
بعد محنت کے نظر آتا ہے دولت کا نشان　　پہلے پھول آتا ہے پھر آتی ہے پھل کی نوبت
تمغۂ جاہ کے شایاں ہیں گلے ایسوں کے　　آپ کر سکتے ہیں عالم میں جو اپنی عزت
یوں تو دنیا میں ہاں ہے نہ رہے گا کوئی　　جانِ شیریں کو مقرر ہے فنا کا شربت
آج تصویرِ سکندر ہے فقط آئینہ　　نہ وہ دارا کی نہ داراب کی باقی صورت
نہ تو بہمن ہے نہ کاؤس نہ کیخسرو ہے　　نہ فریدوں کی نہ جمشید کی شان و شوکت
وہ کلی کھل کے دکھاتی ہے چمن میں جو بہار　　ایک دن اُسکو اٹھانی ہے خزاں کی آفت
روح کو تن کے قفس میں نہیں راحت حاصل　　قید پنجرے میں ہو طوطی تو اُسے کیا فرحت
زہر آلودہ ہیں سب مطبخِ دُنیا کے طعام　　نیک نامی ہے فقط خوانِ جہاں میں نعمت
آبداری میں پسینے کا وہ قطرہ ہے شرف؟　　جو کہ محنت کے صدف میں ہو گہر کی صورت
گرچہ مخلوق میں انسان ہے اک جسمِ نحیف　　لیکن انسان کو ہے علم سے حاصل طاقت
نیکنامی ہے وہ انسان کا ذاتی جوہر　　نیستی پر بھی نہیں جسکو فنا کی زحمت
کیا گئی کچھ نہ گئی جاہ و حکومت جو گئی　　لاکھ نعمت ہے نکونامی کی گر ہو دولت

(مطلع دوم)

جیسے یونان کو حاصل تھی کوئی دن عزت　　ہند کی بھی تھی ترقی پہ قدیمی حالت
نورِ صنعت سے منور تھا یہاں کا عالم　　عطرِ حکمت سے معطر تھا دماغِ جودت
ہند وہ ہند کہ تھا نجم و جفر میں یکتا　　موسیقی اور عمارت میں تھی جسکی شہرت
مشتہر فنِ طبابت میں۔ ادب میں کامل　　سیکھنے آتی تھی مخلوق یہاں [illegible]

ناگہاں پھر گئی کچھ ایسی ہوا گلشن کی
اس گل تازہ کی جاتی رہی ساری نزہت

نہ وہ دانش۔ نہ وہ بینش۔ نہ رہی وہ خوبی
نہ وہ ندرت نہ وہ جدت نہ رہی وہ طینت

جس چمن میں کہ چہکا کرتی تھی بلبل گل تر
تنکے چنوانے لگا بخت بہ یاس حسرت

شور بختی نے نمک جہل کا ایسا چھڑکا
ہو گیا تلخ ہنرمندی کا میٹھا شربت

ہر زمانے میں یہ ہے ضرب مثل اوّل سے
پھرتی ہے کوڑی کی بھی بارہ برس میں قسمت

ہند میں ایسی حکومت نے مسیحائی کی
جس نے ہر جہل کے بیمار کو بخشی صحت

اپنی تہذیب کا اورونکو دکھایا رستا
اپنی اصلاح کی اورونکو دلائی رغبت

عدل نے ظلم کو انصاف نے بےرحمی کو
کر دیا دور۔ ہوئی ایسی خدا کی رحمت

بخت سوئے ہوئے ان لوگوں کے بیدار ہوئے
جن پہ تھا عرصے سے اک غلبۂ خواب غفلت

سینکڑوں ہیں کہ اسی ملک کے خود حاکم ہیں
شاہ کو انکی لیاقت پہ ہے کامل شفقت

شہرۂ آفاق ہیں انجنیری میں کتنے
روبرو جنکے ہے معمار فلک کو خجلت

کھینچیں پرکار خرد فکر کے تختے پہ اگر
ناپ لیں رشتۂ جودت سے فلک کی وسعت

شکل بنجائے بڑی جبر سے اقلیدس کی
دیکھ لے حل مقالہ میں جو انکی سرعت

بعض کی طبع رسا ماہر کل طبعیات
کیمیا بعض کی مشہور ہے اکسیر صفت

حار و بارد سے زمانے کے اُسے ہو گیا خوف
آب و آتش کی ہو معلوم جسے خاصیت

ہو گیا علم حصولی سے حضوری اُن کا
منطق و فلسفہ۔ جغرافیہ۔ ہیئت حکمت

ڈاکٹر وہ کہ جو عیسیٰ کو دکھائیں آنکھیں
لرزہ آجائے ارسطو کو جو دیکھے صورت

فکر و تشخیص کا اعجاز۔ مسیحا سے سوا
نبض عشاق سے بھی تیز ذکا کی سرعت

تار سے تار نفس دور کے رشتوں سے قریب
ریل سے خلق کا ریلا ہے میان خلقت

الغرض ہند جسے کہتے ہیں سب اُجڑا دیار
کر دیا ہے اُسے انگریزوں نے رشک جنت

بس کر اے طالب دل خستہ خموشی بہتر
مدح ممدوح نہیں تیری زباں کی طاقت

لکھ کر اشعارِ دعائیہ کر اب ختمِ کلام
ذکر اچھا ہو اجل بات کی گر دے فرصت

شاہِ خاور کی ہو شرق میں حکومت جب تک
یادِ الطاف سے مسرور رہے رُوح کو جب تک فرحت

بختِ ایڈورڈ رہے عرصۂ عالم میں بلند
اسپِ اقبال ہو جولاں بہ لوائے نُصرت

عیش ہو نور سے معمور ہو یہ سالگرہ
جلوۂ مہر سے پُرنور چراغِ صولت

عمر و دولت بڑھے ہنگام ہوں خوش کام تمام
خیر کی ہوتی رہے آپ کے دم سے برکت

طالب بنارسی۔ (از بمبئی)

شمعِ ہستی

اے شمعِ ہستی اے زندگانی
بھاتی ہے دل کو تیری کہانی

ہے کوچ تیرا ہر لمحہ جاری
جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری

بجلی سے بڑھ کر بے تاب ہی تو
یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو

کیوں چُپ چپاتی ہر دم رواں ہو
آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے

ظاہر ہیں یوں تو سب پر ترے گُن
لیکن نہ پایا تیرا سر و بُن

گذرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے
جاہل ہیں تیرے سرِ نہاں سے

فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے
ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے

اے زندگانی اے شمعِ ہستی
سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی

چاروں طرف تھی چھائی اندھیری
ناگاہ اٹھی اک ڈیک تیری

وہ ڈیک تھی بس نورٌ علیٰ نور
کاہے کو رہتی پردہ میں مستور

پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی　　بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا　　چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ
گویا پھونک ماری دنیا کے تن میں　　گویا لگا دی دون خشک بن میں
بزم جہاں میں رونق ہے تجھ سے　　اس میکدہ میں ہو حق تجھ سے

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا　　بزم عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادو گری میں　　ہیں تیرے عشوہ خشکی تری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا　　دے دے کے چھینٹے اسکو ابھارا
بے حس کو بخشا احساس تو نے　　دی نکہت گل کو بو باس تو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی بھنگم　　تو نے سکھایا اس کو خم و چم
کرتب سے تیرے سانچے میں ڈھلکر　　کندن سی نکلی رنگت بدل کر
ٹھکرا کے تو نے جب کہدیا قم　　اٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم
بھولی ہے اپنی اوقات پہلی　　پھرتی ہے خوش خوش کیا اہلی گہلی

پاتی ہے خلقت جب تیری آہٹ　　ہوتی ہے پیدا اک گدگداہٹ
مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا　　بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا
کہتی ہے دنیا تو ہے تو کیا غم　　تو آئے نت نت تو آئے جم جم
جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر　　سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے　　تو ہی نہ ہو تو سب پر وھتا ہے

اے سب کی پیاری سب کی چہیتی　　کہہ منہہ زبانی کچھ آپ بیتی
"قدرت کے گھر کی ہوں لاڈلی میں　　ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں
تقویم احسن میرا لگن تھا　　فردوس اعلیٰ میرا وطن تھا
حور و ملک کی آبادیاں تھیں　　بےفکریاں تھیں آزادیاں تھیں

چلتی تھی ہر دم بادِ بہاری شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری
میری ادا پر مرتے تھے قدسی سجدہ پہ سجدہ کرتے تھے قدسی
تکریم میری ہوتی تھی از حد ہیں داستانیں جنکی زباں زد
پھر دیس چھوٹا گذری سو جھیلی پردیسیوں کا اللہ بیلی
پل مارتے کا ہے یہاں بسیرا حبِ وطن ہے ایمان میرا
آب و ہوا میں دشت و جبل میں میری رسائی ہے ہر محل میں
لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں
خوابِ گراں کی حالت ہے طاری مستی میں گم ہے سب ہوشیاری
جب آتے آتے سبزہ میں آئی کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا
داخل ہوئی جب حیواں کی تن میں اک شور اٹھا اس انجمن میں
انساں کا جامہ جب میں نے پہنا اللہ رے میں کیا میرا کہنا
کس کس جتن سے میں نے بنایا رتبہ بہ رتبہ پایہ بپایہ
جامد کو نامی نامی کو حیواں حیواں کو وحشی وحشی کو انساں
پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا
نیکی بدی کے میلے جمائے جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے
جو ناچ میں نے جسکو نچایا وہ ناچتے ہی اس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم ہے جسکے بس میں تسخیرِ عالم
کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے
مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی
رکھوں گی جاری یوں ہی سفر میں قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں

ہے میری ہستی اک طرز معمول — کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں

سُنتے رہو گے میری کہانی
جب تک ہے باقی دنیا فانی

محمد اسمعیل میرٹھی

امّید

تو ہے وہ نیّر جوت اے اُمّید — ماند ہے تیرے سامنے خورشید
شب کو نیّر میں آب و تاب کہاں — ہے چمک تیری راتدن یکساں
تو نے سارے جہان کو گھیرا — آسرا ہر بشر کو ہے تیرا
تیرے آگے ہیں مشکلیں سب ہیچ — خود بخود کھل گئے ہیں مشکل پیچ
یہ بھی عقدہ کھلا کہ کوہِ غم — تیرے پرتو میں قطرۂ شبنم
زندگانی کی تو ہے باغ و بہار — ہیں دلاویز تیرے برگ و بار
جسکے دل میں جما ترا پودا — اُس نے حسب المراد پھل پایا
تیرے سایہ کو دیکھکر آئے آس — یاس کی دھوپ تک نہ آئی پاس
اخترِ بخت کی چمک ہے تو — تاج اور تخت کی جھلک ہے تو
تھے زمانہ میں جو بڑے فتّاح — تھے وہ تیرے ہی بس فقط مدّاح
نزدِ ارباب عقل و فہم و تمیز — تیری ہوتی ہے مال و زر ناچیز
آگئی ہے قریب مشکل بعید — قدرتی دُوربیں ہے تو اُمّید

کامیابی کی تو ہے جڑ بے شک — جسکو شک ہو وہ رفع کرے شک
عرض کرتے ہیں یہاں مثالاً ہم — داستانِ سکندرِ اعظم
کی چڑھائی جب اُس نے ایراں پر — تاکہ دارا سے چھین لے کشور
ہوگیا جمع لشکرِ جرّار — کُوچ کرنے کو جبکہ تھا تیّار
اِس خوشی میں بکھیر کی اُس نے — یہ سخاوت کی داد دی اُس نے
ایک سردار نکتہ چیں نے کہا — اَے جہاں بخش خسروِ دانا
یُوں لٹادی دھڑی دھڑی دولت — جیسے پالی گری پڑی دولت
یہ بھی تو سوچ اَے شہِ والا — اس مہم کے لئے بھی کچھ رکھا
اُس نے فرمایا ہاں میری اُمید — حق میں میرے ہے ایزدی تائید
پھر مجھے کیا کمی ہے اَے سردار — مَیں ہُوں زرپاش و زرفشاں زردار
سُنکے دندان شکن جواب سوال — دیا پھیر اُس نے جو ملا تھا مال
اور کہا یہ کہ اَے ولی نعمت — میرے کس کام کی ہے یہ دولت
لاو کر کون یہ چلے توڑے — جس سے تھک جائیں اونٹ اور گھوڑے
قول ہے آپ کا نہایت ٹھیک — ساری دُنیا جہان کے نزدیک
ہے یہ اُمّید ہی بڑی دولت — چاہتا ہُوں اسی میں شرکت
کیجے منظور میری شرکت کو — دیجے اِس لازوال دولت کو
ہم سخن اُس کے سب امیر ہُوئے — سب اسی ٹیک پر فقیر ہُوئے
جو ہے تجھ پر مِٹا ہوا اَے آس — کہہ دو سب کچھ ہے اس فقیر کے پاس
مختصر بات یہ ہے اَے اُمید — تو ہے جاہ و جلال کی تمہید
بہرِ اُمّید وار اسکندر — تھی یہ تمہید ہی نشانِ ظفر
ملکِ یُوناں سے تا بہندوستاں — کُل ممالک تھے تابع فرماں

اُس کی تلوار سے گئے سب کانپ　آگ سے جیسے خوف کھائے سانپ
جو مقابل ہُوئے ہوئے نابُود　مر گئے جنکی فاتحہ نہ درُود
اپنا سکّہ بٹھایا دُنیا پر　آفریں بر فتوح اسکندر
بختمندی کی جتنی شہرت ہے　سب یہ اُمید کی بدولت ہے

کامیابی میں شہرۂ آفاق
ہو گا بے شک امید کا مشتاق

بہاری لعل مشتاق دہلوی

دُنیا کی اُجڑی ہُوئی محفل

شب کہ تھا میں نقشبندِ عالمِ نیرنگِ خواب　تھی بہم سرگرم صحبت چند یارانِ شباب
اِک طرف آراستہ چھوٹی سی تھی اِک بزمِ عیش　کِھل رہا تھا اِک طرف پھُولوں کا تختہ لاجواب
اِک طرف چِھٹکی ہُوئی تھی صاف ستھری چاندنی　بہ رہی تھی اِک طرف اٹکھیلیوں سے جُوئے آب
اِک طرف تھے میز پر پھُولوں کے گلدستے دھرے　اِک طرف گملوں میں تھا پھُولا ہُوا ولیسی گلاب
اِک طرف شاخوں پہ سرگرمِ ترنّم تھے طیُور　اِک طرف تھا اہتمامِ نغمۂ چنگ و رباب
خندۂ گل اِک طرف گلبانگِ بُلبُل اِک طرف　اِک طرف محفل میں ترتیبِ مَے و نقل و کباب
جھُومتے تھے اِک روش پر نونہالانِ چمن　اِک کنارے سبزۂ بیگانہ تھا سرمستِ خواب
بھینی بھینی چل رہی تھی جانفزائی سے نسیم　عنبر افشاں ہر خیاباں میں تھی بُوئے عطرِ ناب
کس تکلف سے تھی شبنم صرفِ تزئینِ چمن　دیکھئے چھینٹے مُنہ پہ پھولوں کے چھڑکتی تھی گلاب

سُرمہ آگین تھی اُدھر نرگس کی چشمِ سحر ساز — جعدِ مشکیں کو اُدھر دیتا تھا سنبل پیچ و تاب
جو شجر تھا فی المثل تھا انتخابِ روزگار — پھول جو تھا اپنے اپنے رنگ میں تھا لاجواب
دیکھ کر محفل میں پروانوں کو سرگرمِ وصال — شمع کہتی تھی پڑی ہی رات۔ کیا ہی اضطراب
الغرض جملہ مہیا تھے وہاں اسبابِ عیش — ساقی و جام و سبو و مطرب و چنگ و رباب
سامنے جھرمٹ پریزادوں کا تھا سرگرمِ ناز — جوش پر آیا ہوا ایک ایک کا کافر شباب
سب کے سب آفت کے پرکالے تھے سر سے پاؤں تک — سب کے سب تھے عشوہ و ناز و ادا میں انتخاب
جوشِ گل تھا۔ انجمن تھی غنچۂ احباب تھا — چاندنی تھی رات اور گردش میں تھا جامِ شراب
دیکھ کر یہ عالمِ نیرنگ و سامانِ نشاط — چاہتا تھا شوق ہو محفل میں بڑھ کر باریاب
اور لُوٹے اُن پریزادوں سے ہو کر ہمکنار — کھول کر دل بے تکلف دولتِ حسنِ شباب
آ گئی عقلِ نصیحت سنج اتنے میں وہاں — لیکے چٹکی مسکرا کر یوں کیا مجھ سے خطاب
ہوش میں آ۔ او شرابِ عشق کے ماتے ہوئے — ہو ہوائے شوق میں اتنا نہ گرمِ اضطراب
اک مرقع ہے یہ نیرنگِ فسونِ دہر کا — جسکو تو سمجھے ہوئے ہے بزمِ یارانِ شباب
یوں تو منظر ہے بظاہر اسکا اک اک دلفریب — یونتو اپنے رنگ میں یہ انجمن ہے لاجواب
یونتو ہے معمورۂ عیش و طرب یہ بزمِ ناز — یونتو اک اک سینری ہے آہ اسکی انتخاب
یہ تماشاگاہ لیکن سیر کے قابل نہیں — اس مرقع کی ہر اک تصویر ہے تمثالِ خواب
ہے وہ حیرت خانۂ نیرنگ یہ صورت کدہ — ہے بھرا ہر پیکرِ گویا میں رنگِ انقلاب
سامنے جھرمٹ جو یہ پریوں کا ہے سرمستِ ناز — کھینچتی ہے دل کو جنکی شوخیِ حسنِ شباب
صورتیں دنیا کی ہیں گرویدگی کی سب یہ آہ — مجھ سے سن لے تو حقیقت انکی او خانہ خراب
نفس کافرکیش کے ہیں ہاتھ میں انکی عناں — کجروی میں اپنا رکھتا ہے جو مشکل سے جواب
پیاری پیاری ہے اگرچہ انکی صورت موہنی — دیکھنے میں گو بظاہر انکا دل کش ہے شباب
ان شبیہوں سے دلآویزی ٹپکتی ہے۔ مگر — بے حقیقت ہیں برنگِ پیکرِ تصویرِ خواب

اک طلسمِ دلفریب ہستیٔ موہوم ہے انکی شوخی - انکی تمکیں - انکا حسن انکا شباب
انکی فطرت میں نہیں ہے پاسِ ناموسِ وفا شیوۂ عاشق کشی ہے انکی ملت میں ثواب
دین و دنیا سے گیا جو اُن پہ گرویدہ ہوا پھر نہیں رہتا کہیں کا آہ وہ خانہ خراب
آگیا جو حیف ان سیمیں تنوں کے دام میں ہاتھ سے بس اُس نے کھودی دولتِ عہدِ شباب
نوش دیکر اوّل اوّل عاشقِ جانباز کو چاشنی انکی چکھا دیتی ہے آخر زہرِ ناب
تو اگر فرزانہ ہے تو ان سے رہنا ہوشیار رہزنانِ دنیا و دیں ہیں آہ یہ خانہ خراب
دُور رہنا دیکھ ان اصنامِ کافر کیش سے ہیں یہ پریاں خانہ سوزِ طاعت و زہد و ثواب
کر چکی جب یُوں نصیحت گستری عقلِ سلیم مجھ سے بولی پھر اشارہ کرکے او خانہ خراب
سامنے یہ جو دھری ہیں شیشہ و جام و سبو جنکے دلدادہ نظر آتے ہیں یارانِ شباب
نشۂ دنیائے دُوں سے سب کے سب معمور ہیں زہر ہے انمیں بباطن - اور بظاہر ہے شراب
یہ وُہ مے ہے جسکی مستی ہے پیامِ خوابِ مرگ نشۂ غفلت ہے جس میں ہے یہ وُہ صہبائے ناب
پھر کہا مجھ سے کہ او محوِ نشاطِ زندگی سو چکا اتنا نہیں تجھ کو ارے خانہ خراب
ہے وُہ غافل کوسِ رحلت کی صدائے دردناک جسکو تو سمجھے ہُوئے ہے نغمۂ چنگ و رُباب
آرہی ہے ہر طرف سے بانگِ آوازِ جرس کارواں منزل بہ منزل جارہے ہیں بشتاب
خوابگاہِ عیشِ دنیا - نیند کے ماتے نہیں تو سمجھ کر منزلِ ہستی میں ہو سرگرمِ خواب
تیری منزل ہو کہیں کھوئی نہ غافل نیند میں پھٹ چلی پو اور نکلنا چاہتا ہے آفتاب
خوابِ غفلت میں نہ کھو سرمایۂ عمرِ عزیز کام کر کچھ - مغتنم ہے فرصتِ عہدِ شباب
بجگیا پیری میں جب نقارۂ کوسِ رحیل پھر نہ پچھتائے سے ہاتھ آئیگا کچھ خانہ خراب
کہکے اتنا ہو گئی رخصت اِدھر عقلِ رسا اور اُدھر محفل پہ چھایا آہ ایسا انقلاب
اُڑ گیا پریوں کا جھرمٹ یک بیک صف باندھ کر صبحدم آنکھوں سے اُڑجاتا ہے جیسے رنگِ خواب
آفتِ جاں جنکی تھی اک اک ادائے دلفریب ہو گئیں وُہ پیاری پیاری صورتِ تمثالِ خواب

تھے مے گلرنگ سے لبریز جو شیشے ابھی
اب جو دیکھا انکو تو اُن میں بھرا تھا خونِ ناب

چھا رہی تھی یوں اداسی بزم پر اب سر بسر
ڈھلکے رہجائے کسیکا جس طرح حسنِ شباب

لوٹتے تھے آگ پر کچھ پارۂ لختِ جگر
سوندھی سوندھی انجمن میں اب نہ تھی بوئے کباب

خاک اُڑاتی تھی وہاں ہر سو سمومِ جانگزا
بہ رہی تھی جس جگہ اٹکھیلیوں سے جُوئے آب

اب نہ تھی وہ تابشِ انوارِ حُسنِ دلفروز
لیلیا تھا جھلملا کر شمع نے رُخ پر نقاب

ایک جانب تھی پڑی محفل میں پروانوں کی خاک
تھرتھراتے تھے نہ اب فانوس پر خانہ خراب

اب نہ تھی وہ ہلکی ہلکی چاندنی نکھری ہوئی
اب نہ تھا پیشِ نظر پھولوں کا تختہ لاجواب

اب نہ تھے شاخوں پہ مُرغانِ چمن نغمہ سرا
اب نہ آتی تھی صدائے نغمۂ چنگ و رباب

اب نہ تھی وہ گرمیٔ ہنگامۂ عیش و طرب
خاک پر یارانِ محفل اک طرف تھے محوِ خواب

دیکھ کر یہ رنگ ششدر دل میں تھا میں ناگہاں
سامنے آئی نظر محفل میں اک تمثالِ خواب

قد میں تھی فتنہ گری - آنکھوں میں سفاکی بھری
قہر آلودہ نگاہوں سے ٹپکتا تھا عتاب

دوش پر نیزہ - کمر میں دشنۂ خونریز تھا
سر پہ تھا خونِ دو عالم - ہاتھ میں تیغ خوش آب

گوشۂ دامن لہو میں تھا اُدھر ڈوبا ہوا
خُون کے چھینٹوں سے گلگوں تھا اُدھر طرفِ نقاب

تھی وہ کافر برّشِ تیغ نگاہِ خشمگیں
خونبہا جس کا نہ مانگے سے ملے روزِ حساب

بیمروت - بیوفا - غارتگرِ خلقِ خُدا
فتنہ ساماں - آفتِ جاں - یار کُش خانہ خراب

سرعتِ سیماب رگ رگ میں بھری تھی جائے خوں
برق تھی یا تھی چھلاوہ شوخیٔ حُسنِ شباب

کچھ عجب بانکی ادا سے شوخیاں کرتی ہوئی
آئی اُس اُجڑی ہوئی محفل میں ظالم بیحجاب

پھر وہاں پہنچی یکایک تیغ چمکاتی ہوئی
لمبی تانے جس جگہ سوتے تھے یارانِ شباب

کرکے اِک اِک کو قتیلِ دشنہ ہائے خونچکاں
خاک کا گنبد بنا کر پھر دیا اُن سب کو داب

چھا گیا آنکھوں میں سب کے خوابِ نوشینِ اجل
بنگئی شہرِ خموشاں اب وُہ بزمِ لاجواب

یادگارِ رونقِ محفل نہ تھی اب کوئی چیز
سامنے آنکھوں کے تھی تصویرِ رنگِ انقلاب

بست گلبن جس جگہ خمیازہ کش تھے ناز سے — چھوٹتے تھے اُس جگہ فوارہ ہائے خونِ ناب
سرت آگیں اک مرقع غم کا تھا پیشِ نظر — ہو رہی تھی کچھ عجب بد رنگ اب تمثالِ خواب
یمہ کریہ رنگ آنکھوں سے رواں تھی جوئے خوں — دل سے آتی تھی صدا تھم تھم کے او خانہ خراب
نتیجہ آہ ہو جس عیش کا پایانِ کار — تُف ہے ایسے عیش پر۔ اُس سے تو بہتر ہی عذاب
نظرِ دُنیا کی بہت گرویدگی اچھی نہیں — نوش کے قابل نہیں اے بوالہوس یہ شہدِ ناب

دل لگانے کی جگہ دُنیا نہیں ہے اے سرور
ساتھ دیتی ہے کسی کا آہ کب خانہ خراب

سرور جہان آبادی

شام

طاؤسِ شام نے جو دیئے کھول بال و پر — چمکے ستارے صُورتِ گلہائے نقشِ زر
گردوں کے سمت اپنی جہاں تک گئی نظر — دیکھا کہ ایک فرشِ مرصّع ہے سر بسر

آئی ندائے غیب کہ یہ وقتِ شام ہے
آمد ہے شب کی چار طرف دن تمام ہے

جب آفتاب کا نہ رہا چرخ پر قیام — بکھرائی بال آئی عدم سے عروسِ شام
زیور ستاروں کے نظر آنے لگے تمام — پیرِ فلک نے باندھی کمر بہرِ انتظام

مہتاب ہاتھ باندھ کے آیا سلام کو
حیرت سی ایک ہو گئی ہر خاص و عام کو

غنچے چمن میں کھل گئے۔ ٹھنڈی ہوا چلی — سبزے میں جان آگئی ہنس ہنس پڑی کلی

بلبل کے دل میں ہو گئی پھر ایک بیکلی — پھولوں کی بو سے بس گئی ہر شہر کی گلی

اک پھول سے سبھوں کا معطر دماغ ہے
ظاہر میں ایک پھول ہے لیکن یہ باغ ہے

ہر شاخ کے ہیں پھولوں سے دامن بھرے ہوئے — پانی سے دیکھو پتے چمن کے ہرے ہوئے
غنچوں کی نازکی سے ہیں گلچیں ڈرے ہوئے — تازہ ہوئے جو لو سے شجر تھے مرے ہوئے

پتے زمردیں جو چمن میں شجر کے ہیں
شبنم کے قطرے قطرے میں نقشے گہر کے ہیں

ٹھنڈی ہوا کا جوش میں چلنا وہ بار بار — ہلنا وہ پتیوں کا درختوں کی وہ قطار
پھر جا بجا گلاب کے پھولوں کی وہ بہار — سیرابیاں وہ باغ کی سنبل کا وہ نکھار

کیا وصف ہو بیان تیرے انتظام کا
قابل درود پڑھنے کے عالم ہے شام کا

تھی دن کی دھوپ میں جو تمازت نہیں رہی — گرمی کے مارے تھی وہ جو وحشت نہیں رہی
لو سے جو اپنی غیر تھی حالت نہیں رہی — خسخانہ اور برف کی حاجت نہیں رہی

بارش نہ ہو جو اب کے برس کوئی غم نہیں
شبنم کے قطرے دانۂ گوہر سے کم نہیں

طائر ہوا میں کھولے ہوئے اڑ رہے ہیں پر — بلبل چہک رہی ہے چمن میں ادھر ادھر
ہے فکر آشیانہ میں ہر ایک جانور — بیٹھے ہیں بعض اونچے درختوں کی شاخ پر

چوپاؤں کے بھی رہنے کا اک انتظام ہے
کچھ دن کو اس سرا میں ہر اک کا قیام ہے

جلنے لگے چراغ موذن نے دی اذاں — ہونے لگیں کلیسوں میں اب بت پرستیاں
پاؤ گے رہروؤں کو سرا کے سوا کہاں — دیکھو گے قافلے کو وہاں ہے جہاں کنواں

ہاں بعض رہ گیر ہیں پیچھے مقام سے
جنگل کے کنج میں ہیں چھپے خوفِ شام سے

ہے آسمان جو تیرہ تو میدان میں دُھواں — جنگل کی جھاڑیوں سی ہے سناٹا اک عیاں
اُس میں پہاڑ ایسے مخوّف کہ الاماں — پھر اُن کے آس پاس یہ لبریز ندّیاں

دیکھو وہ شیر چھوڑ کے نکلے ہیں غار کو
ہیجان کی طرح ہے خموشی شکار کو

سنسان وُہ جگہ وُہ اُداسی کا دخلِ عام — وُہ بادِ نرم اور وُہ اک شمع وقتِ شام
وُہ کچھ درخت نیم کے تاریک وُہ مقام — وُہ ٹوٹی قبریں اور وُہ کچھ لوح ناتمام

نقشہ یہ وُہ ہے دل سے جو اب تک مٹا نہیں
افسوس ساکنانِ عدم کا پتا نہیں

ہاں اہلِ بزم محفلیں آراستہ ہوئیں — ہے آج رشکِ گنبدِ گردوں یہ سرزمیں
بلّور کے ہیں جھاڑ بھی روشن کہیں کہیں — زینت مکاں کی ہوتی ہے ہوتے ہیں جب مکیں

اے عرشؔ آؤ زندہ دلی سے بھی کام لو
تم کس کو رو رہے ہو ذرا دل کو تھام لو

مولوی ضمیر الدّین احمد عرشؔ

انگریزی لباس

ہمارے مکرم جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری رنجور عظیم آبادی کلکتہ سے یہ ایک دلچسپ نظم ارسال فرماتے ہیں۔ مولوی صاحب کا نام اخباری دنیا میں کوئی نیا نام نہیں ہے۔ آپ علیگڈہ کالج کے قدیم طلبا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ایک مدت تک پٹنہ انسٹیٹوٹ گزٹ کے (جو اردو و انگریزی میں نکلتا تھا) ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انشا پردازی میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپکے مضامین اخبارات میں اکثر شائع ہوتے ہیں۔ اور آجکل آپ کلکتہ بورڈ آف ایگزامینرس کے چیف مولوی ہیں:-

ہیں جو میرے برادرِ امجد † ۔۔۔ شفقت جن کی مجھ پہ ہے بیحد
اُن سے اِک روز عرض میں نے کی ۔۔۔ گر کریں عفو میری گستاخی
تو کروں عرض آپ سے اِک بات ۔۔۔ جس سے تشویش ہے مجھے دن رات
بولے۔ وہ بات کیا ہے؟ شوق سے کہ ۔۔۔ اُس کے کہنے سے تو نہ قاصر رہ
تب یہ میں نے کہا۔ کہ حضرتِ من! ۔۔۔ میرے دِل کو اسی کی ہے اُلجھن
یہ روش کیوں جناب کو بھائی ۔۔۔ ترک کر دی جو وضعِ آبائی؟
نہ وہ پاجامہ ہے نہ ہے اچکن ۔۔۔ بلکہ ہے کوٹ پینٹ زیبِ بدن
ہے بجائے عمامہ سر پر ٹوپ ۔۔۔ ہو گئے آپ مولوی سے پوپ *
گرچہ رکھتے ہیں چہرے پر ڈاڑھی ۔۔۔ پر لبیں ہیں ضرور حد سے بڑھی
آپ نے جو یہ ترکِ وضع کیا ۔۔۔ خوبیاں اس میں۔ کہئے ہیں کیا کیا؟

† حضرت اخی المعظم شمس العلما مولانا سید امجد علی صاحب ایم-اے- پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد (رنجور)

* رومن کیتھولک عیسائیوں کا مذہبی سردار جو روم (اٹلی) میں رہتا ہے (رنجور)

اور نقصان کی جو پوچھیں جناب — تو نہیں اس کا کچھ شمار و حساب
پھر بھی دو چار عرض کرتا ہوں — عرض کرنے میں گرچہ ڈرتا ہوں
دیکھتے ہیں جو صورتِ ظاہر — لوگ کہتے ہیں آپ کو کافر
آپ کی شکل دیکھ کر حضرت! — ہوتی ہے انکو وحشت و نفرت
خیر اُن کی اگر نہیں پروا — سوچیئے یہ تو اپنے دل میں ذرا
جب کہ یُوں شکلِ ظاہری بدلی — حالت باطنی بھی بدلے گی
ہو گی خویش و یگانہ سے نفرت — صاحبوں کی خوش آئیگی صحبت
پر وہ حاکم ہیں آپ ہیں محکوم — وہ ملیں آپ سے یہ ہے معلوم
الغرض - اپنی قوم بھی چھوٹی — صاحبوں سے اُمید بھی ٹوٹی
میری تقریر سن چکے جس دم — بولے ہنسکر برادرِ اعظم
تونے جو کچھ کہا وُہ سچ ہے۔ مگر — غور اب میری بات پر بھی کر
لوگ کافر کہیں تو کیا ڈر ہے؟ — عالم الغیب ربِّ اکبر ہے
جانتا ہے وہ دل کی سب باتیں — اُس پہ ظاہر ہیں نفس کی گھاتیں
کفر و ایماں تو دل پہ ہیں موقوف — جانتے اس کو ہیں سب اہلِ وقوف
گو کہیں لوگ ہم سے دل میں پیچ — کار ما با خداست - دیگر ہیچ
شکلِ ظاہر کا اعتبار نہ کر — دل حسینوں کے ہوتے ہیں پتھر
جب بھرا دل میں ہو فریب و دغا — جُبّہ و خرقہ بھی جو پہنے تو کیا؟
مولوی ایسے کتنے پائے گا تُو — جن میں ایمان کی نہیں کچھ بُو
وُہ پہنتے ہیں جُبّہ و دستار — تاکہ اِس آڑ میں وُہ کھیلیں شکار
خود کو پجواتے ہیں مُریدوں سے — اور اُنہیں لوٹتے ہیں جی بھر کے
دین کا پردہ آگے ڈالتے ہیں — پھر دلی حسرتیں نکالتے ہیں

برملا کرتے ہیں وہ ایسے کام — جن سے شرمائے فاسقِ بدنام
ماسوا اِسکے۔ یوسفِ خوشخو! — ہندیوں کے لباس ہیں جو جو
وُہ کہاں ہیں لباسِ اہلِ عرب؟ — اُنکو اسلام سے علاقہ ہے کب؟
پھر برابر ہوئے لباس سبھی — یورپی ہوں وُہ - یا کہ ہوں ہندی
بلکہ مَیں کہدوں تجھسے صاف صریح — ہے لباسِ فرنگ کو ترجیح
زیبِ تن اِسکو کرتے ہیں اتراک† — جنکی تہذیب کی بندھی ہے دھاک
تونے جو کچھ سُنے یہ میرے مقال — تھے یہ سب صرف بہرِ استدلال
میرا مطلب اسی قدر ہے فقط — ہے لباسوں پہ اعتراض غلط
جن کو جن کپڑوں کی ضرورت ہو — شوق سے وُہ انہیں پہننے دو
نہیں اسلام میں لباس کی قید — چاہیئے دل میں ہو نہ مکروشید
باطن اِنسان کا درست رہے — چاہے پھر جو لباس وُہ پہنے
ہے مسلماں کو صرف یہ لازم — رہے پابندِ شرع وُہ دائم
جو اوامر ہیں وُہ بجا لائے — جو نواہی ہیں اُن سے باز آئے
اتنی تقریر ہونے پائی تھی — کہ یہ آوازِ غیب سے آئی
در خصوصیتِ لباس مکوش — قولِ سعدی بشنو ز گوش ہوش
در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش — تاج بر سر نہ و عَلَم بر دوش

محمد یُوسف جعفری

† جمع ترک (ربجور)

میرا نام کیا ہے؟

بتلاؤ عقل والو! ہاں میرا نام کیا ہے؟
میں کیا ہوں اور تماشا یہ صبح و شام کیا ہے؟

شرقی جھروکے سے ہوں دکھلاتا اپنا درشن
دکھلا کے اپنا درشن کرتا ہوں دن کو روشن

اکثر میں جھانکتا ہوں کھڑکی پہ جب تمہاری
چمکیلی آنکھ سونا ہوتا ہے دیکھ واری

کہتا ہوں تم سے آکر ہے وقت جاگنے کا
سستی سے کاہلی سے کوسوں ہی بھاگنے کا

کچھ اس لئے نہیں ہے روشن یہ میرا ہونا
یوں کب تلک بچھونے پر اینڈ اینڈ سونا؟

چمکا ہوں اس لئے میں تا اٹھ کے سب کرو کام
لکھو پڑھو کرو سب روشن جہان میں نام

مجھ سے نہیں جہاں میں سیلانی کوئی بڑھ کر
پھرتا ہوں سیر کرتا میں سارے آسماں پر

ہرگز نہیں ٹھہرتا اصلا نہیں میں تھکتا
میداں میں بے تکاں ہوں دن رات دوڑ سکتا

چمکیلی کرنوں کا ہر اک تاج میرے سر پر
جس کی کہ جگمگاہٹ پھیلی ہے بحر و بر پر

ہوں آن کر چمکتا پیڑوں پہ اور گھروں پر
دریا کی مچھلیوں پر مرغابی کے پروں پر

ہر شے کہ جس پہ میری ہے روشنی چمکتی
ہے نور سے چمکتی ہے حسن سے دمکتی

پکتے ہیں مجھ سے میوے۔ پکتی ہے مجھ سے کھیتی
دیتا ہوں میں ہی تم کو گرمی بھی روشنی بھی

اونچا درخت سے ہوں۔ اونچا ہوں میں گھٹا سے
اونچا ہوں آسماں پر میں قدرت خدا سے

گر میں کبھی تمہارے تھوڑا بھی پاس آتا
جاتے جھلس جھلس تم۔ میں تم پہ موت لاتا

رہتی نہ گھاس بھی یوں صحرا میں لہلہاتی
جل کر سیاہ ہوتی۔ اڑ مثل خاک جاتی

چمکیلی کرنوں کا ہوں جب تاج اتار لیتا
صافہ ہوں بدلیوں کا سر پر سنوار لیتا

اس وقت میری جانب ہاں دیکھ سکتے ہو تم۔
لیکن ہو بدلیوں کا نام و نشاں جب گم

اب میں چمک رہا ہوں تیزی سے دوپہر کو
بھر کر نظر جو دیکھے طاقت کہاں نظر کو؟

دیکھے تو ہے چکا چوندھ آنکھوں کو آ گئی — ایسی کہ دیکھتے ہی ہو جائیں دونوں اندھی
ہاں اک عقاب مجھ کو اُس دم ہے دیکھ سکتا — تیز اور قوی نظر سے پیہم ہے دیکھ سکتا
ہونے کو جب کہ ظاہر ہوتا ہوں میں سحر کو — تا کہ دکھاؤں میں دن اُس وقت با اثر کو
اُڑتا لوا ہے مجھ سے ملنے کو آسماں تک — اُڑ کر ہوا پہ کیا کیا گاتا ہے راگ دیپک
مُرغا بھی چیخ کر ہے کیا کیا اذان دیتا — پیغام سب کو میرے آنے کا آن دیتا
چمگادڑ اور اُلّو لیکن ہیں بھاگ جاتے — جس وقت دیکھتے ہیں تیری سحر مجھ کو آتے
منہ اپنا ہیں پرانی دیواروں میں چھپاتے — یا کھول میں پرانے پیڑوں کے جا سماتے
کھوؤں میں اکھوں میں شیر اور بھیڑئے بھی — رہتے چھپے ہیں دن بھر لیتے ہیں نیند گہری
دیکھو تو میں چمکتا یاں ہر مقام میں ہوں — گہ ہند سند میں ہوں گہ روم و شام میں ہوں
انگلینڈ میں کبھی ہوں۔ امریکا میں کبھی ہوں — روئے زمیں پہ ہر جا پھیلاتا روشنی ہوں
پیدا نہیں ہے کوئی روئے زمیں پہ حاشا — مجھ سا جمال والا مجھ سا جلال والا
میں کیا ہوں اور تماشا یہ صبح و شام کیا ہے؟ — بتلاؤ عقل والو! ہاں میرا نام کیا ہے؟

(ماخوذ از انگریزی) **عروس**

تازہ غزلیں

نت نیا حال ہے ہر شب تری آزاری کا — کچھ ٹھکانا ہے اس الجھی ہوئی بیماری کا
بعد کوشانہ کی جانب سے ہوئی ہے تحریک — سلسلہ پہلے بندھا اپنی گرفتاری کا
سادگی چاہیئے اشکوں میں کہ پیری کے ہیں دن — اب زمانہ نہ رہا چشم کی خونباری کا

گر پڑی مے یہ بھرا جام لبالب ہم نے — کس سے احوال کہیں اپنی گنہگاری کا
اے مسیحا اثر انگیز ہے دل کا احوال — تو بھی سن لے کہ فسانہ ہے اک آزاری کا
باتیں دنیا کی مناسب نہیں میخانے میں — ذکر اس پاک جگہ کیا زنِ بازاری کا
خوب دل کھول کے پیتا ہوں کہ ساقی ہے خموش — ایک دن حال کہیگا مری سرشاری کا
بند آنکھیں رہیں تا عمر ترے کوچہ میں — حال کھلنے نہ دیا دل کی طلبگاری کا

شادیت میں صداقت نہ ہو جس وقت تلک
نام بیفائدہ کیوں لے کوئی دینداری کا

یہاں تک عشق نے دل کو نچوڑا پنجۂ غم سے — ٹپکتا ہے لہو ہر وقت اپنی چشم پرنم سے
نہ کر صیاد اتنا ظلم طاقت ہے کہاں غم سے — قفس کو لے کے کیا اڑ جائینگے بے بال و پر ہم سے
نہ کرنا قصد ہمدم زخمِ دل کی چارہ سازی کا — محبت میں ہماری داغ لگ جائیگا مرہم سے
سحر ہے شمع اب بجھتی ہے تارے جھلملاتے ہیں — وہ جاتے ہیں یہاں آنسو رواں ہیں چشم پرنم سے
خدا رکھے تمہاری چاند سی صورت کا کیا کہنا — بلائیں حسن بھی لیتا ہے پیہم زلفِ پرخم سے
نہ بہلا مجھ کو بس اے چارہ گر تو آپ ناداں ہے — جگر کا زخم بھی اچھا کہیں ہوتا ہے مرہم سے
یہ کیسی زندگی ہے روز جینا اور مرتا ہوں — کسی کے وصل کی امید سے اور ہجر کے غم سے
اسے دیکھے سے اپنی سینہ چاکی یاد آتی ہے — چھپا لے اے ردائے شب گریبانِ سحر ہم سے
ہوائے گرم سے چرخ آگ برساتا ہے یہ ضد ہے — مری تربت کا سبزہ جب ہرا ہوتا ہے شبنم سے
شبِ مہتاب کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں کو — لحد میں چاندنی چھٹکی ہے داغِ حسرت و غم سے
ہوئے واں زینت افزائے بساطِ عیشِ دشمن وہ — گلے مل مل کے یاں روئی تمنا رات بھر ہم سے
اگر ہے دید کا طالب نگاہِ شوق پیدا کر — نہ تو باہر ہے عالم سے نہ وہ باہر ہے عالم سے
طلب گر نعمتِ اعلیٰ کی ہے کم پر قناعت کر — گلوں کو دیکھ پیاس اپنی بجھا لیتے ہیں شبنم سے

خداہی دے جزا اسکی شہیدانِ محبت کو دلوں پر داغ کیا کیا لے گئے اس باغِ عالم سے

خدا بخشے۔ بیابانِ جنوں میں گو اکیلا تھا

بڑی رونق تھی ای سجّاد پھر بھی قیس کے دم سے

سجّاد عظیم آبادی

اے خدا سُن لے میری پنجاب کو لے چل مجھے — رات دن کُڑھتا ہوں میں پڑتی نہیں ہے کل مجھے

ہے مجھے ہر دم ستاتی یادِ یارانِ وطن — کب تلک رکھیگا تو اس طرح سے بیکل مجھے

صبح کرنا شام کا کم سو مصیبت سے نہیں — ہے قیامت سے زیادہ آج کرنا کل مجھے

دل لگے کیا خاک جب دلبری پہلو میں نہ ہو — بے ترے ای نازنیں کیا لطفِ سیرِ ڈل[1] مجھے

ہے مرے پیش نظر اُٹھوں پہر وقت وداع — ہائے وہ کہنا کسیکا پیار سے "لے چل" مجھے

وصل میں بھی کیوں نہیں ہوتا ہی اطمینانِ قلب — مرشدِ کامل سے کرنا ہی یہ عقدہ حل مجھے

اے خدا چھوڑے گی کب مجھ کو مری آشفتگی — بیٹھنے بھی دیگی آخر زیست کی ہلچل مجھے

خاک میں تنہا لٹا کر چل دیئے صادق رفیق — زندگی بھر کی وفاؤں کا ملا یہ پھل مجھے

صادق (از سری نگر کشمیر)

بلا وجہ مجھ سے خفا ہو گیا — خدا جانے اس بُت کو کیا ہو گیا

کروں کیا میں شکوہ ترے جور کا — مقدر کا اپنے لکھا ہو گیا

نہ چھیڑا اے فلک ورنہ نالہ مرا — غضب ڈھائیگا گر رسا ہو گیا

[1] کشمیر کی مشہور سیرگاہ جھیل ڈل ۱۲

لعاب دہن ترا آبِ بحرِ حُسن — مرے حق میں آبِ بقا ہوگیا

نہیں چین دیتا ہمیں ایک دم — فلک تجھ کو آخر یہ کیا ہوگیا

شبِ وصل اتنا بڑھا رعبِ حُسن — جو بیجا تھا وُہ بھی بجا ہوگیا

زمانے کا شیدا عجب رنگ ہے — ذرا دیر میں کیا سے کیا ہوگیا

شیدا (از علی گڈھ)

ترے فراق میں جینا بشر کا کام نہیں — ہزار شکر کہ اس عمر کو دوام نہیں

گلوں کو کہتی ہے چونکا کے یُوں نسیمِ سحر — چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

خدا کی یاد میں حوروں کی یاد اے واعظ — نگاہِ غیر پہ کرنا ۔ یہ کیا حرام نہیں

تمام عمر بھی سُنئے اگر تو جی نہ بھرے — کلام یار ہے انسان کا کلام نہیں

چمک میں ذرہ و خورشید دونوں یکساں ہیں — گلی میں یار کی کچھ فرقِ خاص و عام نہیں

دعائے خوابِ اجل ہجر میں مناسب ہے — یہی وُہ شے ہے جو عشاق پر حرام نہیں

گلے پہ چلنے دو رُک رُک کے تیغِ قاتل کو — مقامِ صبر ہے عجلت کا یہ مقام نہیں

قیامت آئے اُٹھے روئے یار سے پردہ — خدا وہ صبح دکھائے کہ جسکی شام نہیں

وہ میرے دل میں تصوّر کو اپنے رہنے دیں — خُدا کا گھر ہے کوئی خوف کا مقام نہیں

سمندِ عمر کو آباد روکئے کیونکر
زیادہ اِس سے کوئی رخش تیز گام نہیں

آباد عظیم آبادی

عرقِ ماءُ اللحم انگوری

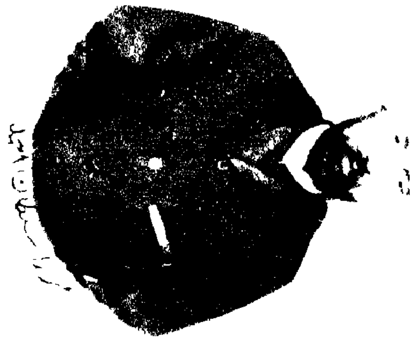
اور

درازیٔ عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاق حسنہ سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے۔ ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعفِ دماغ اور تاریکی چشم۔ سر کا گھومنا چکرانا تھوڑی کام سے دل گھبرانا جس روز دو چار گھنٹہ بیٹھ کر کام کرنا پڑے۔ سر درد ہو جانا۔ بھوک کا بند ہو جانا ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگنا اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملے تو صبح کو کوفتِ اعضا شکنی معلوم ہونا۔ چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہنا۔ ایک صاحب نے عرق ماء اللحم کا استعمال شروع کیا۔ اور دوسرے صاحب بعد مختلف معالج ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے۔ چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو پچکے ہوئے تھے پُر ہو کر رنگ چمکنے لگا۔ تو دوسرے مختلف ادویہ کے کھانیوالے نے دوست سے متعجب ہو کر پوچھا۔ یار کیا بات ہے۔ تم تو چار بجے کے بعد چھ سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو۔ صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر پھر ہوا خوری کے لئے تیار۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں عرق ماء اللحم انگوری دوا تشہ ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ سنکر نہ رہ سکے جھٹ تار دیا عرق بھیجدو۔

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکیٹ ملاحظہ کیجئے جس نے سول سرجنوں اور دوسرے معزز حکما کا علاج کیا۔ اور نا کامیاب رہا۔ دیکھیے وہ کیا کہتا ہے۔ آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیجدیجئے۔ سارٹیفکیٹ صحت یافتہ صاحبان کے بھیجدونگا۔ قیمت فی بوتل عہ تین بوتل سے چھ بوتل تک عہ فی درجن عسہ بذریعہ ریل منگوانیں محصول کی کفایت ہوگی۔ بذریعہ ریلوے اسٹیشن بھیجا ہیں صاف لکھیں۔ ورنہ بذریعہ ڈاک منگوانیں عہ محصول ڈاک مشتری کا ذمہ ہے۔

پتہ:۔ حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور موچی دروازہ (عمران منزل)





مخزن

سمندر

یکے دریا نہ ورے رابُن پدید و نے کراں پیدا
درو اندیشہ حیراں وہم سرگرداں خرد شیدا

پیارے اقبال! آپ گذشتہ خط میں مجھ سے سمندر کی کیفیت پوچھتے ہیں۔ متحیّر ہُوں کہ کیا لکھوں۔ ہم لوگوں کو خُدا نے ہندوستان جیسے وسیع برّاعظم کے اندرونی حصّہ میں سمندر سے صدہا میل کے فاصلہ پر پیدا کیا ہے۔ اور ہمیں عموماً ساحلِ سمندر کی سیر کے بھی مواقع کم ملتے ہیں۔ پس خُدا کی مخلوقات کے اُس عجیب اور نہایت زبردست حصّے کی کیفیت کا ذہن نشین ہونا جسے ہم لفظِ "بحر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بغیر جنابِ بحر کی زیارت کے ہمارے لئے ناممکن ہے۔ جب مَیں جہاز پر سوار ہُوا تو ایک خاص کیفیت میرے قلب پر طاری تھی اور جُوں جُوں سمندر میں دُور نکلتے گئے۔ وُہ زیادہ ہوتی گئی۔ سمندر کی ناپیداکنار سطح کا نظّارہ طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا کرتا تھا۔ الفاظ اُن خیالات کی تصویر کیا کھینچ سکینگے۔ مگر۔ خیر۔ کوشش کرتا ہُوں کہ اُن جذباتِ دلی کو آپ کے روبرو کھول کے رکھدوں۔ اور آپ اپنی بے نظیر قوتِ متخیلہ سے کام لے کر وُہ کیفیت اپنے اُوپر وارد کرلیں۔

جن لوگوں کا علم سمندر کے متعلق جغرافیہ کی کتابوں کی اصطلاحی تعریف۔ اور نقشہ کے

نیلگوں رنگ سے ایا گیا ہے۔ نہیں کیا معلوم۔ کہ صانعِ حقیقی نے اپنی صنعتِ کاملہ کا کتنا پُرزور نمونہ دن رات سائیں سائیں کرنے والے سمندر میں دکھایا ہے۔ دنیا میں کونسی طاقت ہے جو اندازہ لگا سکتی ہے۔ کہ صدہا میل کی لمبائی اور صدہا میل کی چوڑائی میں جو پانی پھیلا ہوا ہے اور جس کے عُمق کا اندازہ عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے۔ حجم میں یا وزن میں کتنا ہے۔ کسے خبر ہے کہ اُس کی گہرائیوں میں کیا کیا چھپا ہوا ہے۔ اور کون کون سے اغراض اُس کے وجود سے وابستہ ہیں۔ خشکی پر آپ ایک وسیع سے وسیع میدان میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ کہیں نہ کہیں آپ کی نظر رُکے گی۔ اور کچھ نہیں تو کہیں کوئی ٹیلہ۔ کہیں کوئی تعمیر۔ کہیں کوئی درختوں کا جھُنڈ۔ کہیں سبزہ۔ کہیں ویرانہ۔ نظارہ کی یکرنگی میں خلل انداز ہونگے۔ مگر واہ رے سمندر۔ کنارہ سے تھوڑی دُور نکل جانے کے بعد جس وقت نظر دوڑاؤ۔ جدھر نگاہ ڈالو۔ جس طرف آنکھ پھیرو۔ پانی کی ایک مسلسل سطح دکھائی دیتی ہے۔ جہاز ہے کہ دن کو بھی چلتا ہے اور رات کو بھی۔ اہلِ جہاز تھک کر سو جائیں۔ مزدور باری باری سے آرام کریں۔ مگر انجن ہے کہ چل رہا ہے۔ اور راستہ ہے کہ طے ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ثبوت چاہو اور کوئی نشان ڈھونڈھو۔ تو ندارد۔ وہی پانی کا ایک احاطہ جہاز کے گرد کل تھا۔ وہی آج ہے۔ جہانتک حدِ نگاہ جاتی ہے۔ خشکی کا نام نشان نہیں۔ بہت ہوا تو کبھی دُور سے کسی دُوسرے جہاز کی دُھندلی سی تصویر نظر آگئی۔ جیسے ایک بڑی تقطیع پر ایک باریک سا نُقطہ ہو۔ مگر یہ نسبت سمندر کے اُس جُزو سے کہی جا سکتی ہے۔ جو ایک وقت میں پیشِ نظر ہوتا ہے۔ کُل کا تو کیا کہنا۔ اُس کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔

مَیں نے جب پہلی مرتبہ سامنے سے ایک جہاز آتا ہوا دیکھا۔ اور اس کی چھوٹائی پر اظہارِ تعجب کیا۔ تو ایک رفیقِ سفر جو پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "یہ آپ کا جہاز بھی تو انہیں کی طرح چھوٹا نظر آتا ہوگا۔" بات تو اُس نے ٹھیک کہی۔ مگر ہم تو اپنے جہاز کو چھوٹے پیمانے

پر ایک دُنیا مانے ہُوئے تھے۔ اُسکا قول فوراً خاطر نشین نہیں ہوا۔ خیال آیا کہ شاید وُہ جہاز چھوٹا ہی ہو۔ اپنے جہاز کے ایک افسر سے جو دُوربین لئے دُوسرے سٹیمر کو دیکھ رہا تھا۔ جاکر پُوچھا۔ کہ وُہ جہاز کتنا بڑا ہے۔ اُس نے کہا اسی کمپنی کا جہاز ہے اور دونو قریب قریب یکساں ہیں۔ اب یقین تو کرنا پڑا۔ اور اس یقین کا نتیجہ تھا۔ یہ سلسلۂ خیالات۔ کہ کیا ہم سب ملکر فی الحقیقت اس دریائے ناپیدا کنار کی ہستی کے مقابلے میں ایک نُقطہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یا اُس سے بھی کم"۔ عقل سلیم نے آواز دی۔"بیشک"۔"کیا ہندوستان کے گردن کش اور بالا دست حکمرانوں کا ایک کثیر گروہ بھی اسی نُقطہ میں آگیا؟""بلا شبہ"۔ "گویا اُنکی سچی غمگسار بیبیاں۔ جو حُسن وجمال میں چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں اور جن کے باریک ریشمیں کپڑے اپنی لپیٹ میں درم رفتار کئی دلوں کو لئے جاتے ہیں وُہ بھی اسی نُقطہ کا ایک جُزو ہیں"۔ (اگر ریاضی دانوں کے مذہب کے خلاف ہم نُقطہ کا جُزو کہنے کے مجاز ہیں)۔"ہاں وُہ بھی اسی میں شامل ہیں"۔ کیا ہندوستان کے وُہ چیدہ چیدہ آدمی جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی قوم میں یا باعتبار تجارت۔ یا ثروت۔ یا علم۔ یا مرتبت امتیاز رکھتا ہے۔ اور جو اپنے خیال میں بڑی اُونچی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ اُن کا شمار بھی اسی میں ہے"۔ عقل نے خیال کی گوشمالی کی اور کہا۔ کہ"باولا ہو گیا ہے۔ جب ایک دفعہ کہدیا کہ یہ تمہارا سارا جہاز مع تمام مسافروں اور مال اور اسباب اور زر و جواہر کے سمندر کے مقابلے میں ایک نُقطہ سے بھی کم ہے تو تُو ایک ایک جُزو کا کیوں نام لیتا ہے"۔

خیال۔ (بے صبری سے)"تو گویا حضرتِ انسان خشکی پر بیٹھے یُونہی اترایا کرتے ہیں۔ اِنکی اصل ہستی اتنی ہی ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ سمندر سکون میں ہے اور ہم مزے سے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر ذرا غصہ میں آجائے اور جوش میں مُنہ کھولدے تو ہم سب ایک نوالہ بھی نہیں"۔

عقل۔"اس میں کیا کلام ہے۔ ابھی تو وسطِ بحر میں ہو۔ کیا معلوم انجامِ سفر تک

کیا پیش آئے ۔ ع

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہوتے تک"

اِس شعر میں جو گہرے معنے غالبِ مرحوم نے بھر دیئے ہیں ۔ ان کی حقیقت بھی پُورے طور پر ہمیں کھلتی ہے ۔ موج کے دام کا تو ہمیں مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کے بیان کے لئے "صد کامِ نہنگ" سے بہتر الفاظ خیال میں بھی نہیں آ سکتے ۔ ہم نے تو موج کو مُنہہ کھولے نہیں دیکھا ۔ مگر جن لوگوں کو اکثر بحری سفر کا اتّفاق ہُوا ہے ۔ وُہ بتاتے ہیں کہ بعض اوقات ایک ایک لہر ایسی پُر شور اور تُند آتی ہے ۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا نہنگ مُنہہ کھولے ہُوئے آرہا ہے ۔ جو جہاز کو نگل جائیگا ۔ پانی جہاز کے تختہ سے بہت بلند ہوکر اس کے دُوسرے پار جا گرتا ہے اور جہاز سے ٹکرا جائے تو اس پر ایک شدید زلزلہ آجاتا ہے ۔

ہمیں تو حُسنِ اتفاق سے سمندر حالتِ سکون میں مِلا ۔ اور اِسی لئے خیالات کی گنجائش تھی ۔ ورنہ گھبراہٹ میں سوائے خوف کے اَور کیا خیال رہتا ہے ۔ قطرہ کا لفظ زبان سے نکلنا تھا کہ مجھے سعدی شیرازی کے دو شعر یاد آئے ۔ ہائے کیا لوگ تھے ۔ فرماتے ہیں :۔

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید ۔۔۔ خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم ۔۔۔ گر او ہست حقا کہ من نیستم

کس طرح روزمرّہ کے واقعات سے سبق حاصل کرتے تھے اور معمولی مشاہدات میں کیسے دفترِ حکمت اور معرفت کے بند کر گئے ہیں ۔ لفظ دریا سے یہی سمندر تو مراد ہے ۔ ہمارے ہاں کے ندی نالوں کو تو دریا نہیں کہنا چاہئیے ۔ قطرہ پر واقعی دریا کے مشاہدے کا یہی اثر ہونا چاہئیے ۔ کہ وُہ اپنی ہستی کے ناچیز ہونے سے آگاہ ہوجائے ۔ سمندر کا اثر انسان کے دل پر اگر اتنا بھی نہ ہو ۔ تو حیف ہے ۔ سمندر کی وسعت سے موجُودات

کی وسعت کی طرف خیال دوڑتا ہے اور جہاز اور اہلِ جہاز کی مجموعی ہستی کا پہنائے دریا کے مقابلے میں ہیچ ہونا یہ یقین دلاتا ہے کہ انسان باوجود اپنی ساری لن ترانیوں کے ہیچ ہے۔ یہ انکسار طبعِ انسانی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور غرور و تکبر کے مرض کا علاج ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کہ ہمت اور تدبیر میں کمی آجائے۔ ہمت اور تدبیر ہی کمزور انسان کو یہ قوت عطا کرتی ہیں کہ وہ اس طرح ہوا اور لہر دونو سے بے پروا خدا کی توکل پر پانی میں کود پڑتا ہے۔ اور ننانوے فی صدی سے زیادہ مواقع ایسے ہیں۔ جن میں وہ پار جا لگتا ہے۔

سکون کے وقت سمندر کا دیدار آنکھوں کو فرحت بخشنے والی چیز ہے۔ تختۂ جہاز پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو لہروں کا ایک لاتعداد سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو ہوا کے نرم نرم جھونکوں کے اثر سے جو سمندر پر قریب قریب ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ ایکدوسرے کے پیچھے حلقے بناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لہریں ایکدوسرے کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔ صبح کے وقت جب آفتاب نکلتا ہے۔ اور اُچھلتی ہوئی لہروں کی سفید جھاگ پر اس کی کرنیں گرتی ہیں۔ تو قوس قزح کے سارے رنگ دفعتًا شفاف پانی کے تختوں میں چمک جاتے ہیں اور دُور اُفق کے قریب تو سُنہری رُپہری فرش بچھتا ہوا نظر آتا ہے۔ گویا شاہِ خاور کے خیر مقدم کے لئے سامان ہے۔ جُوں جُوں آفتاب اُونچا ہوتا آتا ہے۔ سمندر کا قدرتی اور مستقل نیلگوں رنگ اپنی اصلی آب دکھاتا ہے۔ ہوا میں کچھ دیر کے لئے نہایت خفیف سی حدت پیدا ہوتی ہے اور لہریں ذرا غیر معمولی طور پر ساکن رہنے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ گویا قدرت بھی دوپہر اور قیلولہ کو جمع کرنا چاہتی ہے۔ سُورج ڈھلا۔ اور لہروں نے ہاتھ پانو مارنے شروع کئے۔ شام کا وقت اِن کی بھی سیر تفریح کا ہوتا ہے۔ سکون کے دنوں میں بھی ذرا سی حرکت شام کے قریب اِن میں آجاتی ہے۔ شاید اس وقت ورزش کے طور پر مشقِ ستم کرتی ہیں۔ ہنستی ہنستی جہاز کی طرف دوڑتی ہیں اور بہت

سے ناواقفِ حال چہروں کی رنگت متغیر کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاز کی گستاخانہ رفتار سے ناراض ہو کر اُسے تھپیڑے مارنا چاہتی ہیں۔ مگر پھر ہنس کے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ان کے رمز شناس مسکراتے ہوئے ان اٹکھیلیوں کے مزے لیتے ہیں۔ شام ہوئی اور مسافروں نے بسیرے لئے۔ رات کو ستارے ہوتے ہیں اور موجیں۔ اُنکے راز و نیاز میں ہم کو کیا دخل۔ ہاں کہیں اتفاق سے شبِ ماہ ہو۔ جیسا کہ ہمیں چند دن نصیب ہوئی۔ تو سبحان اللہ۔ یہ سماں سمندر پر عین شباب کی مستی کا ہوتا ہے۔ پانی کیا اُچھلتا ہے۔ پگلی ہوئی چاندی کی لہریں ہیں جو ماہتاب کی طرف دستِ شوق بڑھاتی ہیں۔ اور اُس سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہیں۔ اور ماہتاب ہے کہ انکی جسارت کو چشمِ محبت سے دیکھتا ہے اور اُن کی طرف کھینچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال ہی خیال ہو۔ مگر اتنا تو ضرور ہے۔ کہ اُس کی روشنی میں اس وقت ایک عجیب سرور کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس کی تاثیر محبت ہوتی ہے۔ مہجوروں کو بھولے ہوئے یارانِ وطن یاد آتے ہیں۔ جن کے دوست عزیز ساتھ ہیں۔ وہ اُن سے گھل مل کے باتیں کر رہے ہیں اور جو چاہنے والے شوہر اور چہیتی بیبیاں جہاز پر ہیں اُن کی تو اُسوقت کچھ نہ پوچھئے۔ دستِ شوق بے خبری میں کمر کے گرد خمِ کمند بنا رہا ہے۔ اور لبِ اظہار سے فصاحت کے دریا بہہ رہے ہیں۔ جن کا ماحصل اس فقرہ میں ہے۔ کہ "سمندر کا سفر۔ اس خوشگوار موسم میں۔ اور خصوصاً ایسی چاندنی کے وقت کتنا پیارا سفر ہے"۔ خیر۔ یہ تو بااقبال لوگوں کی کیفیتیں ہیں۔ ہمیں ان سے کیا۔ میں تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں۔ کہ اقبال کو بُلاؤں۔ کہ "آ۔ اور دیکھ" +

عبدالقادر

ناکام محبّت

ایک روز کا ذکر ہے مَیں ٹہلتا ٹہلتا دیہات کی طرف جا نکلا۔ چونکہ دُور بہت نکل آیا تھا واپس ہوتا ہُوا دم لینے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ دُور سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آیا تو معلوم ہُوا کہ کچھ نوجوان لڑکیاں ایک تابُوت کو اُٹھائے ہیں اور ایک جو اُن سب سے کسی قدر بڑی عمر کی ہے تابُوت کے آگے آگے سفید پھولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لئے آرہی ہے۔ پوشاک ان سب نازنینوں کی سفید رنگ کی تھی۔ تابُوت کے پیچھے پیچھے متوفّی کے والدین تھے۔ جن کی وضع سے ظاہر تھا کہ کوئی اچھے خوشحال کسان ہیں۔ باپ کے چہرے سے صبر و استقلال عیاں تھا مگر جمی ہُوئی نظر چڑھی ہُوئی تیوری اور جُھریوں دار چہرہ بتا رہا تھا کہ اندر دِل کی حالت کچھ اَور ہے۔ ماں اپنے خاوند کے بازو پر جُھکی ہُوئی تھی اور رہ رہ کر بیتاب ہوتی تھی۔ مَیں جنازے کے ساتھ ہولیا اور دفن کے بعد تک لوگوں کے ساتھ رہا۔ جب تابُوت کو قبر میں اُتارا ہے۔ سہیلیاں پھُوٹ پھُوٹ کر روتی تھیں باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ماں کا یہ حال تھا کہ کوئی تسلّی دیتا تھا تو اَور بیچین ہوتی تھی۔ افسوس جس ماں کا گُل گلزارِ خوبی عینِ بہار میں یکایک یُوں پژمردہ ہوکر رہ جائے وہ اگر یہ بھی نہ کرے تو اَور کیا کرے!

قبرستان سے واپس ہوکر میں نے سارا حال معلوم کرلیا۔ اور معلوم کرنے کو کیا ایک نہایت سادہ کہانی تھی۔ متوفّی گاؤں کی ممتاز حسین اور سارے کسانوں کی لاڈلی نوجوان لڑکی تھی۔ یہ اپنے ماں باپ کی اخیر عمر کی ایک ہی بچّی تھی اور دیہات کی سیدھی سادی معاشرت میں بڑے نازوں سے پَل کر جوان ہُوئی تھی۔ تعلیم اِس نے

گاؤں کے پادری سے پائی تھی اور وُہ اس پر بیحد شفقت کیا کرتا تھا۔ اس کا نازک ڈیل ڈول دلفریب خدوخال البیلا حُسن خداداد دِلرُبا بھولا پن غضب کا الھڑ پن اور بیحد نیک دِل یہ کہتا تھا۔ کہ کھیت کے مضبُوط مضبُوط درختوں میں حُسنِ اتّفاق سے باغ کا ایک نازک نونہال پھلنے پھُولنے کو آپڑا ہے۔ سہیلیاں اُس کے حُسن کی برتری کو تسلیم کرتی تھیں۔ مگر حسد نہ کرتی تھیں۔ اس کی بلا تصنّع نرم مزاجی اور دلربا خوش اطواری ایسی تھی کہ یہ خیال نا ممکن کیسا محال محض تھا۔ دیہات کا کونسا تہوار تھا جس میں ہماری خوبصُورت کسان کی لڑکی اپنی سہیلیوں سمیت شریک نہ ہوتی تھی۔ کونسی خوشی کی تقریب تھی جس میں اس کے قدوم میمنت لزوم سے لُطف دوبالا نہ ہوجاتا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں جھُولے ڈالے جاتے تھے۔ پھُول پہنے جاتے تھے۔ لُٹائے جاتے تھے۔ اور ہزاروں طرح طرح کے دِل بہلاوے ہوتے تھے۔ یہ جلسے گاؤں میں اکثر ہا کرتے تھے اور ان موقعوں پر کبھی کبھی شہر کے رہنے والے بھی تماشا دیکھنے کو آنکلتے تھے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر سپاہیوں کا ایک دستہ گاؤں کے قُرب وجوار میں آکر ٹھہرا۔ بہت سے سپاہی تماشا دیکھنے کو آئے۔ اِن میں ایک نوجوان افسر بھی تھا اُس پر اس گاؤں کی رہنے والی ملکۂ حسن و جمال مرجعِ خاص و عام کا اثر ایسا ہوا کہ بیدھڑک اظہارِ محبت کرنے لگا۔ اُس کے محبّت بھرے جُملوں۔ اُلفت کی نظروں پیار کے لہجوں اور سینکڑوں ملائم اور دل پسند حرکات وسکنات نے اس ننّھے نازک بھولے بھالے دل کو چٹکیوں میں موہ لیا۔ اِس کے دِل میں نوجوان سپاہی کی محبّت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ مگر اِسے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور آخر کیا ہوگا۔ اِسے آئندہ کا خیال تک نہ آتا تھا۔ اُس کا منظورِ نظر جب پاس ہوتا تو یہ اُس کی باتوں اُس کے حرکات وسکنات میں محو رہا کرتی اور وُہ پاس نہ ہوتا تو یہ ایّامِ گذشتہ کے شیریں واقعات کو یاد کر کرکے جی بہلایا کرتی۔ اُفو! اس لڑکی کو اپنے محبُوب سے کتنی محبّت تھی! نوجوان

سپاہی کی سپاہیانہ خوبصورت وضع نے اِس پر جادو کر دیا تھا اور اس کے دل کو چھین لیا تھا۔ یہ گویا اُس کی پرستش کرتی تھی اور اُسے ہمیشہ اپنے سے اعلیٰ و برتر سمجھتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس پر دولت اور رُتبہ کا اثر پڑتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ وُہ تو عقل و تمیز سلیقہ و شعور تھا۔ جس کے باعث نوجوان سپاہی نے اِس کے دِل پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی اور بے انتہا مسرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اور جب کبھی اس اثنا میں اپنا خیال آجاتا تھا تو آپ کو بہت کم درجہ پاکر ایک ادائے دلربایانہ کے ساتھ جھینپ جاتی تھی۔ اِس کے عاشق کو اِس سے محبّت تو بڑی تھی لیکن اس قدر نہ تھی جس قدر اِسکو تھی۔ اُس نے اگرچہ کھیل ہی کھیل میں اِس سے تعلق پیدا کیا تھا تاہم وُہ ایسا آزاد و اوباش نہ تھا کہ کچھ بھی پروا نہ کرتا۔ اُس نے محبت کو تماشا سمجھا تھا مگر خود محبّت کا تماشا ہو گیا۔ وُہ اِس معصُوم بھولی بھالی محبّت کرنے والی کے اطوار۔ حسن معاشرت اور حیا و عصمت کو دیکھتا تھا تو بے اختیار شادی کی تمنّا اُس کے دل میں موجزن ہوتی تھی۔ مگر پھر اُس کا اعزاز ظاہری خاندانی مرتبہ اور باپ کی مغرور اور پُر تمکین طبیعت یہ سب ایسی رُکاوٹیں تھیں کہ اُسکا دِل ٹُوٹ جاتا تھا۔

یکا یک رسالے کے کُوچ کا حکم ہُوا اور اِس نے ہمارے نوجوان کی آرزُوں کا یکلخت خُون کر دیا۔ نوجوان نے نہ چاہا کہ اپنی محبُوبہ کے نازک دِل کو اس وحشتناک خبر سے صدمہ پہنچائے۔ اِسی لئے جب چلنے میں ایک دن رہا تو مجبُوراً شام کو سیر کرتے کرتے اُس سے ذکر کیا۔ اِس معصُومہ کو جُدائی کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ خبر کیا تھی ایک برق بلا تھی کہ خرمن مسرت و راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کر گئی۔ نازنین زار زار مثل ابر نوبہار رونے لگی۔ عاشق صادق نے فرطِ محبّت میں سینے سے لپٹا لیا۔ نازک گلابی رُخساروں کو چُوما اور یہانتک کہا کہ آؤ گھر چھوڑ دو اور جہاں خُدا لیجائے ساتھ چلی چلو۔ یہ اِس قدر سادہ لوح تھی کہ سراسیمہ ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی اور جب

ذرا دیر کے بعد مطلب سمجھی تو عجب کیفیت ہوئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اس طرح پیچھے ہٹی جس طرح کوئی آنچ سے بچتا ہے اور ایسی درد بھری نظر سے اُس کی طرف دیکھا کہ نگاہ سینے کو چیر کر دل کے پار ہو گئی۔ پھر کلیجا مسوس کر باپ کی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ غریب سپاہی ہکا بکا خفیف ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی دن رسالے کے ساتھ وُہ اُس گاؤں سے چلا گیا۔ نئے آب و دانے نئے نئے منظروں نئی نئی تفریحوں اور نئے نئے رفیقوں نے اُس کی محبت کو بھلا سا دیا۔ تاہم خیمہ گاہ کی چہل پہل۔ زمانِ نادہ کی تفریح۔ فوجوں کی صف آرائی اور لڑائیوں کے شور و غل میں کبھی کبھی اُسے دیہات کی پُرامن اور سادہ زندگی کے نظارے یاد آجاتے تھے۔ ہائے وُہ سفید جھونپڑی! وُہ بٹیا جو رُوپہلے نالے کے کنارے کنارے ہو کر اُوپر پہاڑی تک پہنچتی تھی! وُہ ننھی مُنّی دیہاتی لڑکی جو اُس کے بازو کے سہارے اُس بٹیا پر اِدھر اُدھر ٹہلا کرتی تھی اور بےحد تمنّا کے ساتھ اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی!

محبوب کی جُدائی سے بیچاری دہقان زادی کو بڑا بھاری صدمہ ہُوا۔ اُس کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ پہلے کچھ دنوں تک تو غش آتے رہے اور دیوانہ پن کے آثار پائے گئے۔ جب یہ شکایتیں دُور ہوئیں تو ایک گہری تاریک غم کی گھٹا دل پر چھا گئی جس سے تھوڑے ہی عرصے میں جسمِ نازنین سُوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آہ! اِس نے جھروکے سے سپاہیوں کو کوچ کرتے دیکھا تھا! اِس نے اپنے بیوفا عاشق کو دُور تک اسقدر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تھا کہ ڈھیلوں میں درد ہونے لگا تھا۔ وُہ جو اب فقط ایک چمکتا تارا سا نظر آتا تھا! ہائے ایک خواب روشن تھا کہ آنکھوں سے نہاں ہو گیا اور اِسے تاریکی میں چھوڑ گیا! لوگوں سے اِسے نفرت ہو گئی۔ اکیلی اُن روشوں پر ٹہلا کرتی تھی۔ جن پر یہ اور اُس کا محبوب دونو اکثر ٹہلا کرتے تھے۔ بس جس طرح کوئی

آہوئے زخم خوردہ سب کی نظروں سے پنہاں ہو کر کسی گوشے میں رو رو کر جان کھویا کرتا ہے ۔ ہو بہو یہی اس کی حالت تھی ۔ شام کے وقت گوالنیں اپنے اپنے کھیتوں سے آتی تھیں تو اکثر اسے کوئی غمناک گیت گنگناتے سنتی تھیں ۔ عبادت کی طرف اب اس کا میلان بہت زیادہ ہو گیا ۔ جب پاس سے گذرتی تھی تو بڑے بوڑھے بھی اس کی ناتوانی ولاغری پر ترس کھا کر اور اس کی زاہدانہ صورت سے مرعوب ہو کر راستے سے ہٹ جاتے تھے ۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں قبر کی طرف قدم بڑھائے جا رہی ہوں ۔ مگر قبر کا خیال اسے تشویش میں نہ ڈالتا تھا ۔ یہ تو اُسے آرامگاہ سمجھتی تھی جس رشتہ سیمین نے اسے دنیا سے باندھ رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا دنیا کی کوئی خوشی اسے نظر نہ آتی تھی ۔ سخت مجبور ہو کر اس نے اپنے محبوب کو ایک آخری خط لکھا اس میں یہ بیان کیا کہ میں جاں بلب ہوں اور یہ سب تمہاری کرتوت ہیں ۔ اس خط میں اپنے تمام رنج والم بھی تحریر کئے اور اخیر میں یہ لکھا کہ میرے جی نے گوارا نہ کیا کہ تمہیں معاف کئے بغیر مر جاؤں ۔

بالآخر نقاہت اتنی بڑھی کہ جھونپڑی سے باہر نکلنا محال ہو گیا ۔ گر پڑ کر جھروکے تک پہنچ جاتی تھی اور وہیں بیٹھی بیٹھی دن گذار دیتی تھی ۔ اُس نے کبھی کسی کا گلہ نہ کیا اور نہ اپنا دُکھ کسی سے کہا ۔ محبوب کا نام تک کبھی اُس کی زبان سے نہ نکلا ۔ ماں کے سینے پر گردن ڈال دیتی تھی اور چپکی چپکی روتی تھی ۔ غریب والدین بیٹی کا یہ حال دیکھ دیکھ کر کُڑھتے تھے مگر مایوس نہ ہوتے تھے ۔ ابھی اُنکو اُمید تھی کہ ہمارے خزاں زدہ نونہال پر پھر ایک دن بہار آئیگی ۔

ایک دن اسی صورت سے وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھی تھی ۔ دونوں ہاتھ اُنکے ہاتھوں میں تھے کھڑکی کھلی تھی اور نرم نرم ہوا کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کی پلی ہوئی حنا کی خوشبو مشام جان کو معطر کر رہی تھی ۔ باپ ابھی ابھی کتاب مقدس کے ایک مقام

کو پڑھ کر سُنا رہا تھا جہاں دُنیا کی بے ثبات راحتوں اور بہشت کی ابدی لذتوں کا بیان تھا۔ آہ! معلوم ہوتا تھا کہ اس بیان سے اُسے تسلی ہوتی ہے! والدین بڑی حسرت سے اُس کی صورت کو تک رہے تھے جو کثرتِ رنج و غم کے باعث نورانی ہو چلی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ایک طرف کو دیکھ رہی تھی۔ اور نازک نیلی نیلی انکھڑیوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایک! کیا وہ اپنے بیوفا محبوب کی یاد کر رہی تھی یا اُس کے دل میں کچھ اور ہی خیال تھا۔

یکایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کان میں آئی۔ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا جھونپڑی کے دروازے کو آیا اور جھروکے کے نیچے آکر اُتر پڑا۔ بیچاری لڑکی نے آہستہ سی ایک چیخ ماری اور پھر اپنی جگہ لیٹ رہی۔ ہاں یہ اُسکا پشیمان عاشق تھا! وہ دوڑ کر اندر آیا اور آتے ہی اسے سینے سے لپٹا لیا۔ نحیف و زار جسم اور مُردنی چھائے ہُوئے زرد زرد پیارے چہرے کو دیکھ کر اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اِس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ اُٹھتی۔ بیٹھے ہی بیٹھے کانپتا ہُوا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ لبوں کو جنبش ہُوئی مگر کوئی لفظ منہ سے نہ نکلا۔ ایک عجیب محبت بھرے تبسم کے ساتھ نگاہ کی اور پھر سدا کو آنکھیں بند کرلیں۔

یہ ہے وہ کہانی جو مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہُوئی۔ واقعات کس قدر سادہ تھے مگر مجھ پر انکا اثر ایسا ہوا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ اسکے بعد میں بارہا اس گاؤں میں آیا اور جب آیا ارادتاً قبرستان میں گیا۔ جاڑے کی ٹھنڈی شام تھی۔ درختوں نے پتوں کا پُرانا لباس اُتار دیا تھا۔ ہوا خشک گھاس میں سے سَن سَن کرتی آتی تھی۔ اور ہر طرف ویرانی اور بے رونقی چھائی تھی۔ معصوم گاؤں والی کی قبر پر سبز بیلیں چڑھی تھیں اور ہری ہری دوب قبر کے تعویذ پر لہلہا رہی تھی۔ وُہی پھولوں کا ہار جسے میں نے میّت کے روز دیکھا تھا قبر پر لٹکتا تھا۔ پھول تو مُرجھا کر خشک بھی ہو گئے تھے لیکن احتیاط کرنے والوں نے یہ احتیاط ضرور کی تھی کہ اُنکی سفیدی میں فرق نہ آئے۔ میں نے بہت سی عجیب و غریب یادگاریں دیکھیں اور ایسی ایسی دیکھیں کہ سنگدل سے سنگدل ناظر کا دل بھی اُن کو دیکھ کر بھر آئے۔ مگر ایسی یادگار تھی کہ میرے دل پر جتنا اُسکا اثر ہوا اتنا کبھی کسی کا نہ ہُوا تھا۔

(ترجمہ از ارونگ)

سید نذیر حسین

لاہور کی اک شام

(مُردہ دل اس کو نہ پڑھیں)

کچھ تو اڈیٹر مخزن کی فرمائش اور کچھ شہرت کی خواہش کے فکر میں تھا کہ لکھوں تو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں کہ یکایک کسی نے ....

ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ دو گھنٹے سے کسی وفا شعار کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بیٹھا تو کیا تھا یُوں کہنا چاہیے کہ اُٹھتا تھا اور بیٹھتا تھا کھڑکی میں سے جھانکتا تھا اور کمرہ میں ٹہلتا تھا۔ گھڑی ہاتھ میں دل سینہ میں دونوں یکساں متحرّک دونوں پر غصّہ۔ بحرِ خیال کی شورش اور خواہشوں کی لہروں کا ٹکرانا۔ زیست کی ننھی سی کشتی اور بے صبری کی چٹانیں اُمید تھی تو نااُمیدی یاس تھی تو جینے سے۔ آخرش جسم میں کچھ سنسناہٹ سی ہُوئی سنسناہٹ کہوں یا اُمید کی جانکنی۔ اِس کو کس طرح بیان کروں جس پر بیتی ہو وہ سمجھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اشکِ غماز دامن پر تھا اور مَیں تصویرِ یاس کرسی پر۔ اس بے بسی کے عالم میں بھی آدھ گھنٹہ کامل گذر گیا۔ انجامِ کار میں نے یہ سوچا کہ کچھ مضمون ہی لکھوں کہ یکایک .....

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دیکھا تو اک قرضخواہ تھے۔ انکو جُوں توں ٹالا تو سہی لیکن مضمون ان سے بھی پہلے رخصت ہُوا۔ بہت کچھ دِل کو سمجھایا مگر بے سُود۔ یہ کب ممکن ہوسکتا تھا کہ سلسلۂ خیالات جو منقطع ہو چکا ہو (اور منقطع بھی اک قرضخواہ کی صورت دیکھ کر) وُہ خود بخود موجُود ہو جائے۔ اس بیچارگی کی حالت میں مَیں نے یہ ارادہ کیا کہ سیر کو ہی نکلوں۔ غم اگر غلط نہ ہوگا تو کونسا ایسا بڑھ جائیگا۔ یہ ٹھان لکڑی ہاتھ میں لے ہر قدم پر دل کو سو سو تسلّیاں دیتا باہر کو چلا۔ مگر صُورت کیسے بدلتا اور بشاشت کہاں سے خریدتا۔ گلی سے نکلا ہی تھا کہ ایک فقرہ بازبھانپ گئے اور بیٹھک میں بیٹھے ہی بیٹھے

یوں فرمانے لگے "آپ حضرت مضطر کس کی بات میں ایسے گن گن کے قدم بھر رہے ہو۔ واللہ انشا بھی کیا شاعر تھا۔ سال پہلے آپ کی چال کی تعریف کر گیا ہے۔ ع

ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

ہم ملا دینگے بات ہی کیا ہے"؟ اب چونکہ میں پہلے ہی قید لگا چکا ہوں کہ اس مضمون کو مردہ دل نہ پڑھیں۔ اس واسطے میں کھلم کھلا دل کی بات کا اظہار کرتا ہوں اور امید ہے کہ میرے تجربہ سے میرے ہمخیالوں کو ایک نتیجہ خیز سبق حاصل ہو گا۔

یہ تو ناظرین فوراً سمجھ سکتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو دن رات حسن کے گیت گاتے ہیں جن کا اصول زندگی عشق ہے مگر یہ ان کو صرف بتانے سے معلوم ہو گا کہ میں اُن خاص عشقبازوں میں سے ہوں جن کو بار بار اپنی حالت پر افسوس آتا ہے اور جن کی طبیعت اگر انکو ٹھنڈا کچھ لہا جائے تو آگ کی طرح بھڑکتی ہے اور خودداری و عزت کو ہاتھ سے جاتا ہوا دیکھ کر عشق کے موہوم بند و رسن کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

چنانچہ جس وقت مجھ کو اس شخص نے مذکورہ بالا الفاظ کہے تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قریب تھا کہ جوانی اپنا رنگ لاتی اور دیکھنے والوں کو دو چار دن کے لئے ایک دلچسپ مضمونِ گفتگو ہاتھ آتا۔ مگر میں نے ضبط کیا اور ٹل گیا۔

ٹل تو گیا لیکن غصہ کا وُہ زہر جو ہاتھ اور بازو کے ذریعہ نہ نکلا دل میں اپنا کام کرتا گیا اور بار بار مجھ کو یہ خیال آتا رہا کہ کیوں میں نے اپنا اور اس فقرہ باز کا خون ایک نہ کیا اور جب یہ سودا بھی ختم ہوا تو پھر یہ سوچنے لگا کہ آخر عشق میں بُرائی ہی کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تو بدیہی تھا کہ بُرائی ہے بھی اور نہیں بھی صرف واقعات پر انحصار ہے لیکن میری عقل پر کچھ ایسا پردہ چھایا تھا کہ ان ایام میں مجھ کو عشق ہی مذہب اور عشق ہی بہشت معلوم ہوتا تھا۔ اور وُہ تمام لوگ جو اسے مطعون کرتے تھے مجھ کو ابو جہل کے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ انہی خیالات میں غرق۔ ٹھنڈی سڑک پر جا پہنچا۔ سڑک کی

پُر فضا بہار۔ حور وش یورپین لیڈیوں کی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی ربڑ کے پہیوں والی گاڑیاں۔ بائیسکلوں کی برق رفتاری۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے آنکھیں کھل گئیں۔ دل سے تمام غبار کلفت دور ہو گیا۔ اتنا تغیر ہوا کہ یا تو سر جھکائے زمین پر نگاہ جمائے آ رہا تھا یا فوراً آنکھ اٹھا کر اس بہارِ زندگی کا مزا لوٹنے لگا۔ دور سے دیکھا کہ دو نوجوان ترکی ٹوپیاں زیب سر کئے میری طرف آ رہے ہیں۔ یوں تو میں ویسی ہی ترکی ٹوپی پر مرتا ہوں لیکن انکی ترکی ٹوپیوں میں کچھ غضب کی ادا تھی۔ جوں جوں وہ قریب آتے گئے دل بیتاب ہوتا گیا۔ پاس آئے تو معلوم ہوا کہ میرے ہی ہمجماعت سعادت و کرامت ہیں۔ دونوں طرحدار بانکے دونوں سرخ و سفید ایک قد ایک لباس دونوں فدائے شعرِ زندہ دلی کی جیتی تصویریں۔ جی تڑپ اٹھا کہ ہو سکے تو انکے ساتھ سیر کیجئے۔ سعادت نے بھی مجھ کو دور سے ہی پہچان لیا اور کہا مسٹر مضطر آپ غالب کے اس شعر کے خوب معنے سمجھتے ہیں۔ ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب دیکھو اکیلے لیکن آج تو ہم آپ کی اس انجمن میں مخل ہونگے۔ آیئے کرامت نے اک مضمون پیش کیا ہے اس کی بحث میں آپ بھی شریک ہوں۔ مضمون دوستی ہے اور دوستی بھی نوجوان ہم عمروں کی۔

میں ۔ واقعی بہت پیارا مضمون ہے لیکن بحث کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

کرامت ۔ واہ بحث کے تو سمندر کے سمندر کھپ سکتے ہیں۔ مثلاً سعادت اور کرامت دو بیوقوف سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی میں اگر کچھ حاصل کرنے کے قابل چیز ہے تو وہ دوستی ہے۔ اس کے بغیر شاہنشاہی گدائی سے بدتر ہے اور اگر یہ حاصل ہو تو گنج قارون کی وقعت گرد راہ سے زیادہ نہیں۔ دو دل ایک ہوں تو چار بازو اک فوج ہیں اور

اگر یہ میسر نہ ہو تو لاکھوں کروڑوں سپاہ بیکار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ خیال آتا ہے کہ یقیناً ہماری یہ آرزوئیں ہماری ناآزمودہ کاری کا نتیجہ ہیں اور زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال تک مفقود ہو جائینگی تو اوّل عقلِ انسانی پہ افسوس آتا ہے کہ جو چیز ہم کو اب جزوِ زندگی معلوم ہوتی ہے وہ درحقیقت اک جنسِ ارزاں ہے اور دوئم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دوستی اور اُس کی خواہش صرف سن کا تقاضا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس عارضی نمو کی غور و پرداخت میں عمر یا اسکا ایک منٹ بھی صرف کیا جائے؟ کیوں نہ انسان کتابیں پڑھے یا ابھی سے کمانے کی فکر میں لگ جائے؟

سعادت بھائی میں نے تو پہلے ہی کہدیا ہے کہ انسان دوستی بھی کرے کتابیں بھی پڑھے کمانے کی فکر بھی کرے مگر ہاں سب چیزیں اعتدال سے کرے۔

کرامت۔ اعتدال سے تو مجھ کو نفرت ہے۔ میری رائے میں تو یہ چھوٹے دلوں کی نشانی ہے۔ اس لفظ کو اگر کوئی سکندرِ اعظم یا نپولین کے سامنے بطورِ قانونِ زندگی پیش کرتا تو وہ کہنے والے کو کمرے سے باہر نکلوا دیتے۔

مَیں۔ واقعی اعتدال تو کچھ بڈھے آدمیوں کی سی نصیحت ہے۔ انسان کا دل اک سمندر ہے جسکا مد و جزر کی کشش کبھی چین لینے نہیں دیتی۔ نیچر میں بھی اعتدال کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ورنہ بجلی کی کڑک سے لیکر مکھی کی بھنبھناہٹ تک سب اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہیں۔

سعادت۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب ہیں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

کرامت۔ سعادت تمہیں کیا عادت ہے کہ جھٹ اپنی بات کی سند میں شعر پیش کر دیتے ہو۔ بھلا شعر کو منطق سے کیا تعلق؟

مَیں ۔ جی ہاں اور اگر انہی سے پوچھا جائے کہ مرزا کی بے اعتدالیوں کو انکی

لیاقت اور عظمت سے کچھ تعلق نہ تھا تو یہ فرمائینگے ضرور تھا -

سعادت - بیشک - اعلیٰ درجہ کی فضیلت و لیاقت کے ساتھ نوّے فی صدی مثالوں میں بے اعتدالیاں نظر آتی ہیں لیکن وُہ بے اعتدالیاں زید و عمرو کے معیار سے بے اعتدالیاں ہیں نہ کہ ان بڑے آدمیوں کے معیار سے - جنکی خوبیوں کا ذکر کیا جائے مثلاً آپ کے اور میرے لئے تو یقیناً آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا بے اعتدالی ہے - لیکن سرسید مرحوم صُبح سے شام تک کام کرتے تھے اور اُنکی صحت میں چنداں فرق نہ آیا - جن دنوں میں اُنہوں نے انجیل کی تفسیر لکھی وُہ دو یا تین گھنٹے آرام کرتے تھے لیکن آپ تو کر کے دیکھیں ؟ خیر اصل مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک معمّا ہے جس کے بہت سے مختلف لیکن صحیح حل ہو سکتے ہیں - کسی کو سپاہی ہونے میں مزا ملتا ہے کسی کو قلم گھسانے میں - کسی کو معاملات کے توڑ جوڑ میں اور کسی کو نُون تیل تولنے میں لیکن کامیابی اور دیرپا کامیابی کے لئے اعتدال اِک جزوِ اعلیٰ ہے -

کرامت - بجا فرمایا - اوہو باتوں میں رستہ تو ختم ہوگیا اور بحث جُوں کی تُوں - خیر پھر سہی -

میں - آپ تو بورڈنگ ہوس جائینگے مجھے اجازت ہو - تسلیم -

مضطر

دربار نمبر :- جو دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا - اس کے مضامین بجائے ۵۶ کے ۹۶ صفحے آئے تھے - اور اُنہیں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا - اسکی کچھ زاید کاپیاں رکھی ہیں - جن حضرات کو شوق ہو - جلد طلب فرمائیں - اس میں کئی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں - **قیمت** ۲ ربیعہ بشکل ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی - پی طلب کیجئے + **مینیجر مخزن**

[redacted]

پٹنہ

اور

خان بہادر مولینا شاد مدّظلہٗ

اُن شہروں میں جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ پٹنہ (عظیم آباد) بھی ہندوستان کے قابلِ ذکر شہروں میں ہے۔ گو اسکی بہار خزاں سے مبدّل ہو چکی ہے۔ مگر اس خزاں میں بھی ایک ایسی ادا اس شہر میں پائی جاتی ہے جو نہایت دلفریب ہے اور یہاں کے لوگ آج تک اس کے قدیم علمی مذاق کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کے نامور شاعر مولانا شاد قدرتی طور پر اپنے وطن کے دلدادہ ہیں اور ان کے کلام میں جابجا اس کی بے ساختہ توصیف پائی جاتی ہے۔ جو دلنشین ہے۔ مخزن کے دسمبر نمبر میں ایک اردو نظم جناب موصوف کی چھپی تھی۔ جس میں شاعر کے دلِ پُر درد سے پٹنہ کی قدیم بزرگی کی داستان اور اس کے زوال کا افسوسناک قصہ درج تھا۔ جس کو بچشم پُر آب پڑھنا مشکل تھا۔ حال میں ہمیں اُن کے چند فارسی اشعار ملے ہیں۔ ان میں بعض خطبائے دکن کے خطوط کے جواب ہیں۔ جنہوں نے پٹنہ کی مذمت لکھی تھی۔ اس شہر کی اُن خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو اب بھی گئی گذری حالت میں بھی اُس میں موجود ہیں۔ اور اُسے چھوڑ کر کسی اور حصۂ ملک میں جا بسنے سے گریز کی گئی ہے۔ وہ ناز کرتے ہیں اور بجا ناز کرتے ہیں کہ گیوتم بدھ اسی حصہ ملک نے پیدا کیا۔ وہ فخر کرتے ہیں اور بجا۔ کہ ہندوؤں کا قدیم دارالعلوم یہاں تھا۔ اور انکا حق ہے کہ وہ کہیں کہ اب بھی وضعداری میں اہلِ عظیم آباد کسی سے کم نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ اشعار ہدیۂ ناظرین ہوں۔ تھوڑا سا ذکر مولینا شاد کے مختلف حالات کی بابت بھی ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ گو اس سے پہلے بھی انکے کمالات کا ذکر اس رسالے میں آچکا ہے۔ لیکن چونکہ مخزن کے ذرائع معلومات متعدد ہیں

اِس لئے یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ ناظرین ایسے باکمال کی زندگی کے زمانہ میں آپ کے بعض اوصاف سے ناواقف رہیں :-

۵۰ سال سے آپ دریائے ناپیدا کنارِ تصنیف و تالیف کے شناور ہیں۔ اصنافِ سخن میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس میں آپ نے مضامین جدید کے دریا نہ بہا دیئے ہوں۔ علاوہ مختلف قسم کی تصانیف کثیرہ کے جس میں رسائلِ فنِ معنی و بیان و موازنۂ مذاقِ شاعری اُردو زبان با زبان ہائے مختلف و امثلۂ اشعارِ اُردو و فنونِ عروض و قوافی و کُتبِ تواریخ و جغرافیہ و ناول وغیرہ کے تعلیم زبانِ عربی و فارسی و اُردو میں جو نصاب آپ نے تالیف کیا جس میں چھ کتابیں ہیں۔ کُتبِ مذکورہ کل ساڑھے تین برس کی پڑھائی ہے۔ اتنی ہی قلیل مدت میں نہایت آسانی سے بچے اُردو و فارسی (سب قسم کی عبارت کے ساتھ حتیٰ بالفعل جو دربار ایران میں محاورے رائج ہیں) و عربی ایک فاضل جیّد کی طرح سے لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اصُولِ فقہ اور فقہ میں بہ زبانِ عربی آپ کا رسالہ یومیہ علےٰ مذہب الامامیہ ایک سو صفحوں کا (جسکو آپ نے ایک دن میں تالیف کیا ہے) مشہور ہے۔ صُورۃ الجنان آپ کا مشہور و معروف ناول ہے۔ جسکو آپ نے ۱۸۷۴ء میں جبکہ اردو زبان میں ناول کا نام نہ تھا تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کیا۔ جسکی نسبت صاحب ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم نے یہ ریمارک کیا کہ اُردو زبان میں آج تک ایسی عُمدہ کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور مصنف کا ایک انڈین ... ہے وغیرہ وغیرہ۔ نظم میں جیسے آپ قادر الکلام اُستاد ہیں کچھ وُہی سخن سنج جانتے ہیں جنکو اتفاق آپ کے کل کلاموں کے سُننے کا ہوا ہے۔ آپ کی قادر الکلامی کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آپ کی مثنوی نوید ہند کی نسبت بہت سی تعریفوں کے ساتھ یہ کلمہ بھی تحریر کرکے چھپوا دیا کہ ایسی عُمدہ نظم اس پاکیزگی زبان اس استعارہ اور دیگر محامد کثیر کے ساتھ نظر سے نہیں گذری۔ حضرت آزاد لکھتے ہیں کہ مَیں نے چاہا کہ نثر میں انہیں خوبیوں کے ساتھ اسکے مضامین ادا کروں مگر نہ ہوسکا۔ یہ ریمارک مشیر قیصر اخبار لکھنو

وغیرہ میں چھپا ہے۔ اردو زبان کی شاعری کے اصل مذاق کی حد قائم کرنے میں آپ نے بیس سال تک کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ انگریزی و عربی و فارسی و بھاشا وغیرہ وغیرہ زبانوں کے انداز اور سب قسم کے مضامین کے تتبّع میں آپ نے اُردو میں کثرت سے شعر نظم کئے۔ شعروں کے باا‌ثر اور سلیس اور معنی خیز بنانے میں خدا جانے کتنا ریاض کیا۔ محاوروں کی چھان بین میں اسد اللہ خاں غالب مرحوم سے لیکر جناب اسیر و بحر و میر انیس و مرزا دبیر و میر مونس وغیرہ مشاہیر کملا سے برابر خط و کتابت رہی۔ چنانچہ آپ کے پاس اس کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہے۔ اشعار غزل کی معنی خیزی کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ جناب مفتی سید عباس صاحب مجتہد شمس نے آپ کی غزلوں پر یہ ریمارک تحریر کیا کہ بجائے اوراد و نصائح کے مساجد و [illegible] کے لائق ہیں (حالانکہ بظاہر کل اشعار سلیس اور پیرایہ مجاز میں ہیں) آپ کا کلیات قریب نوسے جزوں میں ہے۔ ان سب تصانیف کے ذخیرے کو چھوڑکر سب سے زیادہ حیرت انگیز و نتیجہ مشقّت و ریاضات شاقہ آپ کے تصنیف کئے ہوئے مولود اور مراثی ہیں یہ تو سب کو معلوم ہے کہ میر انیس نے مرثیہ کے طرز میں جو احاطہ دل پسند کھینچا ہے اُس سے تجاوز دشوار ہے۔ مگر آپ نے حال کے زمانہ کے خیال کے مطابق ساتھ ویسے ہی رزم و بزم وغیرہ کے عجب مفید و دلکش انداز اختیار کیا ہے کہ سُنکر انسان متحیر ہو جاتا ہے ۱۸۹۰ء میں آپ نے علیگڈھ مدرسۃ العلوم میں جو مسدّس مولود پڑھا تھا آج تک سننے والے اس سے محو نہیں۔ چنانچہ اسی صحبت میں مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر نے [illegible] ایسے عمدہ فلسفی مضامین اسلام کے بارہ میں نظم میں سُننے نہیں گئے۔ آپ کے مرثیوں میں باوجود کثرت مضامین رزم و بزم و رخصت و بَین وغیرہ وغیرہ کے خلافِ فطرت و خلافِ واقعاتِ تاریخی و روایاتِ صحیحہ و خلافِ صبر و استقلال و شانِ اہلِ بیت اطہار ایک حرف بھی نظم نہیں ہوتا۔ باینکہ کثرت ریاضت و دوام امراض نے آپ کو ضعیف کر دیا ہے لیکن ہزارہا آدمیوں کی مجلس میں جس شد و مد سے آپ تین تین گھنٹہ تک مجلسیں

پڑھتے ہیں۔ سننے اور دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جن سخن فہم سخن شناس بزرگوں نے سال گذشتہ اور اس سال کے محرم میں دسوں دن آپ کو سُنا اتّفاق سے اُن میں چند ایسے بھی بزرگ ہیں جنہوں نے اسی امام باڑہ میں برابر میر انیس مرحوم کو بھی سُنا ہے۔ اُن سب صاحبوں کا یہ بیان ہے کہ کسی طرح سے اور کسی حالت میں یہ مجلسیں میر انیس کی مجلسوں سے کم نہ تھیں۔ پُرانے حضرات تو اس سے کمال خوش ہیں کہ برخلافِ امید پھر ہندوستان میں خدا نے میر انیس کو پیدا کر دیا اور نئے ذی علم بزرگواروں کو اسکا فخر ہے کہ اوّل تو اُنہوں نے ایسے شخص کو سُن لیا جسکے بارہ میں پُرانے حضرات ہُوبہُو میر انیس کی مثال دیتے ہیں۔ دوم مرثیوں میں خاصکر جن چیزوں کی ضرورت تھی وُہ کل محاسن ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں نے معارف میں آپ کے مرثیہ کے بند ملاحظہ کئے ہیں اُنہیں سے پُوچھنا چاہئے کہ آپ کے مرثیوں کا کیا طرز ہے اور کیسے مضامین ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم بھی مخزن میں کبھی کبھی آپ کے مرثیوں کے بند چھاپنے کا وقتاً فوقتاً فخر حاصل کرینگے۔ بہت مشکل ہے کہ زمانہ اب ایسے باکمال قادر الکلام فخرِ روزگار کو قوم میں پیدا کر سکے۔ اکثر اہلِ علم اور زبان دانوں کا قول ہے۔ چُنانچہ جناب مولوی سیّد محمد خانصاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ نے جلسہ مسلم انسٹیٹوٹ کلکتہ میں اپنی تقریر میں یہ کلمہ فرمایا کہ جس شخص نے فی زمانا مولانا شاد کو نہیں سُنا اور آپ کے کمالات سے مطلع نہیں ہُوا اُسکو خود اپنے حال پر افسوس کرنا چاہئے۔ جناب میر خورشید علی صاحب مرحوم نفیس سے باکمال بزرگ نے آپ کی نسبت ایک مجلس میں یہ فرمایا کہ جس شخص نے اس باکمال کی زیارت کی اُسکو فخر و مباہات کرنا چاہئے۔ یہ بھی اُنہوں ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرات! جناب والد ماجد (یعنی میر انیس مغفور) سے کسی طرح آپ کی زبان کم نہیں ہے۔ بلکہ جناب والد ماجد کو مرثیوں میں ید طولےٰ تھا اور اُنکو ساتھ ایسے بے مثل مراثی کے قریب قریب کل اصنافِ نظم میں ید طولےٰ ہے۔ ایسے ایسے

فخرروزگار بزرگوں سے ایسی رائے حاصل کرنا نہایت نادر بات ہے۔ اور ہم مولٰنا شاد کو مبارک دیتے ہیں کہ انکو کاملوں سے دادِ سخن ملی ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ کبھی وہ پنجاب میں تشریف لاویں۔ اور اہلِ پنجاب اُنکا کلام اُن کی زبان سے سُنیں:۔

قطعۂ فارسی

چنیں وا پندم یکے از حکیماں — جہاں دیدۂ بخرد و پختہ رائے
سفرکردن از موطنت شاد اولے — نہ موطن بود بلکہ وحشت سرائے
چو اصطبل خر حملہ سوتش پُراز گل — بہ ہر کوچہ بنہادہ خروار لائے
حذر از سراشیب و از گو درِ اہش — اماں از غبارے کہ خیزد زجائے
سفالینہ پوشش است ہر خانۂ او — دکاکین نے بستِ اُو جان گزائے
نہ بارُوح ویرانہ ہا نو مقابر — نہ آبادیش را میسّر فضائے
ز بازار ہائے عفن مرگ خیزد — نشستہ بہر گوشہ ہائش وبائے
جوانے گرش اِشتہا زور آرد — کند قُرصِ خورشید را ناشتائے
اگر روبہ راہے نہد پیر از جا — جز آہے بہ دستش نہ آید عصائے
نہ زیبا نگارے کہ زاہد فریبد — نہ خلوت نشینے نہ صورت نمائے
ز اموات گنگائے او آب شوئی — ز فازورہ چہہ ہائے او شوربائے
نہ باغ مُعطرا نہ راغِ مُہنّا — نہ عیش مہیا کہ دارد بقائے
نہالانِ باغش گدایانِ مسکیں — نہ برسر کلاہے نہ در بر قبائے
نہ منّت گزارے نہ احساں شناسے — نہ شکرانہٴ نے بہ لب مرحبائے
زبان آوراں را بہ لب ہجو مردم — سخن سازہا را بہ دِل افترائے
نہ سنگ ہائے غوغا کنش را علاجے — نہ بہر نعیب کلاغش دوائے

نہ دیبا نشیمنے کسے زاہلِ دُنیا — نہ گسترده دریں طاہیے بوریائے
نہ نانِ کرم ہائے شاں را نصیبے — نہ خوانِ نعم ہائے شاں را صلائے
ز رُکّانِ او ہر یکے رو بہ راہے — نہ شہرے جہازیست نے ناخدائے
نہ کہسار و تالاب بہرِ تفرّج — نہ تازہ عمارت نہ کُہنہ بنائے
نہ دلّاک[۱] و قصّار و حمّام درّوے — نہ قنّاد و طبّاخ و نے نانوائے
نہ صدرِ اعظمے نہ مدار المہامے — نہ قیصر نہ ہز آنز و ویسرائے
نہیقے اگر سر زند از حمارے — جُز اَخسَنتَ اصلاً نہ خیزد صدائے
نہ راند کسے بر زباں جُز ملامت — بر آرد اگر عندلیبے نوائے
بگفتم بدو ہرچہ گفتی مُسَلَّم — نہ رانم بہ لب حرف چون و چرائے
حکایت ز من پُرس تا با تو گوئم — ازیں کُہنہ دیرو ز دیرینہ جائے
چو اُو پیرِ معمورہ کم بر آید — ز پارینہ دفتر بہ آرم گوائے
ہمانا سہ صد قرن عمرش سر آمد — بُود بانیِ اُو پتّن نام رائے
شکست از مہانند اُو خورد و برگشت — سکندر کہ بودست گیتی خدائے
زاہلِ مذاہب یکے بود دھا شد — کزیں شہر ما کرد نشو و نمائے
مُورّخ لکّ آرا بہ ہا دید اینجا — زلعلِ گراں ارز و بے غشّ طلائے
بہار ہست دار العلومِ ہنوداں — کہ نامے بر آوردہ در ابتدائے
دھنتر چکیمے ہست از بومیانش — کہ بیدک بر آوردہ از فکر و رائے
ازیناں یک ایجاد کردست شطرنج — کہ بشمرد فردوسیش از کیائے
زبیرسیت احوالِ ایں شہر برہم — کہ سالم نہ ماندست اُو را قوائے
بہ ضعفِ قوائیش چہ سازی ملامت — زپیرانِ فرتوت آخر حیائے
چہ رانم سخن از امیرانِ اینجا — کہ ہر کس گدائے است و حاجت روائے

[۱] [illegible] ۔۔۔ کو کہتے ہیں۔

تواضع ز اخلاقِ ہر کس ہویدا — تو گوئی کہ بنشستہ مسکین گدائے
نہ استادہ بیرِ غضب پیش روئے — نہ بنہادہ بر پشت خود متکائے
جفا پیشگی از لئیمان مسلّم — ولے از کریماں نہ بینی دغائے
ز گنگا چہ رانی سخن پیش رویم — گرہ بستہ در موج ہائش شفائے
کند رومی از شستنش زنگیاں را — عجب آب پاکیزہ باصفائے
غبارِ رہ و گل زمیں ہائے موطن — بہ چشمِ حقیقت بود توتیائے
چہ دُر ہا کزیں خاک بیروں نہ آمد — چو تحقیق[۵۱] و چوں بیدلِ[۵۲] نکتہ رائے
چو راسخ[۵۳] در اُردو زباں شیخ وقتے — چو فریاد[۵۴] روشن دل و رہ نمائے
چو شادِ ہنر سنج کامل عیارے — سخن دانِ دانش ور و خوش نوائے
صفاہان و شیراز در خانہ اش ہیں — بہ چشمِ حقیقت بکش توتیائے
عدالت شعارا جہاں سرفرازا — در اُردو رسید است کارش بجائے
ز خیلِ تلامیذِ خود ہر یکے را — عطا کردہ است از فصاحت لوائے
بیا مدرسہ[۵۵] سیف خاں را نظر کن — مصفّا تر از سینۂ پارسائے
عجب سبزہ زارے لبِ گنگ دلکش — عجب مسجد و گنبدِ عرش سائے
ز منگلس تالاب از من چہ پرسی — بود گلبنِ باغ او غم زدائے
اگر خانہ[۵۶] گرد بینی بگوئی — نہادست قدرت برا ضے سمائے
ازیں خوبیِ موطنم نیز بگزر — بپا ہست زنجیرِ شرم و حیائے
غذا زندگی آورد آدمی را — ولے ناگوار است بے اشتہائے ۲

۵۱ ملا علی تحقیق تخلص مسلی ورد یحان نہابت جنگ مشہور صوبہ دار کے زمانہ میں ایک باکمال شاعر عظیم آباد میں تھے۔ ۵۲ عبدالقادر بیدل مشہور باکمال شاعر پٹنہ ہی کے تھے ۵۳ شیخ غلام علی راسخ خاص عظیم آباد کے رہنے والے۔ ۵۴ جناب سید شاہ الفت حسین فریاد تخلص مصنف کے استاد پٹنہ ہی کے بےمثل و بےنظیر شاعر تھے۔ ۵۵ مدرسہ سیف خاں پٹنہ میں مشہور جگہ ہے اور منگلس تالاب بھی مشہور سیرگاہ ہے۔ ۵۶ خانہ گرد گول ظہور الامکان ہے ۱۲

طلب تا نہ سازند از جامہ خیزم — کہ ہر جاست با من ہمیں یک خدائے
نہ نامم بتولیت سر تاجِ عالم — نہ بابم امیریت کشور کشائے
نہ من گلبنِ باغ شاہِ شہیدم — نہ من رستم از شاخ زین العبائے

نہ خواہم کہ مردم بگویند آمد
بہ دیلوندگی شاعرِ بے نوائے

دو تصویریں

جو آج زینتِ ورقِ اوّل ہیں ہمارے اُن کرمفرمائے مضمون نگاروں کی ہیں جن کے کلام اور مضامین سے اوراقِ مخزن بارہا فخر حاصل کر چکے ہیں۔ ایک تصویر حافظ سید فضل حـ صاحب آزاد رئیسِ عظیم آباد کی ہے۔ ناظرینِ مخزن آپ کے کلام سے اکثر مستفیض ہو ہیں اور آپ کے نام سے اسقدر آشنا ہیں کہ زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ دوسری تصویر جناب میرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منٹگمری کی ہے۔ آپ اعلےٰ خاندان کا "پنجاب چیفس" میں خصوصیّت سے ذکر ہے۔ فلسفیانہ مضامین کے لکھنے شہرت آپ نے حاصل کی ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ آپ کی عالمانہ قابلیت اور قوتِ استد مسلّم ہے۔ فنِ زراعت میں آپ کو خاص دستگاہ ہے۔ باوجود اپنے فرائضِ منصبی ادائیگی کے مضامین نگاری آپ کا خاص مشغلہ ہے۔ کئی ایک اخلاقی کتابیں آپ نے تصنیف بھی فرمائی ہیں ✣

طہران[1]

ہمارے لطف فرمائے منشی ظفر علیخاں صاحب بی۔ اے نے ہز اکسیلنسی لارڈ کرزن صاحب بہادر بالقابہٗ کی بے نظیر کتاب "پرشیا" کا ترجمہ "خیابانِ فارس" میں سے ایک مضمون اقتباس کرکے ارسال فرمایا ہے جسکو ہم خوشی سے درج کرتے ہیں۔ اُمید کہ ناظرینِ مخزن کے لئے یہ مضمون باعثِ دلچسپی ہوگا۔

انجام کار چڑھ گیا مَیں اُس پہاڑ پر   پہلو پہ جس کے چار ہا اک برف زار تھا
نکلا نہ تھا قمر ابھی اُس برج سے جہاں   آغوشِ آسمان میں سرِ کوہسار تھا
پھیلا ہُوا پہاڑ کے دامن میں دُور تک   میدان و شہر و کوکبۂ شہریار تھا

(شیل)

ایک قدیم اور جدید شہر ایران کے موجودہ پایۂ تخت طہران کا ذکر کرتے وقت سیاحوں نے بسا اوقات کسی قدر حقارت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ شہر جدید ہے۔ جن معنوں میں ان مورخین نے لفظِ جدید کا استعمال کیا ہے (یعنی تاریخی معنوں میں)، اُن کے لحاظ سے

[1] ہم حسبِ سابق کی طرح میں اس باب میں تصانیف متعلقہ طہران کا حوالہ نہیں دیتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ غیر ممالک کے قریب قریب تمام جنہوں نے ایران کا سفر کیا ہے پایۂ تخت میں آکر ٹھہرے اور اپنے زمانۂ قیام کے حالات بالتفصیل بیان کیے لہٰذا ناظرین کو مزید اطلاع کی ضرورت ہو تو اُس ضخیم فہرستِ کتب کو دیکھیں جسے میں عنقریب شائع کرنے والا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ ایران کے دوسرے پایۂ تختوں کے مقابلہ میں طہران کے حالات مورخین نے بہت کم قلمبند کئے ہیں اور جو اطلاع اس باب میں مندرج ہے اس کا بیشتر حصہ کسی دوسری کتاب میں نہ ملیگا۔ اس مقام پر یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ طہران کی علم وجہ تسمیہ جس کے رُو سے اس کو طہارت کے مصدر سے مشتق سمجھا جاتا ہے غلط ہے۔ طہران ایک قدیم فارسی لفظ ہے جو اوّل اوّل ت سے لکھا جاتا تھا اور اُس کی ابتدائی شکل تہروں اور تہران بھی تھی جو رفتہ رفتہ بدل کر طہران ہو گئی۔

یہ شہر کسی طرح جدید نہیں ہوسکتا بلکہ قدیم ہے۔ البتہ دُوسرے معنوں یعنی عمارتی مفہوم میں اس کو جدید کہا جاسکتا ہے۔ ایک صدی کا عرصہ ہوتا ہے کہ آغا محمد شاہ نے اس کی تجدید کی اور اس کے بعد اُس کے بھتیجے اور جانشین فتح علی شاہ نے بھی بہت کچھ ترمیم اور تبدیل کی۔ اور گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں تو طہران کا عمارتی نقشہ اس قدر بدل گیا ہے کہ اُنیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا وُہ اگر اب آکر دیکھیں تو پہچان بھی نہ سکیں۔ اس دوگونہ تجدید کے واقعات پر نظر ڈالنے سے پہلے ہم زمانہ گذشتہ کے قدیم الوضع اور فراموش شدہ (مگر بااین ہمہ شانِ دلچسپی لئے ہُوئے) طہران کے کچھ حالات سپرد قلم کرنا چاہتا ہوں۔

عہدِ سلف کی شہادت بعض لوگوں کا یہ قیاس ہے کہ طہران اور طازورا جو نقشۂ مرتبۂ شہنشاہ تھیوڈوسیس میں رے کے قریب دکھلایا گیا ہے۔ دراصل ایک ہیں۔ لیکن نقشۂ مذکور میں جس رے کا ذکر ہے وُہ خطۂ میڈیا کا مشہور شہر رے نہیں بلکہ اسی نام کا ایک اور مقام ہے جو یزد کے قریب واقع ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ طہران اور طازورا ایک نہیں ہوسکتے۔ بہرحال طہران کی ابتدا خواہ کچھ بھی ہو اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک عرصہ دراز تک یہ ایک چھوٹا سا غیر معروف مقام رہا ہوگا کیونکہ الاصطخری اور مسعودی جیسے اُن تمک جغرافیہ نگاروں نے جن کی سیاحی دسویں صدی پر روشنی ڈالتی ہے طہران کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ پاس کے مقام رے کے بہت کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ طہران کا قدیم ترین حوالہ جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ ابو عبداللہ یاقوت کے سفرنامہ مرقومہ سنہ ۱۲۲۹ء میں درج ہے۔ طہران کے جو حالات اُس کے سفرنامہ میں مندرج ہیں اور جن کی تصدیق متعدد ایرانی مورخین[۱] نے کی ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اہلِ ایران وحشی تھے جو زمین دوز مکانوں میں رہتے تھے اور اپنی ہمسایہ قوموں سے لڑنے بھڑنے اور فرمانرواؤں کے وقت کے

---

[۱] ان مورخین کے ناموں کی فہرست ایک یادداشت میں مندرج ہے جو موسیو لینگلے نے اپنے اہتمام سے مرتب کئے ہُوئے سفرنامہ چارڈن کی آٹھویں جلد کے صفحہ ۱۴۲ پر دی ہے۔ ۱۲

خلاف بغاوتیں کرتے رہنے میں اپنا وقت گذارتے تھے۔ بہرحال طہران اپنی ندیوں اور باغوں کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گیا اور ایک چھوٹی سی بستی سے ایک متوسط درجہ کے پُر رونق اور آباد شہر کی شکل میں بدل گیا۔ چودھویں صدی میں حمداللہ اس کا ذکر کرتے ہُوئے کہتا ہے کہ یہ ایک وسیع اور باوقعت شہر ہے اور آب وہوا کی لطافت اور آبرسانی کی افراط کے لحاظ سے رَے پر ترجیح رکھتا ہے۔ ڈاں رائی ڈی کلاویجو سفیر ہسپانیہ متعینہ دربار تیمور ۸۔ جولائی سنہ ۱۴۰۴ء کو یہاں قیام کر کے حسب ذیل رائے دیتا ہے جس میں مدح وذم کے دونوں پہلو موجود ہیں[۵]:۔

"طہران ایک بہت بڑا شہر ہے لیکن اس کے گرد فصیل نہیں اور ایک نہایت دلکشا مقام ہے جس میں سب طرح کی چیزیں موجود ہیں لیکن باشندوں کے قول کے مطابق یہاں کی آب وہوا اچھی نہیں اور بخار اکثر پھیلا رہتا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ خاندان صفویہ کے دوسرے فرمانروا شاہ طہماسپ نے سب سے اوّل طہران کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ لیکن شاہ عباس اعظم نے جو کثرتِ میوہ خوری کے باعث یہاں بیمار پڑ گیا تھا قسم کھالی کہ اب سے اس شہر میں کبھی داخل نہ ہوںگا۔ چنانچہ شاہ موصوف نے صوبہ وشہر طہران کی حکومت ایک خان کے تفویض کر دی۔

طہران کی حالت شاہ عباس کے زمانہ میں

شاہ عباس اعظم کے زمانہ میں کئی یورپین وارد طہران ہُوئے۔ ان میں سے پٹرو ڈیلاویلی اطالوی (سنہ ۱۶۱۸ء) اور سرٹامس ہربرٹ برطانوی (سنہ ۱۶۲۷ء) کے بیان کردہ حالات ایسے عجیب وغریب ہیں کہ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے میں اس مقام پر اُن میں سے کسی قدر اقتباس کرتا ہُوں۔ اوّل الذکر کی حسب ذیل رائے قابل توجہ

[۵] ملاحظہ ہو "نیریٹو آف ایمبیسی" (داستان سفارت) مرتبہ ہقلوط سوسائٹی صفحہ ۹۸۔ والٹس اپنی "ہسٹری آف پرشیا" (تاریخ ایران) کے صفحہ ۹۲ پر لکھتا ہے کہ ڈیلاویلی پہلا یورپین تھا جس نے طہران کا سفر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھتے وقت والٹس کو کلاویجو کا علم نہ تھا۔

سے ماخوذ ہے جو سفر نامہ پنکرٹن میں مندرج ہے :-

"طہران ایک بڑا شہر ہے اور وسعت میں کاشان سے زیادہ ہے۔ لیکن آباد کم ہے اور مکانات بھی اس میں تھوڑے ہیں۔ باغ بہت بڑے بڑے ہیں جن میں انواع واقسام کے میوے بہ افراط پیدا ہوتے ہیں۔ یہ میوے ایسے خوش ذائقہ ہوتے ہیں کہ قرب جوار کے علاقہ کے لوگ انکو ذوق وشوق سے منگواتے ہیں۔ خان بالعموم یہیں رہتا ہے تمام کوچوں اور سڑکوں میں متعدد نہریں گذرتی ہیں جو باغوں میں پیچ کھاتی ہوئی بہتی ہیں اور انکی شادابی وزرخیزی کا باعث بنتی ہیں۔ کوچوں اور سڑکوں پر اونچے اونچے شاندار درخت جنہیں ایران میں چنار کہتے ہیں سایہ افگن ہیں اور ان میں سے بعض درخت اسقدر موٹے ہیں کہ اُن کے تنے کو آغوش میں لینے کے لئے دو بلکہ تین آدمیوں کو اپنے ہاتھ پھیلانے پڑیں گے۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں اور نہ ایک بھی ایسی عمارت ہے جو قابلِ لحاظ ہو"۔

بطانوی سیاح جس کے جذبات کی حرارت کو ماہرویان طہران کی گرمی حسن سے تحریک پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ تر خوش طبعی کی راہ سے حسب ذیل بیان کرتا ہے:-

"ٹاٹرون (طہران) ایک وسیع میدان کے وسط میں واقع ہے۔ مکان کچی اینٹوں کے ہیں۔ شہر میں تین ہزار گھر ہونگے۔ جن میں سے ڈیوک اور بزر کے مکانات خوشنما ترین ہیں لیکن تعریف کا مستحق دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ بانلہ دو حصوں میں منقسم ہے

ے اس کتاب کی جلد اول میں ایک مقام پر بتا دیا گیا ہے کہ یہ سیاح (سر ٹامس ہربرٹ) فارسی ناموں کو انگریزی قالب میں لاکر انکی شکل ایسی بدل دیتا ہے کہ پہچانے نہیں جاتے۔ مثلاً طہران کو ٹاٹرون اور شاہ کو پاٹشا اور شاہ طہماسپ کو شاٹامس لکھتا ہے۔ ڈیوک اور بزر بھی اسی طرح کے بگاڑے ہوئے لفظ معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ڈیوک سے اس کی مراد کسی امیر سے ہو کیونکہ انگریزی لفظ ڈیوک امیر الامرا کا ہم معنی ہے لیکن بزر پر یہ گمان نہیں ہوسکتا۔ یہ خود کسی فارسی لفظ (شاید بازار) کی خرابی ہے۔ مترجم ۱۲

اور کہیں سے چھپا ہوا اور کہیں سے کھلا ہے۔ ایک نہر دو شاخوں میں منقسم ہو کر شہر کے اندر بہتی ہوئی درختوں اور باغوں کو سینچتی ہے جو اس عطیۂ عظمیٰ کے معترف ہو کر شکر کے ساتھ باغبان کی خدمت میں نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ شہر کے مرد شاندار ہیں اور عورتیں صاحبِ جمال۔ اور دونوں میں کوئی نہ کوئی نرالی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لیکن مردوں کی بدگمانیاں عورتوں کو دائرۂ ضبط سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتیں۔ با ایں ہمہ ان خاتونانِ پری جمال کا جلاپن جو ایک ذراسی جھلک دکھاجاتا ہے تو آنکھوں میں بجلی سی کوندجاتی ہے[۵۱]۔

زمانۂ مابعد کے انقلابات

دورِ آخر کے فرمانروایانِ صفوی کے عہد میں طہران کو بعض دفعہ پایۂ تخت بننے کی عزت حاصل ہوئی۔ شاہ سلیمان نے یہاں ایک محل بنایا اور دولتِ عثمانیہ کے سفیر کو شاہ سلطان حسین کے حضور میں یہیں باریابی ہوئی۔ ٹیورنیر ضمناً طہران کا ذکر کرتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اپنی آنکھوں اُس نے اسکو نہیں دیکھا۔ جارڈن اسے صرف ایک چھوٹی سی بستی بتاتا ہے۔ افغانوں نے اپنے حملۂ ایران کے وقت اسکو مسخر اور غارت کیا۔ لیکن ہینوے اپنے سفرنامہ میں اس کا نام (طیہیران) اُن منزلوں میں درج کرتا ہے جنہیں وان میراپ نے سنہ ۱۷۳۰ء[۵۲] میں مشہد تک طے کیا۔ طہران ہی میں نادر نے ہندوستان کی مہم سے واپس آکر تمام علما اور پیشوایانِ دین کی ایک مذہبی مجلس اس غرض سے منعقد کی تھی کہ ایک نئے قومی مذہب کی اشاعت کیجائے۔ یہیں اُس نے اپنے بیٹے رضا قلی خاں کی آنکھیں نکلوا ڈالیں اور اسی مقام پر وہ بیچارہ آخرکار قتل کرڈالا گیا[۵۳]۔ کریم خاں زند نے

[۵۱] مسز ایرس ٹریول "(چند سال کا سفر) طبع سوم صفحہ ۲۰۶۔

[۵۲] "ہسٹاریکل اکاؤنٹ" (حالات تاریخی) صفحات ۲۵۷ لغایت ۲۵۹۔ "طیہیران ایک شہر ہے جس کے گرد گارے کی فصیل ہے۔ اس فصیل میں جابجا گول بُرج بنے ہوئے ہیں لیکن بہت بوسیدہ ہوگئی ہے۔ یہاں ہم کو سامانِ رسد بافراط ملا اور روٹی تو نہایت ہی مزہ کی تھی۔"

[۵۳] جے۔ اے۔ آلیویہ "وائج" (سفرنامہ) جلد پنجم صفحہ ۲۱۸ و جلد ششم صفحہ ۳۰۔

موجودہ قلعہ کی عمارت میں اضافہ اور ترمیم کی - لیکن قلعہ میں زیادہ نہیں رہا - علی مراد خاں جب مازندران پر حملہ آور ہوا تو چند دنیں یہاں اُس نے مقام کیا تھا - اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر جب خاندانِ قاچار سریر آرائے ایران ہوا تو طہران کی سیاسی عظمت کا پہلا دور شروع ہوا -

آغا محمد شاہ طہران کو اپنا پایۂ تخت بناتا ہے

خاندانِ قاچار کا مولد و منشا اور دارالحکومت استر آباد تھا - لیکن تخت و تاج کے نئے دعویدار آغا محمد شاہ کی روز افزوں اُمیدوں اور آرزوؤں کے مقابلہ میں یہ شہر مرکزِ دولت سے بہت ہٹا ہوا تھا اور بعید ترین مشرقی گوشہ میں واقع تھا - کچھ عرصہ کے لئے جب تک کہ اُسے اپنی قوّت کی طرف سے اطمینان نہ تھا اور اُسکی حکومت عملی لحاظ سے صرف مازندران تک محدود تھی - اس نے مقام ساری میں بود و باش اختیار کی - لیکن جب اُس کی آرزوؤں کی نگاہ جنوب کی طرف پڑی اور ایران کی بادشاہت کا خواب محسوس شکل پکڑتا ہوا دکھائی دیا تو اُس کو ایک ایسے پایۂ تخت کی ضرورت محسوس ہوئی جس تک آسانی سے رسائی ہو سکے - چنانچہ اس مطلب کے لئے اس نے طہران کو پسند کیا جس کے پایۂ تخت قرار دیئے جانے کی تاریخ عام طور سے ۱۷۸۶ء شمار کیجاتی ہے - تخت کے دوسرے دعویداروں کا استیصال کہیں سات سال کے بعد جاکر ہوا - اور اس وقت آغا محمد شاہ کی حکومت کو استحکام حاصل ہوا - مگر جس شہر کو شاید بنظرِ ضرورت پایۂ تخت بنایا گیا تھا - اُسی کے نام اقتضائے احتیاط کی طرف سے بھی قرعۂ انتخاب پڑا - جنوب میں بغاوت بالکل فرو کر دی گئی تھی - اور کچھ عرصہ کے لئے افغانوں کی قوت ٹوٹ گئی تھی اور ان کی طرف سے مخالفت کا اظہار موقوف ہو گیا تھا - برخلاف اس کے غاصبِ تخت و تاج طہران سے بآسانی اپنی آبائی جاگیر اور اپنے قبیلہ کے لوگوں میں پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے اپنے اُس ایک ہی دشمن یعنی روس پر جس کی طرف سے اسکو حقیقت میں خوف تھا نظر رکھ سکتا تھا - انہیں خیالات نے جنکو موجودہ (انیسویں) صدی کے واقعات نے اور زیادہ تحریک پہنچائی

بنہ آغا محمد خاں کے جانشینوں کو اُس کے فیصلہ پر صاد کرنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اور طہران کے موقعہ کے خلاف میں خواہ کیسی ہی دلیلیں کیوں نہ پیش کیجائیں۔ لیکن احتمال قوی ہے کہ جب تک دولتِ ایران کا شیرازہ نہ بکھرے گا اُس وقت تک طہران برابر اُسکا پایۂ تخت رہیگا +

ظفر علی خان

بورڈ آف اگزامینرز

کلکتہ کے فاضل اور معزز سکرٹری جناب کرنیل رینکنگ صاحب نے مخزن کی نہایت عزت افزائی فرمائی ہے۔ انہیں وہ مضامین جو ان اوراق میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسقدر پسند آئے ہیں کہ اُنہوں نے اُن کا ایک مختصر سا انتخاب اپنے صیغے کے اعلیٰ "امتحانِ اُردو پروفیشنسی" کے لئے نصاب مقرر فرمانا تجویز کیا ہے۔ بورڈ موصوف کے چیف مولوی صاحب نے ہمیں کرنیل صاحب بہادر کی اس عنایت کی اطلاع دی ہے۔ اور مضامین کے چھاپنے کی اجازت طلب کی ہے۔ ہم نے بخوشی اجازت دی ہے اور ہم مضامینِ مخزن کا ایسے مفید مطلب کے لئے نصاب قرار پانا باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ گو یہ پہلا موقعہ نہیں۔ کہ افسرانِ محکمۂ تعلیم کیطرف سے ایسی قدرشناسی اس رسالہ کی ہوئی ہے۔ اس سے قبل جناب مولوی شریف حسین صاحب بی۔ اے (مرحوم) نے قریب دو سال ہوئے۔ ہمیں اطلاع دی تھی کہ انہیں بحیثیت ہیڈ ماسٹر نارمل سکول لکھنؤ۔ صوبجات متحدہ کے محکمۂ تعلیم کے لئے نیا نصاب "اُردو" تیار کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہے اور وہ بعض مضامین مخزن میں سے لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں بھی بخوشی اجازت دی تھی۔ معلوم نہیں وُہ انتقال سے قبل اپنے نصاب کو مکمل کر سکے یا نہیں۔ بہر حال یہ قدرشناسیاں قابلِ ذکر ہیں۔ کیونکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقوں میں مخزن کی نسبت کیسی رائے ہے +

حکیم گلیلیو

اگرچہ گلیلیو کی سربرآوردہ ایجادوں کا ورثہ علم طبیعات کے ماہروں کو پہنچا ہو- اور اسکی قوائے عقلی کی نشوونما کے متعلق معلومات منطقیوں اور فلسفیوں کے حصہ میں آئی ہو- لیکن حکیم موصوف کی پُر از واقعات زندگی کی کامیابیوں اور مایوسیوں کے ایک طویل سلسلہ سے تو ایک معمولی شخص کو بھی دلچسپی ہوسکتی ہے - جہاں گلیلیو ایک طرف اپنی عالمانہ تحقیقاتوں کی وجہ سے دوستوں کی آنکھوں کا چراغ اور صاحبان دیہیم وتخت کا جلیس ومصاحب تھا- وہاں دوسری طرف اپنی روشنی طبع کی وجہ سے مذہبی پیشواؤں - اور چند معززین حضرات کے تیر ملامت کا آماجگاہ رہا- جنکی مخالفت کی وجہ سے اپنی عمر کا آخری حصہ اسکو بندی خانہ کی چاردیواری میں بسر کرنا پڑا- لیکن یہ مصائب وآرام کے دن گو مقابلتاً عجیب معلوم ہوں کوئی متنفس بھی ایسا نہ پاؤگے- کہ خواہ وہ مطلق العنان تاجدار ہو یا صلح جو اور امن پسند حکیم جسکی زندگی میں انکا ایک خاص تناسب موجود نہ ہو-

گلیلیو بمقام پیسا ۱۵- فروری ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا تھا- اور اپنے تین بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے بڑا تھا- اس کا باپ ون سنز گلیلیو خود بھی ایک بزرگ پایہ حکیم تھا- چنانچہ موسیقی پر چند مشہور رسالے اس کی تصنیفات سے اب تک موجود ہیں-

گلیلیو کی زندگی کا ابتدائی حصہ دیگر علمی حکماء کی طرح کلوں کے پُرزوں اور اوزاروں کی ساخت میں صرف ہوا جسنے وہ اپنا اور اپنی ہم جولیوں کا دل بہلایا کرتا تھا- لیکن یہ مشاغل اس کی دماغی ترقی میں حارج نہیں ہوئے- اور گو اس کا باپ غریب آدمی تھا- پھر بھی گلیلیو کو اس زمانہ کی مروجہ تعلیم پورے طور پر دلائی گئی تھی-

فرصت کے وقت وُہ نقاشی اور مصوری موسیقی سے دل بہلایا کرتا اور اوّل الذکر میں اس قدر ملکہ بہم پہنچا لیا تھا۔ کہ اُس کے ہاتھ کی تصویروں کی اُستادانِ فن تعریف کرتے تھے۔ آلاتِ موسیقی میں وُہ بانسلی خوب بجاتا تھا۔ ابتدا میں گلیلیو کا ارادہ مصوری کو بطور ایک پیشہ کے اختیار کرنے کا ہو گیا تھا۔ لیکن باپ اور دیگر احباب کی صلاح یہ قرار پائی۔ کہ وہ علم طب پڑھے۔ چنانچہ وہ۔ نومبر ۱۵۸۱ء کو دارالعلوم پیسا میں داخل ہو گیا۔ موسیقی اور نقاشی کے اصول سمجھنے کے لیے اسکو اقلیدس دیکھنی پڑی۔ اور اسی طرح ریاضی سے ایسی رغبت پیدا ہو گئی۔ کہ طب سے دِل اُچاٹ ہونے لگا۔ ریاضی کے ابتدائی رسالے دیکھنے کے بعد گلیلیو نے آرکی میڈیز کی تصنیفات کی طرف توجہ کی اور جن دنوں وُہ سارا کوزکی فلاسفر کے رسالہ کو جو اُس نے اِسی سائنس پر لکھا تھا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس نے خود بھی اس پر ایک بسیط مضمون جس میں آلہ ہائیڈراسٹیٹیکل بیلنس کی ساخت بتا کر یہ دکھایا ہے۔ کہ ہیرو نام بادشاہ کے تاج میں جو سُنار نے کھوٹ ملایا تھا۔ اسکو آرکی مائی ڈیز نے کس طرح معلوم کیا۔ بہت شہرت حاصل کی۔ چنانچہ کارڈینل ڈی مونٹی کے توسّل سے جب ٹسکنی کی ڈیوک کو اس نوجوان حکیم کی لیاقت معلوم ہوئی۔ تو اس نے دارالعلوم پیسا میں گلیلیو کو ۱۵۸۹ء میں ریاضی کا معلم مقرر کر دیا۔ مایحتاج کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا تو گلیلیو نے فلسفہ کی طرف توجہ کی۔ طالبعلمی کے زمانہ سے ہی اسکو ارسطو کے فلسفہ میں نقص سوجھنے لگے تھے۔ اسکی ابتدائی تحقیقاتوں نے اس خیال کو اور بھی پختہ کر دیا۔ اور ایسا ارسطو کے جرثقیل کے اصولوں کو اس نے تجربہ کی کسوٹی پر رکھکر پرکھنا شروع کیا۔ بہت سی غلطیاں نکلنے لگیں۔ اور گلیلیو جو ارسطو کی حکمت کو اپنا جائز شکار سمجھے ہوئے تھا۔ اِس غیر معمولی کامیابی سے ایسا آپے سے باہر ہوا۔ کہ نہایت جوش سے اپنے شاگردوں کے سامنے ارسطو کی فلسفہ کی دھجیاں اُڑایا کرتا۔ اُدھر ارسطو کے شاگردوں نے بھی اپنے اُستاد کی طرفداری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا اور تھوڑے ہی سے عرصہ میں

گلیلیو کے ایسے زبردست دشمن چاروں طرف سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ عمر بھر ان کے زغہ سے نہ نکل سکا۔ ارسطو کے علم جرِ ثقیل کا ایک مسئلہ ہے۔ کہ اگر دو مختلف اجسام کو ایک ساتھ کچھ فاصلہ پر سے زمین کی جانب چھوڑ دیا جائے۔ تو بھاری جسم زمین پر پہلے گریگا۔

گلیلیو نے اس اصُول کی مخالفت کی اور جب دلائل لانے میں قاصر رہا تو تجربہ کر کے ثابت کرنا چاہا کہ تمام اجسام کو کسی مقرر بلندی پر سے ایک جیسی تیزی کے ساتھ گرنا چاہئے بشرطیکہ ہوا کی روک اُن پر مختلف طور پر اثر کر کے اُنکی رفتار میں کمی بیشی نہ پیدا کر دے۔ چنانچہ تجربہ کر کے اس نے اپنے دعوے کو ثابت بھی کر دیا۔ لیکن ارسطو کے شاگرد پھر بھی قائل نہ ہوئے۔

ان مباحثوں سے عداوت کی آگ زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اور گلیلیو کو پیسا چھوڑنا پڑا۔ حُسن اتفاق سے انہی دنوں میں دار العلوم پیڈوا میں ریاضی کی مدرسی خالی ہوئی۔ جو ۱۵۹۲ء میں ۶ برس کے لئے گلیلیو کو ملگئی۔

ابھی یہ آسامی ملی بھی نہ تھی۔ کہ گلیلیو کے باپ کی وفات ہو گئی۔ اور تمام کنبہ کا خرچ اس پر آ پڑا۔ فرصت کے اوقات میں وُہ اپنا پرانا شوق بھی نبھاتا اور آمدنی بڑھانے کے لئے بنج کے طور پر لڑکوں کو پڑھاتا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دنوں میں گلیلیو کا پرنیکس کے نظام کا قائل ہو گیا تھا۔ ۱۵۹۷ء میں اُس نے کیپلر کو ایک خط لکھا جس میں کہتا ہے۔ کہ میں نے کئی سال سے کاپرنیکس کے اصُولوں کو مان لیا ہے۔ لیکن ابھی اُن کے حق میں یا مخالفین کی تکذیب میں کہنے کی جُرأت نہیں کر سکتا ہُوں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۹۳ء اور ۱۵۹۷ء کے درمیان کسی وقت وُہ محولہ بالا فلسفہ کا طرفدار رہا ہو گا۔ اب گلیلیو کی شہرت تمام یورپ میں پھیل گئی۔ نواب اور شہزادے لکچر سُننے کے لئے آتے اور اُس کی شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ ۶ سال کا معہُودہ عرصہ گذرنے کے بعد گلیلیو کے عہدے کی میعاد ۶ سال کے لیے اور تجدید کر دی گئی اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہُوا۔ ۱۶۰۱ء میں میعاد

پھر بڑھا دی گئی۔ اور ۲۰۰ فلارنز مشاہرہ مقرر کیا گیا۔

ان دنوں شہرت کا یہ عالم تھا۔ کہ سامعین کی کثرت کی وجہ سے جب مدرسہ طبیہ میں جہاں ۱۰۰۰ آدمیوں کے لئے جگہ کا انتظام ہو سکتا تھا۔ گنجایش نہ رہی تو میدان میں لکچر دینے شروع کئے۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ کہ گلیلیو کا سب سے پہلا مربی گرینڈ ڈیوک آف ٹسکن تھا۔ اور گو پیڈوا میں آنے کی بعد ملازمت کا تعلق اس خاندان سے نہ رہا تھا۔ پھر بھی وُہ تعطیلوں میں ہمیشہ فلارنز جاتا۔ اور ڈیوک کے خاندان کے لڑکوں کو ریاضی کی تعلیم دیا کرتا۔ ڈیوک کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا کاسمو جو گلیلیو کا شاگرد تھا۔ تخت پر بیٹھا تو اُن سے اپنے اُستاد کو پھر دارالعلوم پیسا میں واپس بلا لیا اور ۵۲۰ فلارنز کے بجائے۔ اسی قدر کرا ون مشاہرہ قرار پایا۔ سال بھر میں صرف ۶۰ دفعہ نصف نصف گھنٹہ کے لئے لکچر دینا پڑتا۔ گلیلیو کی خاص درخواست پر اب اس کا لقب پروفیسر ریاضی و فلسفہ قرار پایا۔ اسکی تصنیفات میں سے ۲ رسالے نظام عالم پر ۳ حرکت پر۔ ۲ جر ثقیل پر اور کئی ایک چھوٹے بڑے مضمون۔ آواز۔ گفتگو۔ روشنی۔ رنگ۔ فن جنگ وغیرہ۔ پر ان ہی دنوں کے لکھے ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۶۰۹ء میں گلیلیو ایک دوست سے ملنے وینس گیا۔ یہاں اسے معلوم ہوا۔ کہ ایک شخص مسمی جان لیبرشی متوطن ڈنمارک نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے دُور کی چیزیں پاس نظر آتی ہیں۔ پیڈوا سے واپسی پر اس نے بھی سوچنا شروع کیا۔ کہ وُہ آلہ کس اصول پر بنا ہوگا۔ آخر انو کاس کے اصول کے بنا پر گلیلیو نے بھی ایک آلہ تیار کیا۔ جس میں ہر شے اصلی شکل سے ۳ گنا بڑی معلوم ہوتی تھی۔ یہ عجیب طلسمی شیشہ کا بڑا چرچا ہوا۔ لوگ جوق جوق اس تماشہ کو دیکھنے آیا کرتے۔ اب جو گلیلیو کو اصول معلوم ہو گیا تو اس نے زیادہ دوربین شیشوں سے تجربہ شروع کیا۔ یہانتک کہ ایک ایسا آلہ تیار کر لیا جس میں ایک چیز کو ۳۲ گنا بڑھا کر دکھانیکی طاقت تھی۔ اس دُوربین سے اس نے اجرام سماوی کا مشاہدہ شروع کیا۔ اور بہت سی نئی باتیں معلوم کیں۔ گو یہ مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہ تھا لیکن گلیلیو کی بعد کی تحقیقاتوں کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

فیض الحسن (۰)

کانِ نمک

مدت سے سُنا کرتے تھے۔ "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد"۔ مگر ہم نے تو ایک دفعہ جا کے دیکھا۔ نمک ہو جانا تو در کنار۔ ہم تو نمکین بھی ہو کر نہ نکلے۔ اور کچھ نہیں تو ملیحوں میں تو شمار ہو جاتا۔ شاید یہ اُس زمانہ کا ذکر ہوگا۔ جب کانِ نمک کھیوڑے والی کان کی طرح ایک باقاعدہ چیز نہ ہوتی ہوگی۔ جس کے اندر سڑکیں ہوں اور راستے ہوں۔ جس میں آدمی جا بھی سکے اور صحیح سلامت آ بھی سکے۔ جس میں داخل ہوتے وقت مشعل اور رہنما میسر ہو جائے اور جسے خوب دیکھ بھال کر تماشائی ڈیڑھ دو گھنٹے میں باہر بھی نکل آئے۔ کھیوڑا ضلع جہلم علاقہ پنجاب میں ایک مشہور مقام ہے۔ کیونکہ شمالی ہندوستان میں نمک کا بیشتر حصہ اسی مقام سے جاتا ہے۔ پنڈ دادن خاں ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں اُتر پڑے۔ تو آگے صرف اڑھائی میل کا فاصلہ ہے۔ گرد و نواح میں کوئی خصوصیت ایسی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس سرزمین میں دستِ قدرت نے ایک ایسا قیمتی دفینہ رکھا ہوا ہے۔ نظر نہیں آتی۔ تھوڑے فاصلہ پر خشک اور بے گیاہ سے چٹان نظر آتے ہیں اور جس میدان سے آپ گذر کے جاتے ہیں۔ وُہ کچھ بہت شاداب نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں آپ کانِ نمک کے دروازہ پر آ پہنچتے ہیں۔ وہاں البتہ رونق نظر آتی ہے۔ سینکڑوں من نمک چھکڑوں میں لد کے باہر جانے کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ صدہا لوگوں کے لئے گذارہ کی سبیل بنی ہوئی ہے اور کانِ نمک کے گرد اُن مزدوروں اور اُنکے افسروں کی جو کان کنی پر مامور ہیں ایک معقول سی بستی آباد ہے۔ اور اُس سے کچھ دُور محکمۂ نمک کے عُہدہ داروں اور اُنکے کلرکوں کے بنگلے اور مکانات نظر آتے ہیں۔ گویا اسی نمک کی بدولت جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ باہر تو جو رونق ہے سو ہے۔ ذرا اندر جا کر تو دیکھئے۔ آتشبازی موجود ہے۔ دلم دیجئے

اور تھوڑی آتشبازی ساتھ لے لیجئے۔ اس کان کے اندر جاکر یہ نری بازی نہیں رہ جاتی مفید اور کارآمد ہو جاتی ہے۔ کئی حصّے ایسے ہیں جن کا نام ظلمات رکھا جانا چاہئے۔ وہاں مہتابی خضر طریقت کا حکم رکھتی ہے۔ داخل ہوتے ہی تاریکی اور نمی کا احساس ہوتا ہے۔ اور باہر کی کھلی ہوا کے مقابلے سے ذرا دم گھٹتا معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ اتنے میں ایک وسیع مربع حصّے میں کھڑے ہوتے ہیں۔ جہاں آپ دیکھتے ہیں کہ صدہا زن و مرد نمک کے بڑے بڑے ڈلے لاکر جمع کر رہے ہیں۔ کوئی ایک طرف آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کر رہا ہے۔ گو اس ناشتے کی کل کائنات نانِ جویں اور آبِ خنک ہی ہو۔ کوئی ایک تاریک ذخیرہ میں سے نمک لانے کے لئے چراغ لئے جا رہا ہے۔ کوئی کسی کے دستے پر ٹیک لگائے ستا رہا ہے۔ کوئی اپنے ساتھی سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہے۔ گویا زیرِ زمین ایک دُنیا آباد ہے۔ یہاں سے نکل کر ایک دُوسری طرف آئے تو نمک کا ایک بڑا دالان آپ کے سامنے ہے۔ نمک نکالتے وقت کان کن اپنی کاریگری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ چھت کی سطح دیکھو تو ہموار اور صاف ہے۔ اس کے نیچے ستون دیکھو تو سڈول ہیں۔ دیواریں ہیں تو خوبصورتی سے تراشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی سنگ سفید کے مکان میں کھڑے ہیں۔ یہ تمام کوشش محض خوشنمائی کے لئے نہیں بلکہ اس سے کان کنوں کی حفاظت بھی مقصود ہے۔ اگر اندھا دُھند اُڑاتے چلے جائیں اور اُوپر کے حصّے کو اتنا کر دیں۔ کہ بالائی سطح زمین کے نیچے ایک معمولی سا چھلکا نمک کی چادر کا رہ جائے تو ذرا سے صدمے سے چھت انکے سروں پر آپڑے۔ یہ سنگ سفید کے کمرے جو اس کان کے نیچے جا بجا ہیں۔ کہیں کہیں مشعلوں اور چراغوں کے دھوئیں سے اور مزدوروں کے میلے ہاتھوں کے چھو جانے سے مائل بہ سیاہی ہو رہے ہیں۔ لیکن اگر کھیوڑے کے نمک کو اپنی اصلی شفاف بلوریں حالت میں دیکھنا ہو تو کسی ایسے حصّے میں جاؤ جہاں اب نمک بارود کے ذریعے سے اُڑایا جا رہا ہو۔ اس کے لئے آپ کو تادیر انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔

ایلو۔ وہ زور کا دھماکا ہُوا۔ کہ پاؤں تلے کی زمین ہل گئی۔ ناواقف تو یہ سمجھے کہ شاید کان پھٹ گئی اور اب باہر جانا دشوار ہوجائے گا۔ کہیں "نمک شد" ہی تو تقدیر میں نہیں لکھا۔ مگر یہ دھماکا یہاں دن میں کئی دفعہ سُنا جاتا ہے۔ جس حصّے سے نمک نکالنا ہوتا ہے۔ اُس میں ایک چھوٹی سی سرنگ لگاکر بارود بھر دیتے ہیں۔ جہاں بارود کو آگ پہنچائی وہیں نمک کا پہاڑ پھٹا اور منوں کی سلیں ٹوٹ کر گریں۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ ہاتھوں سے کوہ کنی کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی اور کام بھی جلد ہو جاتا ہے۔ پھر مزدور آکر اس نمک کو جمع کر لیتے ہیں اور اُس کے بعد ہاتھ کا کام شروع ہوتا ہے اور ہمواری ہاتھ کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔

اِسی کان میں ایک دو حصّے ایسے ہیں۔ جو نہایت تاریک ہیں اور انکی تاریکی میں پانی کے بڑے بڑے قدرتی حوض تیچھے ہُوئے ہیں۔ ان حوضوں کے کنارے کھڑے ہوکر مہتابی روشن کرو تو عجب کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کو دیکھنے سے آبِ حیواں کی تلاش میں خضر کے زیر زمین جانے کے قصّے یاد آتے ہیں۔ افسوس کہ یہ آب آبِ حیواں نہیں۔ ایک معنے میں تو ہے۔ کہ اس پانی سے نمک پیدا ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ کروڑوں بندگانِ خُدا کی صحت اور لُطف زندگی وابستہ ہے۔ یہی تو مواقع ہیں جہاں صانعِ حقیقی کی رنگارنگ صنعتوں کا گہرا نقش دل پر بیٹھتا ہے۔

اِس کان کی زیارت کے بعد دو خیالات زور سے میرے دل میں جاگزین تھے اوّل تو یہ کہ علم طبقات الارض کتنا ضروری علم ہے اور اسکے ذریعے سے ہم کن کن نعمتوں کا پتہ لگا سکتے ہیں جو اسی زمین میں خُدا نے پنہاں کر رکھی ہیں۔ کہ متلاشی جستجو کرے اور پالے۔ اور دُوسرے یہ کہ کتنے لوگ صُوبۂ پنجاب میں اپنے صُوبے کے قدرتی دلکش منظروں سے واقف ہیں اور اُنکے نظارہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ کئی سال ہُوئے مَیں نے یہ تماشا دیکھا تھا اور یہ نامکمل سی تصویر اُس دلچسپ نظارے کی ایک دُھندلے سے

نقش سے جو صفحۂ دل پر باقی تھا۔ اس لئے پیش کی ہے کہ اور دیکھنے والے جائیں۔ نظر غائر سے دیکھیں۔ اور اس سادہ ڈھانچ کو رنگین بنا دیں +

سرسری نظر

اُجڑا ہوا گھر

معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارا گھر خالی ہے۔ اس کے دونوں کرایہ دار۔ زندگی اور خیال ایکدم سے مکان کو چھوڑ گئے ہیں۔ اور ایسی سرعت اور لاپروائی سے کام لیا ہے کہ چلتے ہوئے دروازہ اور کھڑکیاں بھی بند کرنی بھول گئے۔ گھر میں تو ذرا نظر ڈالو تمام اندھیرا گھپ ہے اور کھڑکی میں بھی کوئی روشنی نہیں ہے۔ دروازہ پر جو دن بھر میں سو دفعہ بند ہوتا تھا اور سو دفعہ کھلتا تھا۔ کوئی شور و غل نہیں۔ بس بھئی اب دروازہ تو بند کر دو اور کھڑکیوں کی چلمن ڈال دو۔ ورنہ گھر کی بے سر و سامانی اور اندھیرا ہم کو بے چین کر دیگا۔ چلو۔ میاں۔ اب یہاں کیا دھرا ہے۔ خوشی کا اب یہاں کچھ کام نہیں اور ہنسی مذاق بھی بند ہیں۔ یہ مکان مٹی ہے اور مٹی میں ہی رل جائیگا۔ اس کے مکین اب ایک عظیم الشان شہر میں جو یہاں سے بہت دور ہے۔ ایک بے زوال محل میں فروکش ہیں۔ بھلا اب انہیں ہم سے کیا واسطہ۔ وہ ہمیں کب خاطر میں لاتے ہیں +

(ترجمہ) **بشیر احمد** (از لنڈن)

مُبارکبادِ سفر

ہماری توجہ فرما جناب سرور جہان آبادی نے فرط محبت و ذرہ عنایت سے چند بند بذیل مسدس بطور دعا ایک نظم کے خاص لکھے ہیں اس مسدس کا تعلق جناب ایڈیٹر رسالہ مخزن کے سفرِ لنڈن سے ہے۔ ہم حضرت سرور کی اجازت و شکریہ کے ساتھ چند اشعار یہاں نقل کرتے ہیں
(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

پھریرے کو ہمت کے لہرانے والے ۔ جہازوں کی چوٹی پہ منڈلانے والے
سمندر کی موجوں کو ٹھکرانے والے ۔ مبارک ہو لنڈن پہنچ جانے والے
مبارک ولایت کا تجھ کو سفر ہو
سفر کے مقاصد سے تو بہرہ ور ہو

مُبارک ہوں یورپ کی دلکش فضائیں ۔ مبارک ہوں لنڈن کی ٹھنڈی ہوائیں
یہ جھونکے کلی تیرے دل کی کھلائیں ۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں تجھے راس آئیں
مفید ان کا صحت پہ تیری اثر ہو
کہ آبِ بقا تجھ کو بحری سفر ہو

خدا کی حمایت نگہباں ہو تیری ۔ جو مشکل ہو مغرب میں آساں ہو تیری
جو کوشش ہو یارب نمایاں ہو تیری ۔ کہ بُو بنکے شہرت پریشاں ہو تیری
ہر اک انجمن کا قلادہ بنے تو
ہر اک بحرِ فن کا شناور بنے تو

وطن کو تو فخرِ وطن بنکے آئے ۔ کہ یورپ کا نقادِ فن بنکے آئے
گلِ آرزو کا چمن بنکے آئے ۔ مرادوں کی تو انجمن بنکے آئے
ترا خیر مقدم مبارک ہو سب کو
کہ شورِ ویلکم مبارک ہو سب کو

سرور جہان آبادی

کلامِ ثاقب

جناب محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب رئیس آگرہ خلفِ اکبر مولوی محمد نصر اللہ خاں صاحب بہادر صدالصدور مرحوم کے نام نامی سے اہل ادب کے کان اور آنکھیں بخوبی آشنا ہیں۔ آپ اکثر فارسی ہی لکھتے ہیں اور ایسی لکھتے ہیں کہ حضرت امیر مینائی علیہ الرحمۃ والغفران جیسے بے نظیر اُستاد سے آپ نے دادِ سخن پائی۔ اس دفعہ آپ نے ایک غزل فارسی اور کچھ اشعار متفرق اُردو اور ایک غزل اپنی اہلیہ کرمہ کی عنایت فرمائی ہے۔ ہم نہایت مسرت سے اس قابلِ قدر عطیے کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی جناب ثاقب کی شعاع توجہ سے خوشہ چینی کا فخر ہم کو نصیب ہوا کرے گا :۔

دمے با عاشقِ شوریدہ طالع ساختی رفتی — ستمگر بیوفا آتش بجاں انداختی رفتی

نیاری اینکہ خوں ریزی و بستانی مرا دل — چرا اے شیشہ دل شمشیر بر من آختی رفتی

نہ اشک آورد چشمانت نہ گل افشاند دامانت — سمندِ ناز بر خاکِ شہیداں تاختی رفتی

گرفتی ساغر از دشمن شکستی بر سرِ گورم — قیامت آمدی آتش بخاک انداختی رفتی

ندادی آں قدر فرصت کہ بوسم پا کشم داماں — ستادی پائے سرو جوئے قدا فراختی رفتی

بیا اے نوبہاراں بیخودی افزائے مخمور لب — دمے با لالہ و سرو و سمن پرداختی رفتی

کجائی اے نگارم اے انیسِ ثاقبِ مخزونم
دو روزے با دلِ غمدیدۂ من ساختی رفتی

(والضّامنۂ ما کتبہٗ فی وقتٍ من الاوقاتِ فی الریختہ)

شنتا ہے کہ جاگ اُٹھیں نہ دیوانہ قامت — سرہانے تیری کشتوں کی جو محشر نہیں آتا

نالوں میں گذر جاتی ہیں راتیں مری۔ ہمدم! رونے کے سوا کچھ مجھے دِن بھر نہیں آتا
ہم جورِ شبِ ہجر سے کل تک نہیں بچتے گر آج بھی وُہ تُرک ستمگر نہیں آتا

جتنے فتنے ہیں دمِ رقص کھلے پڑتے ہیں آپ دیکھیں تو ذرا گوشۂ داماں کیطرف

مُنہہ محتسب کے کون خرابات میں لگے ثاقب ہوا یہ خوب کہ تم واں سے ٹل گئے

عالمِ تصویر ہے بزمِ بُتاں دل بھی اِک حیرت کا پُتلا چاہیئے
یہ کرشمہ یہ لگاوٹ یہ ادا ان حسینوں کو بھی دیکھا چاہیئے

خضر سے بھی نہ ہُوئے رہبرِ کوئے بقا آہ دھوکے میں رکھا راہنما نے ہم کو

کرلیا ساری خُدائی کو تو بندہ اپنا اور کیا چاہتے ہیں آپ خُدا ہوجانا
عشق میں بن نہ پڑی تجھ سے جو ثاقب کچھ اور مٹ کے خاکِ رہِ اربابِ وفا ہوجانا

از اہلیہ محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب عفت تخلص

چاہت کا لُطف دل نے دکھایا نہیں ہنوز کنعاں کا ماہ خواب میں آیا نہیں ہنوز
ایمان کی تو یہ ہے کہ اُس لب کے سامنے عیسٰی نے کوئی مُردہ جلایا نہیں ہنوز
قاصد جواب کے لئے کیا دُھوم پڑ گئی آنکھوں سے خطِ یار لگایا نہیں ہنوز
ہاں اے نگاہِ ناز اشارت کی دیر ہے جنگل کو عاشقوں نے بسایا نہیں ہنوز
مرنے کی ہے ہوس کسی خالِ سیاہ پر داغوں کو میرے دِل نے جلایا نہیں ہنوز
وُہ شوخیاں کہاں ستم آرائیاں کہاں انداز جورِ چرخ نے پایا نہیں ہنوز
لبریزِ خوابِ ناز ہیں چشمانِ مے پرست فتنہ فلک نے کوئی اُٹھایا نہیں ہنوز
ہم مرگئے ہیں جس کے لئے وُہ ستم شعار دو پھول بھی مزار پہ لایا نہیں ہنوز
دیوانہ کیوں ہوا دلِ بیتاب خیر ہے برقع سے رخ پری نے دکھایا نہیں ہنوز
ساقی سے آنکھ لڑتے ہی یہ بیخودی ہُوئی ساغر بھی مَیں نے منہہ سے لگایا نہیں ہنوز
بس ہیں خُدا کے واسطے لے جوشِ اشتیاق تیری قسم میں آپ میں آیا نہیں ہنوز

گردوں[1] نے تجھ سا گوہرِ رخشندہ ہائے ہائے | غربت کی خاک میں تو ملایا نہیں ہنوز
ثاقب نے سچ ہے جان بہن تیرے ہجر میں | زانوئے غم سے سر کو اٹھایا نہیں ہنوز

عفّت غزل کہی نہ ملا پر مزا ہمیں
ثاقب کو کوئی شعر سنایا نہیں ہنوز

برسات کا سماں

اس عنوان کے ذیل میں ہم وہ نظمیں شائع کرتے ہیں جو اس پُر لطف جنون انگیز موسم اور اسکے دلاویز نظاروں اور منظروں کے متعلق ہم کو پہنچی ہیں امید کہ آج کل کے موسم میں یہ نظمیں خاص دلچسپی رکھینگی :-

غزل

برکھا رت

جھوم جھوم آتی ہیں مستانہ گھٹائیں کیا کیا | رات دن چلتی ہیں جاں بخش ہوائیں کیا کیا
دی ہے برسات کے جھونکوں نے نوید رحمت | ورنہ کیں خلق پہ گرمی نے جفائیں کیا کیا
آہ کوئل کی یہ تانیں یہ پپیہے کا الاپ | شورش انگیز جنوں ہیں یہ صدائیں کیا کیا
اٹھتی ہیں سینکڑوں بے نام امنگیں اس میں | آگ سی دل میں لگاتی ہیں ہوائیں کیا کیا
برق کو دیکھ کے کیا دل پہ گھٹا سی چھائی | بجلیاں دل پہ گراتی ہیں گھٹائیں کیا کیا
آؤ اے چاند! بہار دل پہ ہے تیرا جوبن | تو نے برسات سے سیکھی ہیں ادائیں کیا کیا

[1] اشارہ ہست بسانحۂ تاب گسل رحلت خاتون تحسین ثاقب خستہ جان کہ در طرفۃ العین بسالِم غربت ... بہمین ... بمقام جالعہ بجلیقین بہشت ... ۱۲ ثاقب عفی عنہ۔

کج کلاہانِ گل و غنچہ کی سج دھج کیا خوب جامہ زیبانِ چمن کی ہیں قبائیں کیا کیا
کس قدر گوہر و الماس بکھیرے نیرنگ
خسرو ابر کی ہیں ہم پہ عطائیں کیا کیا

نیرنگ

برسات

حضرت داغ مدظلہ کا رتبہ عالی جو عشقیہ شاعری میں ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ بلبلِ ہند نے اپنی شاعری کا موضوع زیادہ تر معاملہ ہی کو ٹھہرایا ہے۔ مگر کہیں کہیں متصوفانہ اور دیگر مضامین بھی بیان فرماجاتے ہیں۔ میر نذیر حسین صاحب ذیل کا قطعہ اُنکے ایک قصیدے سے اخذ کرکے ارسال فرماتے ہیں۔ جس سے ناظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ حضرت داغ اگر اور طرف بھی توجہ منعطف فرمائیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں:۔

چرخ پر چھائی ہیں اس طرح گھٹائیں کالی جس طرح ہوں رُخِ معشوق پہ زلفیں برہم
ہے سیہ ابر میں اس روپ پہ بگلوں کی قطار انجم کاہکشاں کی ہو لڑی جیسے بہم
کہیں بادل کی گرج ہے کہیں بجلی کی کڑک کہیں بوندوں کی پھواریں کہیں برسے چھم چھم
نعرۂ مست کا بادل کی گرج میں انداز نگہِ شوخ کا بجلی کی تڑپ میں عالم
پسلیاں اب نہیں دریا کی دکھائی دیتیں خوب تن تن کے رواں ہونے لگا موجۂ یم
کشتیوں میں کہیں چلتے ہیں چڑھے دریا کے ہو رہی ہیں کہیں تیراکوں میں شرطیں باہم
شوخیٔ رنگ سے مہندی کے ہوئی رنگِ شفق لالۂ باغ پہ ہے لال پری کا عالم
کہیں طاؤس چمن کی ہے نوائے دلکش کہیں آتی ہیں پپیہوں کی صدائیں پیہم
ہے کہیں گل کی مہک تو کہیں بلبل کی چہک کوک کوئل کی ہے اک من سے بھی خوشتر ہر دم

بھینی بھینی ہے وہ خوشبو کہ معطر ہو دماغ ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں ہیں کہ دل ہو خرم
بوسے لیتا ہو شگوفے کے شگوفہ کھل کر شاخ سے شاخ گلے ملتی ہے کیا کیا باہم
روز ہر باغ میں ہیں گلبدنوں کے جلسے چندریاں ساڑیاں سُرخ اُس پہ ترشح کم کم
شور ہے قلقل مینا کا چلو آؤ پیو مغبچوں نے بھی مچا رکھی ہے کیا کیا اودھم
ارض کو فوق سما پر ہے اسی موسم میں کہ زمیں لوحِ زمرد ہے فلک ہے نیلم

داغ

بارش

چھم چھم کرتی جل تھل بھرتی نہریں بہاتی آتی ہوں
ندی نالے سمندر دریا چشمے سب بھرجاتی ہوں
جنگل بستی۔ بن اور گلشن میری نظر میں یکساں ہیں
شہروں۔ گانوؤں۔ دشت و جبل میں ہر جا آتی جاتی ہوں
رعدِ بلند آواز نقیب۔ اور برق مری اک مشعل ہے
شور سے اُسکے ہوں چونکاتی روشنی اُس سے دکھاتی ہوں
کھیتوں کے حق میں ہوں میں امرت باغوں کے حق میں فضل و رحمت
قحط کی ہوں میں جانی دشمن اس کو فنا کرجاتی ہوں
ابر مرا گہوارہ ہے گویا۔ اور ہوا ہے اُڑن کھٹولا
اُمنڈ گھمنڈ جب آتی ہوں عالم میں حُسن برساتی ہوں
جھونپڑیوں۔ چوباروں۔ گلیوں۔ کوٹھیوں۔ بنگلوں قلعوں پہ

فیض مرا ہے یکساں جاری سب کو خوش کر جاتی ہوں
نخلستان و کوہستاں ہیں میرے ہی دم سے رونق ہے
جنگل میں ہوں۔منگل کرتی راغ کو باغ بناتی ہوں
گرد ہوں رُوئے آب کی دھوتی۔بھرتی ہوں منہ سیپ کے موتی
معدنی اور نباتی دُنیا کو پروان چڑھاتی ہوں
یخ اور برف کہر اور پالا سارے میرے کرشمے ہیں
کثرت میں وحدت کا تماشا اہلِ نظر کو دکھاتی ہوں
بحثِ تناسُخ حل ہوں کرتی گویا ہوں جی جی کر مرتی
بھاپ سے ہوں میں پانی بنتی بھاپ ہی پھر بنجاتی ہوں
قوسِ قزح اِک میری ادا ہے اور آئینۂ مہر نما ہے
سُورج ہو جب میرے مقابل اُس کا رنگ اُڑاتی ہوں
صُوفی کو فطرت کا صحیفہ - عاشق کے لئے یار کا جلوہ
چشمِ حقیقت بیں کو دریا اِک قطرے میں دکھاتی ہوں
محنت کش ہیں والہ و شیدا عیش پرست میرے دلدادہ
بادہ کشوں کی سُوح ورواں ہوں اُنکو خوب چھکاتی ہوں
شاہ و گدا راجہ اور پرجا میرے دست نگر ہیں ہمیشہ
زیرِ فلک کُل اہلِ زمیں کی آرزوئیں براتی ہوں

سیّد علمدار حسین (ہنوٹی)

برسات کی بہار

بادل اُٹھے وُہ جھوم کے ساقی کدھر ہے آ   پہلو میں اپنے اس گھڑی مطرب پسر ہے آ
بلبل خوشی میں کھوئے ہُوئے آج پَر ہے آ   دھانی لباس پہنے ہوئے ہر شجر ہے آ
غنچے بھی ہیں کھلے ہُوئے ٹھنڈی ہوا بھی ہے
بُوندیں بھی پڑ رہی ہیں چمن میں فضا بھی ہے

بالائے کوہ اُودی گھٹا کی بہار ہے   چشمہ اِدھر رواں ہے اُدھر شاخسار ہے
کیا خوشنما کھجور کی دیکھو قطار ہے   پانی میں کائی رشک دہ سبزہ زار ہے
چوپائے چڑھ رہے ہیں چری کو پہاڑ پر
دس پانچ چر رہے ہیں اِدھر پانچ چھ اُدھر

دیکھو نکل کے تم شبِ تاریک کا سماں   ملتا نہیں سُراغِ ثریّا و کہکشاں
کالی گھٹا ہے چھائی ہُوئی گردِ آسماں   رہ رہ کے زور زور سے آتی ہیں بُوندیاں
جگنو سے نخل یُوں ہیں درخشاں پہاڑ میں
روشن ہوں شمعیں جیسے زمرّد کی جھاڑ میں

کالی گھٹا وُہ آتی ہے مستانہ وار ۔ دیکھ   بگلوں کی اُونچے اُونچے شجر پر قطار ۔ دیکھ
گلہائے باغ و قوسِ قزح کی بہار ۔ دیکھ   ہیں زرد پھول مثلِ گلِ زر نگار ۔ دیکھ
کب ہیں یہ سبزہ زار میں آہو کھڑے ہُوئے
نرگس کے پھول ہیں یہ روش پر پڑے ہُوئے

دلچسپ کیا ہی سبزہ صحرا کی ہے بہار   کیا پُر فضا ہے جلوۂ خوش رنگِ لالہ زار
فرشِ زمرّدیں کو جو اُس پر کروں نثار   اِس پر فدا ہو تختۂ یاقوت لاکھ بار
توصیفِ شانِ قدرتِ صانع ہو کیا بیاں

دریائے سُرخ و سبز کو یکجا کیا رواں

بادل کی وہ گرج - وہ گھٹا اور بادِ سرد — وہ سبز سبز نیم کے پتے ثمر وہ زرد
لالہ وہ جس سے لعلِ بدخشاں ہو گرد گرد — سوسن بھی وہ کہ جس سے ہو شرمندہ لاجورد
اودی گھٹا میں بجلی کی رہ رہ کے وہ چمک
مہندی کی پھولوں اور گلِ تر کی وہ مہک

غافل کدھر ہے گورِ غریباں کی سیر کر — دھنس دھنس گئی ہیں قبریں ذرا اک نظر ادھر
جھک جھک پڑی ہیں نیم کی شاخیں جھکی ڈھیر پر — تھے اہلِ قصر جو یہ انہیں کا ہے دیکھ گھر
اُمیدِ گریہ صرف ہے ابرِ بہار سے
سبزہ وفورِ غم میں ہے لپٹا مزار سے

لٹکے ہوئے ہیں جھولے درختوں میں جابجا — ہیں سبز پوش آج حسینانِ مہ لقا
بارش جو ہو گئی ہے تو کچھ سرد ہے ہوا — ساقی کدھر ہے جامِ زمرّد میں پھول لا
چھائی ہوئی ہے کالی گھٹا ایسی شان سے
سارے پہاڑ مل گئے ہیں آسمان سے

شب کو ہے ابر و باد میں دریا پہ کب رواں — موجیں ہیں شکلِ گیسوئے لیلائے شب عیاں
گرداب پر اندھیرے میں ہے خال کا گماں — کالوں کی طرح کالی ہیں پانی میں مچھلیاں
بیڑے کو میرے پاٹ کا ملتا پتا نہیں
اے برق المدد کہ کوئی ناخدا نہیں

کھل جائے ابر دھوپ کہ تب دیکھئے بہار — ہے آب آبِ زر - تو ہے ہر برگ زرنگار
ہے شاخسارِ نور کہ اشجارِ کوہسار — گلہائے باغ صورتِ اختر ہیں آبدار
کب گھاس پر ہیں قطرۂ نیساں پڑے ہوئے
نخلِ زمرّدیں میں ہیں موتی جڑے ہوئے

میدان میں وہ کوئل کی گونجی ہوئی صدا　　وہ بوندیاں وہ برف کی ڈوبی ہوئی ہوا
چشمہ وہ اردگرد وہ کہسار جابجا　　بادل کی وہ گرج وہ بڑے زور کی گھٹا

دل سے سماں یہ عرشؔ کبھی بھولتا نہیں
کب گلشنِ خیال میں اپنے فضا نہیں

عرش

ابرِ بہار و فراقِ یار

اِس نظم کا خاکہ تُلسی داس جی کی رامائن کے اُس مقام سے لیا گیا ہے جہاں اس خُدا رسیدہ مصنف نے سیتا جی اور رام چندر جی کا برسات میں ایک دُوسرے سے جُدا ہونا بیان کیا ہے تُلسی داس جی کا رنگ اَور ہے اور حضرت طالب کا ڈھنگ اَور۔ مگر توضیحاً اس قدر اشارہ کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

زہے اکرامِ یزدانی۔ زہے افضالِ ربّانی　　زمیں پر کی ہے ابرِ قطرہ زن نے گوہر افشانی
بساطِ سبزۂ گلشن ہے یا مخمل ہے کاشانی　　لباسِ گل کسی معشوق کی پوشاک ہے دھانی
کھنچا ہے بامِ گردوں پر سحابِ تر کا دل بادل　　اوڑھا دی مہر و مہ کو ابر کی چادر نے بارانی
جوانانِ چمن شاداب ہوکر لہلہاتے ہیں　　ہوائے خود سری میں سرگراں ہے سروِ بستانی
کسانوں کا کلیجہ ہو گیا ٹھنڈا تقاطر سے　　کہ ڈالا ابرِ تر دامن نے سوکھے دھان میں پانی
بڑھا دی اور حرصِ میکشی۔ اُٹھکر گھٹاؤں نے　　ہمارے خشک زاہد کے وضو پر پھر گیا پانی
سبق ملتا ہے ہر برگِ شجر سے بابِ احساں کا　　گلستاں میں نم ہے بوستاں با خطِ ریحانی
چراغوں پر پتنگے جھک پڑے جل جل کے اُلفت میں　　لگا دی آگ ابرِ تر نے۔ ہجر کا سوزِ نہانی

ندا اٹھے ہوائی سرد سے عُریاں بدن مفلس　　بجایا۔ رعد نے آواز سے کوسِ زمستانی
فلک پر ابرِ باراں ہی زمیں پر تخم ریزی ہے　　عجب یہ آب و دانہ ہی کہاں دانا۔ کہاں پانی!
نادی ہی ہوا گرمی کو بادِ برشگالی نے　　عرق کے ڈوب[1] پر بھی آجکل کیا مر گیا پانی!
ہے قسمت عجب ابرِ کرم کی آبیاری ہے　　لطافت کی ہی ارزانی طراوت کی فراوانی
بفورِ آب سے ہر تختۂ گلزار کا چشمہ　　بنا مُرغابیوں کے واسطے تختِ سلیمانی
بنے ہیں بَیل بلوا ہے خیالِ قلبہ رانی میں　　جُتتے[2] ہیں جو تنے بونے میں سادہ لوح دہقانی
کبھی ابرِ سیہ کی تیرگی میں ہی سیہ مستی　　کبھی ہی چاندنی کے کھیت سی سرِ کشتِ نورانی
ب ایسے میں ہلالِ آسماں کی جلوہ افروزی　　برائے عاشقِ مہجور ہے تیغِ صفاہانی
[3]عروسک ہیں عروسِ لالہ پیکر جنکی غیرت سی　　عجب کیا خون تھوکے کان میں لعلِ بدخشانی
خس و خاشاک سی یوں پاک ہی سطحِ زمیں اکثر　　مجازی سی کنارہ کش ہو جیسے مردِ حقانی
سحابِ تازہ رُو اس طرح ہر جا قطرہ زن آیا　　ملے ایک مردِ صالح جیسے سب سے خندہ پیشانی
زمیں کو یُوں طراوت دیکر رہا ہے ابرِ پُرمایہ　　سخی کرتا ہی گویا صاحبِ حاجت کی مہمانی
بضاعت پا کے نَودولت کا تھوڑی میں اُبل پڑنا　　دِکھا دیتی ہی ہر چھچھلے ندی نالے کی طُغیانی
پیادہ پا مُسافر اس طرح لت پت ہیں کیچڑ میں　　مہوّس جس طرح پابند لذت ہائے نفسانی
تخالف میں ہی مہر دایر کے اوقات اِن دنوں　　تلوّن طبع اکثر جیسے ہوں آرائے سُلطانی
ہری گھاسوں میں یُوں پنہاں ہُوئی ہیں راستی ہر جا　　چھپائی مہرِ دانش جس طرح سے ابرِ نادانی
خرامِ نازِ سیل اب بھی وُہ چال چلتا ہے　　نہیں رہتا ہے جیسے ایک جا معشوقِ سیلانی
ہُوئی ہی کثرتِ سودیدگی بارانِ رحمت سے　　زیادہ علم سے ہوتی ہی جیسے عقلِ انسانی
زمینِ شور میں بیفایدہ ہے تُحبہ باری یُوں　　نصیحت جس طرح اہل کے دل کی دشمنِ جانی
چمک جاتی ہی بجلی کوئی دم اس طرح ظلمت میں　　گذر جاتی ہی دورِ خواب میں جُول عمرِ انسانی

[1] ڈوب بروزن جوب بمعنی پسینے کی دھار ۱۲ [2] یعنی مصروف ہیں ۱۲ [3] بیر بہوٹی ۱۲ طالب

بھرے بادل جھکے پڑتے ہیں ایسے خاکساروں پر
کہ جیسے منکسر دکھلا رہا ہو کسرِ نفسانی

اُمنڈ کر ندیاں ملتی ہیں یوں دریائے اعظم سے
میسر جس طرح ہو باخدا کو وصلِ ربانی

ندی نالوں میں پانی رفتہ رفتہ جمع ہوتا ہے
اکٹھا جس طرح ہو جزرسی سے گنجِ پنہانی

ہوا کے زور سے اشجارِ گلشن یوں اکھڑتے ہیں
کہ جیسے ناخلف سے ہو کسی کنبے کی نقصانی

پپیہے مور نکلے شور کرتے صحنِ گلشن میں
صدائے لحنِ داؤدی ہے کوئل کی خوش الحانی

پرندے اس طرح ہیں چہچہہ زن ذکرِ قدرت میں
تلاوت جس طرح زاہد کرے آیاتِ قرآنی

اِس عالم میں بگڑ بیٹھے تم اپنے یار سے طالب!
یہ کی اے یار میرے تم نے دانائی کہ نادانی

جب اُٹھا ابر یادِ خال میں آنسو نکل آئے
خیالِ زلفِ برہم میں ہوئی دل کو پریشانی

نکل کر مہر - کیونکر آگ کا شعلہ نہ بن جائے
نہیں پہلو میں جب اپنا وہ رشکِ ماہِ کنعانی

شبِ فرقت میں آئے شمع پر جس وقت پروانے
تو ہم سمجھے کہ گھر میں آگیا غولِ بیابانی

غرض اپنے کئے پر آپ پچھتا کر - یہ کہتے ہیں
"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"!

طالبِ بنارسی - از بمبئی

آمدِ بہار

للہ الحمد پھر بہار آئی
مرغِ گلشن ہیں محوِ زیبائی

فرشِ مخمل ہے سبزہ خوابیدہ
ٹہنی ٹہنی ہے وقفِ رعنائی

صحنِ گلشن ہے زینتِ فردوس،
پتے پتے میں تازگی آئی

چل رہی ہے نسیم روح افزا
بھینی بھینی چمن سے بو آئی

دے دیئے چار چھینٹے شبنم نے   ہنس پڑی جو کلی تھی مُرجھائی
پُھول شوخی سے مسکراتے ہیں   دیکھئے بلبلوں کی بن آئی
اِک طرف بید کی لچک پہ لچک   اِک طرف سرو کی صف آرائی
اِک طرف جوہی کی لپٹ پہ لپٹ   اِک طرف بیلی کی خود آرائی
موتیا کا ہے اِک طرف تختہ   جس کی نگہت ہے خود تماشائی
وہ پپیہے کی پی کہاں کی صدا   نغمہ زن عندلیب شیدائی
دیکھئے مست ہو کے کبک دری   چال چلتی ہے کیسی اٹھلائی
دے رہی ہے نسیم بھی تھپکی   شاخِ گل لے رہی ہے انگڑائی
جوبنوں پر عروسِ گلشن ہے   اور غنچوں میں نازِ یکتائی
پُھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے   جان مُردہ نے تازگی پائی
بوٹے بوٹے پہ وجد کا عالم   خامشی گویا ان کی گویائی
عرش سے لیکے فرشِ خاک تلک   محوِ حیرت ہیں سب تماشائی
پتے پتے سے معرفت ہے عیاں   ایک دفتر ہے گل کی رعنائی
اِک ڈراما ہے بلبلوں کی چہک   اِک تماشا ہے گل کی زیبائی
کہہ رہی ہے کچھ اور ہی باتیں   باغ میں جو کلی ہے مُرجھائی
طُرفہ تر ہے نصیحتِ گل چیں   باغبانوں کی زینت افزائی
کُھل گئی تھیں جو راز کی باتیں   مرحبا! مرحبا! بہار آئی
مُژدہ اے طالبانِ راہِ کمال   نُورِ حق کی جھلک نظر آئی
حسنِ باطن ہے جلوہ آرا آج   آئیں۔ دیکھیں کہاں ہیں شیدائی
وقت اچھا ہے حق شناسی کا   کسکو مطلوب ہے شناسائی
گمرہانِ منازلِ مقصود   وہ جرس کی سُنیں صدا آئی

لپنے مطلوب سے ملیں کھُل کر   شاد ہوں اب مُراد بر آئی

محمد فخر الدین خان عاجز نجابگیری

برکھارت

مُبارک جھومتی برکھارت آئی   عجب پیاری گھٹا گھنگھور چھائی
برستی اور گرجتی فوج لیکر   فلک پر بادلوں نے کی چڑھائی
لگی ہونے بکثرت گولہ باری   دنا دن توپ کی آواز آئی
مقابل رُوس کے پورٹ آرتھر پہ   ہو جیسے اہل جاپاں کی چڑھائی
دکھائی برقِ تاباں نے جو مہتاب   جُھٹی خورشید کے مُنہہ پر ہوائی
رہا کچھ دیر ششدر شاہِ خاور   حرارت آگئی تیزی دکھائی
چڑھایا آسماں کو سان پرجب   تو دیدی اُسکو نیلم کی صفائی
مگر اتنی کہاں ہمت کہاں تاب   گھٹا ٹوپ اِک دیا لشکر دکھائی
ہوا کوندا تو آنکھیں تلملائیں   کلیجہ ہلگیا دہشت سمائی
چھپاتے بن پڑا پردے ہی میں مُنہہ   جو دیکھا فوج ہر سو سے گھر آئی
حکومت شاہِ گردوں کی گئی چھن   عملداری ہُوئی دم میں پرائی
ڈھنڈورا پٹ گیا از غرب تا شرق   ہے اب برسات کی فرمانروائی
لُٹایا ابرِ رحمت نے خزانہ   مُرادِ اہلِ دِل دم میں بر آئی
دیئے نخلِ چمن کو خلعتِ نَو   قبا خوش رنگ پھولونکو پہنائی
ہوئے شاداب گل بوٹے چمن کے   عجب قدرت نے بخشی خوشنمائی

کھلا گیندا - ہزارا کھِکھلایا
بگل کیلوں نے پھونکا باصفائی

گرہ چوٹی کی سنبل نے جو کھولی
دھڑی ہونٹوں پہ سوسن نے جمائی

گل شبو نے طرفہ گل کھلایا
کہ پھر چمپا کلی بھی مسکرائی

کھلے گل - چاندنی باغوں میں پھیلی
چھٹی مہتاب کے منہہ پر ہوائی

جڑاؤ آرسی سورج مکھی نے
عروس باغ کو دی رونمائی

بنے گل جب کرن پھول اک ادا سے
ادھر پھر شاخ ہیچاں لونگ لائی

بہار آئی کنول نہروں میں پھولے
خودی سے بیخودی بھنوروں پہ چھائی

چلیں ٹھنڈی ہوائیں اس طرح سے
ہوئی غش قدرتی معجز نمائی

ہوئے جب مرغ خوش الحاں غزلخواں
صدا دی بانسری کی سی سنائی

پپیہوں نے اُدھر پی پی پکارا
صدا کو کو کی کوئل نے لگائی

اِدھر نقارہ پر دی ابر نے چوب
اُدھر جھنکار جھینگر نے لگائی

جو پر پھیلا کے بن میں مور ناچے
فلک پر کی شفق نے خوشنمائی

ہوئی خلق خدا مسرور از بس
ہر اک دل پر گھٹا عشرت کی چھائی

گھٹائیں بڑھتے ہی چمکا ستارا
عجب جگنو نے کی جلوہ فزائی

کسانوں نے خوشی سے دھان بوئے
ہری کھیتی ہوئی اُمید پائی

بہا کھیتوں پہ کیا آب زمرد
جھڑی جب ابر رحمت نے لگائی

ندی تالاب چشمے جھیل دریا
بھرے ایسے ہوئی گھر گھر ترائی

ندی نالوں نے ایسا زور باندھا
ہوئے کافور امراض وبائی

انوکھی چھب نرالی وضع بنائی
عجب انداز سے برکھا رت آئی

اُٹھی ہر سو بھنبیری ساون آیا
ہوا مشرق کی جانب سنسنائی

چھپائیں ابر میں تاروں نے آنکھیں
شب ماہتاب تجلی بن کے آئی

خجل ہے جس کے آگے مینا کاری
وہ ہے خوش رنگ دیواروں پہ کائی

حسیں باغوں میں جھولا جھولتی ہیں
ہرا کرتی ہے دل نغمہ سرائی

ہنڈولوں پر ہنڈولے گا رہے ہیں
بتانِ خوبرو با خوش نوائی

لگاتا ہے ملاروں کی کوئی تان
دکھاتا ہے کوئی دستِ حنائی

گہر اس قدرتی منظر کا لکھ سال
اُمنڈتی جھومتی برکھا رت آئی

شاکی ۱۸ ۲۵

خاتونِ عالم

تماشائے اہلِ نظر بن گئی تو
خدا ہیں نگاہوں کا گھر بن گئی تو

نہ تھی اس جہاں میں تو تھی حورِ جنت
زمیں پر اُتر کر بشر بن گئی تو

ترے دم سے قائم ہوا نظمِ عالم
زہے شان۔ کانِ ہنر بن گئی تو

تری ہر ادا لذتِ بے نہایت
حلاوت میں قند و شکر بن گئی تو

مسخر کیا جس کو دیکھا نظر بھر
لُبھانے میں جادو اثر بن گئی تو

مصیبت میں ثابت ہوئی رحمتِ حق
تکالیف سے بے خبر بن گئی تو

تیرے باعث آساں ہوئی زندگانی
محبت کا اُلفت کا گھر بن گئی تو

"رضا"

بادکش کی تقریر

از منشی رام سہائے صاحب تمنّا لکھنوی ۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس اوناؤ

جو ہیں اربابِ غرض ان کا نہیں پنہاں ہے حال — اپنے مطلب کے لئے لیتے ہیں یہ بیریں نکال
یہ غرض وُہ ہے کہ جسکو الغرض ہے اپنی ننگ — سب کے آگے ہے یہ پھیلائے ہُوئے دستِ سوال
جتنی ایجادیں ہُوئی ہیں ہے ضرورت اُنکی ماں — جس سے ہو پُوری غرض ۔ طالب وہی چلتے ہیں چال
فصلِ گرمی کی جو سرگرمی سے آئی خلق میں — ہو گیا بیچین ہر پیر و جوان و خورد سال
بارشِ آتش ہُوئی وُہ چشمۂ خورشید سے — دھوپ میں باہر نکلنا ہو گیا امرِ محال
الاماں گرمی کی شدّت اُف رے حدّت فصل کی — ہر مسامِ مُو سے نکلا ہے پسینے کا ابال
تنگ ہے حبسِ ہوا سے رُوح کا بھی قافیہ — ہر مکاں میں ہر مکیں ہے بیقرار و پُر ملال
دیکھ کر یہ حالِ نازک لوگ گھبرائے بہت — دُور ہو کس طرح گرمی کی یہ با ہم قیل و قال
پہلے کوشش کی کہ ہو بادِ صبا اُن کی کنیز — لیکن اس کے آگے اُنکی گل سکی ہرگز نہ دال
جب ہوا آئی نہ قبضے میں تو سوچا اَور ڈھنگ — آیا دل میں بادکش تیار کرنے کا خیال
تار کر اک تار کو توڑیں کچھ اُس کی پتّیاں — اُنکو یکجا کر کے جمعیّت کا دکھلایا جمال
دستکاری بھی دکھائی ۔ کام بھی اپنا کیا — ہاتھ میں لیکر گھمایا ۔ مجھ کو دُنیا کی مثال
جب میں گھوما خود ہوا اُکرا کے پیدا ہو گئی — ہو گئی غایب اُس دل ہو گئے سب کے نہال
جب تلک میں دُوسری صُورت میں تھا بالائے شاخ — کوئی بھی میری طرف مطلق نہ کرتا تھا خیال
جب سے پنکھا بن گیا بکنے لگا بازار میں — مجھ کو ہاتھوں ہاتھ اب لینے لگے نازک خیال
اب جسے گرمی لگی اُس کو ہُوئی میری تلاش — میری فرقت عاشق و معشوق کو بھی ہے وبال
بزمِ سلطاں میں بھی میں پہنچا بفضلِ کبریا — دیکھو برگِ خشک نے دکھلایا کیا رنگِ جلال

دیکھئے تبدیلِ صورت بھی عجب اِک چیز ہے — بد پیدا ہو اِسی سے اور اِسی سے ہو ہلال
سچ جو پوچھو قدر کے قابل ہے یہ قولِ خرد — ہر کمالے را زوال و ہر زوالے را کمال
خشک پتّوں سے نہ گر پنکھا بناتے مجھ کو لوگ — آج کیونکر اِس قدر حاصل نہ مجھے ہوتا کمال
اپنی بیقدری سے افسردہ نہ ہو انساں کبھی — وقت جب آتا ہے اچھا۔ دُور ہوتا ہے ملال
جو کرے کوشش کسی کی بہتری کے واسطے — اُس پہ رہتا ہے ہمیشہ فضلِ ربِّ ذوالجلال
بادکش کے قبضے میں جس طرح رہتی ہے ہوا — اہلِ محنت کے بھی قبضے میں ہے جاہ و ملک و مال

اے تمنّا ہے بیانِ بادکش پندِ نفیس
ہو گیا شاداب و تر اسکی ہوا سے باغِ قال

تمنّا [illegible]

محبّت

(ترجمہ از انگریزی)

بتلائے کوئی عشق کیا چیز ہے ؟ — زبانیں ہیں جس کے بیاں پر فدا
یہ کیسی تڑپ ہے کہ جس کے بغیر — نہیں چین انساں کو آتا ذرا ؟
یہ ہے کیوں مثالِ ہوا بے قرار؟ — شناسا تغیر سے ہے کیوں مدام؟
یہ موجِ خوشی ہے کہ طوفانِ غم ؟ — دیا ہے یہ دونوں کے ملنے کا نام؟
محبّت ہے آقا محبّت غلام — یہ ہے مہرباں بھی دل آزار بھی
اگر ہو تو رہتا ہے دِل بے قرار — نہو تو نہیں دِل کو راحت کوئی
ہے ممکن کریں اس سے ہم اجتناب؟ — یقیناً مجھے اس میں شک ہے کمال
خوشی ہے یہی اس کے صدمے سہوں — بغیر اس کے ہے زندگانی محال

(محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا

قطعاتِ آہ

ہر سمت سے آ رہی ہے آواز اللہ بھلا بشر بُرے ہیں
اللہ ہماری شرم رکھ لے تیرے ہی تو ہیں اگر بُرے ہیں

اسراف کی دُھوم ہر کہیں ہے پابندیٔ رسم دلنشیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں "اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے"

رات کٹتی ہے بہر صُورت فقیر و شاہ کی اس نے ہنستے کاٹ دی اور اُسنے روتے کاٹ دی!
گو کہ انکا جاگنا بھی غفلتوں کے ساتھ ہے" پر ہمیں دیکھو کہ ہم نے رات سوتے کاٹ دی!!

پی کے کرتا مذمتیں مے کی تُو نے واعظ! مری سُنی ہی نہیں
جس میں "حق الیقین کی" بُو ہو ایسی تو نے کبھی کہی ہی نہیں
تیری باتوں میں خاک ہو تاثیر "ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں"

یہ تمکو کیا ہوا ہے اسیرانِ ہمصفیر؟ اُٹھتے نہیں ہلائے سے بھی! سو گئے ہو کیا؟
ہم تو وہی ہیں اگلے تمہارے نیاز مند چُپ چاپ کیوں ہو؟ ہم سے خفا ہو گئے ہو کیا؟

پیری میں رو رہا ہے جوانی کو پیر مرد یعنے وُہ اگلے رنگ کے اب کھیل ہی نہیں
ایک خواب تھا زمانۂ ماضی کی چاہتیں اگلا سا اب ملاپ نہیں میل ہی نہیں

پہلو میں دل ہے دل میں امنگوں کا کال ہے — کیونکر جلے چراغ کہ اب تیل ہی نہیں

آرام کی چیزوں سے میسر نہیں آرام — دنیا میں ہر اک طرح سے مشکل ہے بشر کو
تھک تھک کے رہے جاتے ہیں کیوں اہلِ طلب میں — کیا سر پہ کوئی لیکے چلے پائے سفر کو!

شاعری اصلاً غلط گوئی نہیں — جھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
سب انہیں گندوں کے ہیں گندے خیال — شاعروں سے شاعری بدنام ہے

ابو النصر آہ دہلوی (از بمبئی)

کلامِ شاطر

اس طرح اب عمر کٹتی ہے تری فرقت میں یار — مجھ سے شرمندہ اجل میں زندگی سے شرمسار
جل بجھیں پروانے ناحق یہ کسے منظور ہے — دوستو مجھ کو نہیں ہے حاجتِ شمعِ مزار
ماجرا گلشن کا بھولے اب کہاں وہ ولولے — کیوں قفس میں چھیڑتی ہے ہم کو اے بادِ بہار
فیضِ وصلِ گل سے تھے سب زمزمے اور چہچہے — کر رہا صیاد اگر سننا ہے گلبانگِ ہزار
دوزخ و جنت ہیں پنہاں تجھ میں اے صہبائے عشق — یا وہ نشے کے مزے تھے یا یہ تکلیفِ خمار
ہم وہی ہیں اور وہی گلشن ہے لیکن گل نہیں — چشم و دل میں اب کھٹک جاتا ہے یہاں ایک ایک خار
ناامیدی چشم و دل پر ہے میرے چھائی ہوئی — میری خاکستر میں اب باقی نہیں کوئی شرار
یاس سا دلسوز تو کب تھا بتا اے داغِ عشق — جل گئے سب دل ہی میں رہ رہ کر کھٹکتے تھے جو خار
اک نہ اک کی راہ ہم دیکھا کیے ہیں عمر بھر — اب اجل کا ہے تمہارا بھی کبھی تھا انتظار
چرخ کے سنگِ حوادث کا نشانہ ہیں ہمیں — اے حصارِ عافیت اے کنجِ تاریکِ مزار

مر گئے پر کون لپٹاتا تھا سینہ سے ہمیں
یہ بھی حسرت تو نے آخر کو نکالی اے فشار

عمر بھر جلتی ہے پروانہ کے سوزِ غم سے شمع
خواب راحت سے مگر ہوتا نہیں وہ ہوشیار

یاد ہے اے زندگی جو کچھ کیا تو نے سلوک
وقت آخر کہہ سنائینگے اجل کو حالِ زار

آے بقائے روح ہر ہر آرزو میں خوف ہے
کیا کریں جب تمنائے اجل میں بھی ہے خار

اب یہی دلسوز اک باقی ہے اے بادِ بہار
تیرے جھونکوں سے نہ بجھ جائے کہیں شمعِ مزار

زور تیرا کیا کہیں اے نشۂ جامِ الست
کاہ سے کوہِ گراں کا تو نے اٹھوایا ہے بار

زالِ دنیا تو نے مردوں کو دیے کیا کیا فریب
تیرا منہہ کالا ہوا ہے تجھ خدا کی تجھ پہ مار

نیک و بد میں کیا تمیز اسکو فلک انصاف کر
عشق کا رہتا ہے جس کے سر پہ کافر سوار

اے زمانِ ہجر تو طولِ امل سے ہے دراز
توبہ رنداں سے بڑھ کر وصل تھا ناپایدار

دولتِ بیدار ہاتھ آ کر گئی ہے خواب میں
کس سے ہم تعبیر پوچھیں اے اجل اے رازدار

شور کر کے کیوں جگاتی ہے ہمیں اے عندلیب
ہو گیا جی سیر ہم نے دیکھ لی گل کی بہار

اے لبِ ساغر تجھے اب منہہ لگائینگے نہ ہم
عیش سے درگذرے جھیلے کون تکلیفِ خمار

گر جدا کرتا ہے اے صیاد کر دے ہم کو ذبح
کس طرح آئیگا مرغِ دست پرور کو قرار

سخت جانی ۔ جیکے فرقت میں موئے ہیں ہم تو بیل
ہم کو دل پر دل کو ہم پر اب رہا کیا اعتبار

تو بھی اے بلبل کبھی گل تھی کبھی صیاد تھی
نالے کیوں کرتی ہے یہ ہے انقلابِ روزگار

جز اشارہ بات کرنی نزع میں ممکن نہیں
میرا مطلب اسکو اب سمجھا دیں میرے رازدار

رازِ الفت کیا چھپے جب دل ہی قابو میں نہ ہو
زور تجھ پر کیا چلے اے گریۂ بے اختیار

بال و پر بلبل کے ہیں اے گل ہوا میں منتشر
مژدہ لاتی ہے سنانے اب کسے فصلِ بہار

کس لئے آغوش کو کھولے ہوئے ہے تو کنار
اپنی کشتی ہو چکی بادِ مخالف کا شکار

حسرتیں گن گن کے کٹتی تھیں جو راتیں اب کہاں
کیا ہوا جادو جو تھا وہ تم میں اے شب ہائے تار

تو نے پتھر کو جلایا جل گئے ہم رشک سے
وہ تری شوخی ہے برقِ طور اب تک یادگار

کس طرح آسان ہو تیغ و گلو کا مرحلہ
کیا کریں اے تشنہ کامی کند ہی خنجر کی دھار

تجھ سے مجنوں! کان میں آکر اجل نے کیا کہا
کیا ہوئی وہ دشت پیمائی وہ سیرِ کوہسار

ناخدا کے ناز ہم کب تک اُٹھائیں یا خدا
ڈوب جائینگے یہیں - درگذری تجھ سے امیدِ کنار

خیر میخانہ کی ساقی ہم کو بھی کر دے خراب
سخت نادانی ہے یہاں مستوں میں رہنا ہوشیار

حوصلہ تیرا پتنگے کو کہاں بلبل نصیب
جل کے ہو جانا ہے ٹھنڈا بیوفائی کا شعار

آفریں ہمت پہ تیری سہتی ہے کس کس کے ظلم
باغباں بد دل - عدو صیاد - دشمن برق و خار

میری کشتی کب تک اے طوفان چکراتی رہے
یا ڈبو دے اسکو یا پہنچا دے ظالم تا کنار

اے طلسم خانۂ زندانِ ہستی ٹوٹ جا
شاہدِ مقصد سے اے یوسف ہو جلدی ہمکنار

توڑ ہی ڈالا تری موجوں نے تو آخر کو دم
اب حوالے ہیں ترے اے بحرِ ناپیدا کنار

آہنِ تیرہ دروں آلودۂ صد زنگ ہے
جذبِ مقناطیس کر اعجاز اپنا آشکار

عمر بھر تڑپا کیا اور ہم کو تڑپایا کیا
ساتھ کیوں لاتے تجھے اے دل جو ہوتا اختیار

کیوں جئیں مر مر کے دل ہی پہ نہ ہو جب اختیار
یوں بھی ناصح ایک دن ہونگے اجل کا ہم شکار

دیکھتا ہوں میں نگاہِ یاس سے وہ قہر سے
اے منجم کیا ستاروں سے رہوں امیدوار

عالمِ غربت میں یارانِ وطن! جب تم نہیں
ہے برابر ہر جگہ گلزار ہو یا خار زار

دور منزل حرص ساماں اور وقتِ شب قریب
کر کرم اے راہزن تا دوش سے اترے یہ بار

اب وہی تو ہے مگر اے جان ہیچ مار آستیں
یاد ہیں وہ دن کبھی جب آتا تھا تجھ پر ہم کو پیار

ہم ترے نیرنگ کے جب ہونگے قائل اے خیال
گر دلِ مردہ بھی دیکھے تیرے جلووں کی بہار

ناصح ناداں نہیں واللہ اسکا نام صبر
مر گیا جب دل ہی کیسا غم کہاں کا اضطرار

اسقدر مایوس کرنا تھا نہ اے ناداں ہمیں
ہو چکے اب اے فلک ہر خوف و غم سے رستگار

دل لرزتا ہی تری قسمت پہ اے مینائے مے
دیکھیے کب تک سنبھالے تجھ کو دستِ رعشہ دار

خواب سے خوش تھے تو اب تعبیر سے گھبرائیں کیوں
ہم کو اب تعبیر در تعبیر کا ہے انتظار

ڈھونڈھتا پھرتا ہے دشت و در میں او دیوانے کیا   محمل لیلیٰ ہی تیرا دل ہی اے مجنون زار
اے دل مرحوم برسوں تک رہا غمخوار تو   بعد تیرے ہم بھی مرجاتے جو ہوتا اختیار
آنیوالی ہے بلا کوئی الٰہی خیر ہو   ورنہ کیوں ہے بے سبب ہم سے زمانہ سازگار
قید کرتا ہے دکھا کر دانہ چرخ مکر کیش   ذبح سے پہلے پلانا آب ہے اسکا شعار
چارہ اپنے درد کا ہم آپ کر گذرینگے یار   جب نہیں اُمید تجھ سے موت کا کیا اعتبار
حق خدمت کر چکا ابر کرم اپنا ادا   برق خرمن سوز کے اب فرض کا ہے انتظار
ہم سے اور ان بن تری کیا مصلحت ہے او فلک   محرم اسرار پنہاں اور رہے اس طرح خوار
رند دریا نوش ہیں ہم دیکھ اے ساقی ادھر   یُوں تو میخانہ میں ہیں تیرے ہزاروں جرعہ آ
شعلہ آواز نے سے لگ گئی تن من میں آگ   غرق مے کردے مجھے اے ساقی حکمت شعا
بجلیوں سے کب ڈرے تھے ہم جو اب ڈر جائینگے   ننگے سر پھرتے ہیں لے اے آسمان ثم الہ بار
ظرف عالی رکھتے ہیں ساقی نہیں منصور ہم   راز پنہاں اور مستی میں ہو ہم سے آشکار!
ڈھونڈھتے ہیں رند ساقی کا پتا ملتا نہیں   العطش کی ہر طرف اس میکدہ میں ہے پکار
بھاگ کر تم سے کہاں جائینگے او چرخ و زمیں   زندہ رہکر یا سہینگے ظلم یا مر کر فشار
بدلے مے کے اب میسر ہے مجھے تلخاب یاس   میکدہ تیرا ہے او ساقی مرا کیا اختیار
روز لاکھوں خون کیوں کرتا یہ جلاد فلک   بر سر خاک او زمیں گر تو نہ ہوتی پردہ دار
گرمی ہنگامۂ دُنیا و دیں ہی تجھ سے عشق   ہے ہر اک شئے ذرہ تو ہے آفتاب نُور بار
جذب ثقلی ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے ترا   دفتر عالم کا شیرازہ ہے تجھ سے اُستوار
راہرو تیرے گذر جاتے ہیں بیخوف و خطر   چاہے دریا راہ میں انکے پڑے یا کوہسار

عبدالرحمن شاطر (از مدراس)

(باقی آئندہ)

غزلِ شاد

جسم کا ساتھ چھٹا آپ سے باہر ہم ہیں
اب تو اپنے لئے اِک غیر سے بدتر ہم ہیں

زندگی جن کے سبب سے تھی وُہ سب چھوٹ گئے
آج تک عالمِ اسباب میں کیونکر ہم ہیں

تھک گئے پاؤں گئی دربدری شکرِ خُدا
اب یُوں ہی تا بہ قیامت ترے در پر ہم ہیں

اِن سوالات کا پایا نہ کہیں ہم نے جواب
کیا ہیں کس واسطے ہیں کون ہیں کیونکر ہم ہیں

حُسن و عشق ایک ہیں ظاہر میں فقط ہیں دو نام
یہ اگر سچ ہے تو کیا اُن کے برابر ہم ہیں

جلوۂ یار پہ ٹھہری رہیں تا دیر آنکھیں
نہ خُدا ہیں نہ امام اور نہ پیمبر ہم ہیں

مُبتدا کی نہ خبر سمجھی ہو تم نے نہ سہی
گر ضمائر پہ کرو غور تو مُضمر ہم ہیں

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یارب
ہر حسیں کو ہے یہ دعوٰے کہ سکندر ہم ہیں

کان مُشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مُدت سے
دید و آواز کہ اِس پردہ کے اندر ہم ہیں

دشتِ اُمّید کی جانب جو بڑھاتا ہُوں قدم
موت آہستہ یہ کہتی ہے کہ سرپر ہم ہیں

عقل سے راہ جو پُوچھی تو پکارا یہ جنُوں
وُہ تو بھٹکی ہُوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

دِل یہ کہتا ہے ہمیں دیکھ کتابوں پہ نہ جا
قدرتِ صانعِ مخلوق کے دفتر ہم ہیں

پھر تو ہو جائینگے بازارِ جہاں میں مہنگے
شاد ارزاں ہیں جبھی تک کہ میسّر ہم ہیں

اصلاح

(۱) اپریل سنہ ۱۹۱۷ء کے رسالے میں سید نذیر حسین صاحب کی نظم بلبلِ شیدا میں ایک دو غلطی رہ گئی ہیں ناظرین درست فرمالیں :-

بند ۳ - شعر ۱ - صحیح :- ترا پیارا سا ....

بند ۳ - شعر ۵ - تو فراقِ ستم آزار سے ....

بند ۴ - شعر ۲ - دِل تڑپتا ہے جو آتے ہیں ....

(۲) جولائی سنہ ۱۹۱۷ء کے رسالے میں حضرت شاد کی غزل کے پہلے شعر میں بجائے تب کے تبت پڑھیں

ایک ضروری اشتہار

اشتہار کے بموجب اگر مال نہ ہو تو دام واپس لیجیے

ہماری یہی دوکان بازار انارکلی میں کئی سال سے نہایت ایمانداری سے کام کر رہی ہے مگر چونکہ بیرونجات کے اصحاب اس سے مستفید نہیں ہو سکتے تھے اسلیے ہم نے اسکے متعلق ایک ایجنسی الموسوم بہ "رشیدیہ ایجنسی" کھولی ہے جسکا کام صرف بیرونجات کے اصحاب کو اپنی اشیاء کا مہیا کرنا ہوگا۔ وقت اور تجربہ دنیا پر ہماری ایمانداری اور خوش معاملگی خود ثابت کر دیگا۔ زیادہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے ایک مختصر سی فہرست اشیا آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ کوئی چیز اگر پسند ہو تو طلب فرمائیے۔

پنجاب کی اعلیٰ صنعت یعنی ملاکا بید کی بے نظیر چھڑیاں۔ چاندی۔ سینگ۔ اور جرمن سلور کی ہنڈل جنکی خوبصورتی مضبوطی اور پائداری کی دنیا بھر میں قدر ہوتی ہے۔

چاندی کی موٹھ کی موٹی گز بھر لمبی [illegible]
" " پتلی ۱۴؍
" ۲۸ انچہ [illegible]
سینگ کے ہنڈل کی موٹی گز بھر لمبی [illegible]
" " پتلی [illegible]
" ۲۸ انچہ ۱۲؍

اعلیٰ درجہ کی ترکی ٹوپیاں معہ پھندنا
درجہ اول [illegible] درجہ دویم [illegible] درجہ سویم [illegible]
درخواست کے ساتھ سر کا نمبر یا ناپ ضرور آنا چاہیے

نہایت اعلیٰ قسم کے ریشمین ازار بند جو ہم نے خاص احتیاط سے اصلی ریشم لے تیار کرائے ہیں
درجہ اول [illegible] درجہ دویم [illegible] درجہ سویم [illegible] نقلی ریشم کے ازار

اگر آپ چائے کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں یا اپنی الماریوں اور مکانوں کی زیبائش چاہتے ہیں تو ملک جاپان کی بنی چینی کی رنگ برنگ پیالیاں اور پھولدان ہم سے منگوائیے۔ جنکی خوبصورتی اور نیز اعلیٰ درجہ کی صفائی اور اعلیٰ صنعت دیکھنے ہی پر منحصر ہے۔ قیمت فی درجن جوڑہ پیالی پرچ [illegible] پھولدان جوڑی [illegible]

جادو کی قلم۔ کہ خود بخود لکھتی ہے ایکدفعہ سیاہی ڈالدو تین دن لکھیگی۔ اور ہر ایک تحصیلدار، ضلعدار، [illegible] منگوائیں [illegible]

ولایتی ہیر آئل۔ اس ہیر آئل میں اعلیٰ درجہ کی خوشبو [illegible] کے علاوہ یہ صفت ہے کہ بالوں کو سفید نہیں ہونے دیتا اور بالوں کو ریشم کی طرح نرم رکھتا ہے اور دماغ کو طاقت دیتا ہے۔ دماغی محنت کرنیوالے اسکی قدر کر سکتے ہیں۔ قیمت فی شیشی صرف [illegible]

عجیب وغریب بال اڑانے کا پوڈر۔ ہمارا ایجاد [illegible] اسکے لگانے سے بجائے سوزش کے ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ اظہار کی ضرورت نہیں تجربہ کر کے دیکھ لیجیے قیمت ۸؍

سر درد کا برقی علاج۔ ۱۲ انچہ کا ایک بکس جب سر درد ہو تو ایک ٹکیہ کھا لو تو [illegible] سر درد [illegible] قیمت فی بکس صرف [illegible]

عجیب وغریب تالہ۔ یہ تالہ ایسا ہے کہ بغیر مالک کے دوسرا اسکو نہیں کھول سکتا۔ درجہ اول [illegible] درجہ دوم ۱۲؍ درجہ سوم [illegible]

مونس القلوب۔ مصنفہ نواب غلام احمد خاں صاحب احمدی [illegible] ایک اخلاقی نظم نہایت دلچسپ [illegible] منگوا کر لطف اٹھائیے

فہرست اشیا جو ہر وقت ہر موسم کے مطابق ہمارے پاس رہتی ہیں: چٹیلیں۔ جرابیں۔ رومال (ریشمی سوتی) تولیہ۔ گلوبند۔ مفلر۔ سویٹر۔ سوتی اونی ریشمی ازاربند۔ کالر اور نکٹائی۔ صابن اعلیٰ درجہ کی ولایتی دستی گھڑیاں۔ لیونڈر۔ سینٹ۔ خوشبودار تیل۔ [illegible] برش (بالوں کے۔ سر کے حجامت کے۔ دانتوں کے بوٹ کے) کتوں کے پٹے۔ سیپ کے بٹن [illegible] سگرٹ وسگار کیس۔ سگرٹ وسگار ہولڈر۔ ولایتی و دیسی شیشے۔ تصویریں۔ تصویروں کے فریم عمدہ عمدہ [illegible] بوٹ۔ کھلونے۔ بچوں کے کھلونے۔ گیند۔ چمچ۔ دانتوں اور بدن کے پوڈر۔ سٹیشنری قلم۔ دوات [illegible] سیاہی [illegible] نہایت عمدہ عمدہ قسم کے [illegible] ولایتی قلمدان۔ نب۔ چاقو۔ کاپیاں [illegible] علاوہ ان اشیا کے اگر کوئی صاحب لاہور کی کوئی چیز مثلاً کپڑا [illegible] منگوانا چاہیں تو ہم بہت کم کمیشن لیکر روانہ کر سکتے ہیں۔ المشتہر محمد رشید [illegible] لاہور [illegible]

اڑھائی روپیہ میں حکیم حاذق یعنی

"پاکٹ کیس ادویات جوہری"

جس سے ہر ایک شخص پورے حکیم کا کام لے سکتا ہے

منظور شدہ عالیجناب لارڈ کرزن صاحب بہادر وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند

مصدقہ ڈاکٹران یورپ حکمائے یونان و رؤسائے ہند ایڈیٹران اخبار و نوابان راجگان و جاگیرداران

خدا شاہد ہے

کہ اس بکس کے ذریعہ آجتک مختلف امراض کے تخمیناً ایک لاکھ مریض شفا پاچکے ہیں۔ (سندات قابل ملاحظہ ہیں)

پانچ اور دس روپے والا **پاکٹ کیس** تو چودہ پندرہ سال سے جاری تھا ہی مگر اب ہزارہا شائقین کی تحریک پر ایک اور چھوٹا پاکٹ کیس **اڑھائی روپے** والا اس غرض سے تیار کیا ہے کہ ہر ایک امیر و غریب اس سے فائدہ اٹھا سکے + اس چھوٹے پاکٹ کیس میں بھی وہی مختلف **پچاس بیماریوں** (مندرجہ حاشیہ) کی نہایت مجرب ادویہ جو تخمیناً سو ڈیڑھ سو مریض کے لئے کفایت کریں موجود ہیں۔ اسکا پرچہ ترکیب استعمال جو ہر پاکٹ کیس کے ساتھ بھیجا جاتا ہے ایسا عام فہم ہے جو ہر ایک کی سمجھ میں بخوبی آجائے۔ یہ عجیب و غریب پاکٹ کیس بڑی جانفشانی سے انگریزی و یونانی ادویات کے جواہر کو ترکیب دے کر ان اشخاص کے لئے تیار کیا گیا ہے جو اکثر سفر یا ایسے مقاموں میں رہتے ہیں جہاں حکیم یا ڈاکٹر وقت پر نہ مل سکیں۔ یا ان عیالداروں کے لئے جنکو اکثر شکایتوں کے واسطے حکیموں یا ڈاکٹروں کے پیچھے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے یا ان غربا نوازوں کے لئے جو خلق خدا کو فی سبیل اللہ ادویہ تقسیم کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ایک انسان کے لئے گویا بغل میں حکیم حاذق ہے جس سے واقعی وقت پر پورے حکیم کا کام لے سکتا ہے۔ بڑے بڑے نامی حکیموں اور ڈاکٹروں نے بھی اسے زبدۃ الحکمت مان لیا ہے۔ کیونکہ اکثر صاحب پیشہ اصحاب اب اسی کی ادویات سے مریضوں کا علاج کرکے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بکس خورد (۲/۸) - درمیانہ (۵) - کلاں (۱۰) علاوہ محصول بذمہ خریدار

المشتہر

حکیم ڈاکٹر چراغ الدین جہلمی ایل ایم ایس مرجن اینڈ فزیشن امرتسر (پنجاب)

نوٹ:- ملاحظہ فرمائیے کہ اگر یہ پاکٹ کیس پسند نہ آئے یا استعداد قلیل تم پر نہ جچے یا ادویہ پُر تاثیر نہ ہوں تو واپس کر کے پوری قیمت لوٹا دیجاوے

بنپستی تیل

یہ تیل ہیضہ۔ جلن۔ پیشاب کا بار بار آنا و ہر قسم کے امراض مثانہ کو دور کرتا ہے۔ آگ دودھ یا گرم پانی سے یا بارود وغیرہ کے جلے ہوئے پر۔ نیز بچھو۔ بھڑ۔ مچھر کھٹمل۔ ڈانس وغیرہ کے کاٹے ہوئے کو پھوڑا پھنسی۔ کھاج گھمام (بٹ ۔۔) تمام جلدی بیماریوں کے لیئے بہتر از تریاق ہے۔ باوجود ان سب خواص کے جسمیں ایک اونس تیل ہوگا۔ قیمت ایک شیشی عہ محصولڈاک ۳ر نمونہ کی شیشی ۲ر ۲ اونس کی شیشی ہو محصولڈاک ۲ر

سرٹیفکٹ (۱) خان بہادر ڈاکٹر امیر شاہ صاحب ایل۔ ایم۔ ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور تحریر کرتے ہیں۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ مینے پنڈت ہیمراج وید وشارد کا تیار کردہ بنپستی تیل جو مینے استعمال کیا ہو۔ مثانہ کے متعلق و ہیضہ کے روگوں کے لیئے بہت مفید ہے۔ دستخط امیر شاہ اسسٹنٹ سرجن جولائی ۱۹۰۳ع

(۲) رائے کدار ناتھ صاحب میڈیکل آفیسر وسول سرجن کرنال ۹ اگست۔ پنڈت ہیمراج وید کا بنپستی تیل ہیضہ کی مرض کے واسطے نہایت ہی عمدہ دوائی ہے۔

(۳) رائے صاحب گنپت رائے بیرسٹرایٹ لا میونسپل کمشنر لاہور۔ مسٹر روشن لال بی۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا لاہور کی سفارش سے مینے پنڈت ہیمراج وید وشارد کو حال کی بیماری میں بلایا انہوں نے کا سارت شربت و جورناشک چورن و بنپستی تیل کا استعمال کرایا جنکا اثر مجھپر بہت ہی تعجب خیز ہوا۔ یہہ پہلی دفعہ تھی کہ مینے ایک وید کا علاج کیا۔ اور میں نتیجہ کرتا ہوں کہ آئندہ ہمیشہ پنڈت جی سے ہی دوائی کرایا کرونگا۔

(۴) بابو لبھو رام صاحب مختار عدالت پھلور ضلع جالندھر۔ شریمان پنڈت جی نمستے۔ آپکے بنپستی تیل کا ایک ہیضہ کے کیس پہ استعمال کیا تو مفید پایا۔ صرف دوسری خوراک پر ہی مریض کو نیند آگئی۔ اسلیئے میں نہایت مشکور ہوں۔

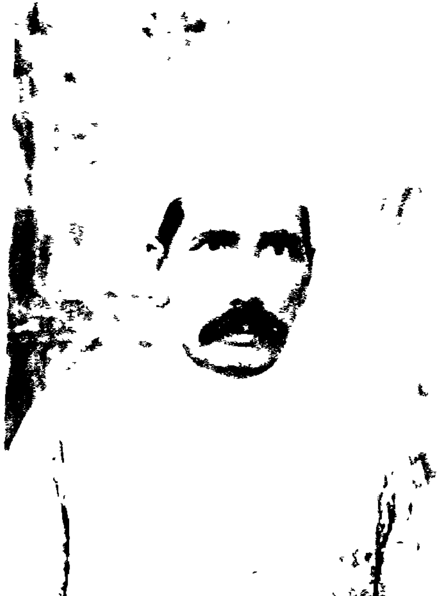
آپکا داس لبھو رام مختار پھلور ضلع جالندھر ۲۰ جولائی ۱۹۰۳ع

المشتہر

پنڈت ہیمراج وید وشارد منیجر اخبار بھارت بھگنی لوہار منڈی لاہور



سید ناصر کنتوری عرف جداں صاحب [illegible]



سید محمد کاظم صاحب کنتوری یادگار ناسخ مرحوم

معاونینِ مخزن

کو

معلوم ہو کہ اگلے پرچہ سے مخزن کی آٹھویں جلد شروع ہوگی - لوگ عموماً سال بھر کی ایک جلد رکھتے ہیں۔ مگر ہم نے ششماہی کی جلد کو دو وجوہات سے پسند کیا تھا - ایک تو یہ کہ مخزن کے روزافزوں حجم کا لحاظ کرکے سال بھر کی جلد موزوں نہیں رہتی تھی خصوصاً وہ جو اوّل قسم کے دبیز اور چکنے کاغذ پر چھپتی ہو۔ دوسرے یہ کہ رسالوں اور اخباروں کے خریدار اور معاون اکثر نئے سال کے آغاز میں خاص توجہ کا اظہار کرتے ہیں۔ پس قدرتی طور پر مہتممانِ اخبارات کے لئے نئے سال کا آغاز روزِ عید ہوتا ہے اور کون نہیں چاہتا کہ روزِ عید سال میں ایک کی جگہ دو اور دو کی جگہ چار دفعہ آئے۔ خوشی کا دن ہوتا ہے۔ شیرینیاں تقسیم ہوتی ہیں اور تحفے بٹتے ہیں۔

اے خوشی آ تیرے آنے سے زمانہ روشن

آکہ تو آپ ہے روشن تیرا آنا روشن

مخزن کے لئے بہترین تحفہ جو ہمارے کرم فرما بھیج سکتے ہیں۔ ایک نیا **خریدار** ہے۔ اگر ہر معاون یہ ارادہ کرلے کہ مخزن کی ہر سالگرہ پر ایک نیا خریدار اس کے لئے بھیجونگا۔ تو دنوں میں اسکی تعدادِ اشاعت ہزاروں تک پہنچ جائے۔

جو حضرات اس پرچہ کو پسند فرماتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اُن سے درخواست کیجاتی ہے۔ کہ نئی جلد کے آغاز کا خیر مقدم کسی اپنے دوست کا نام فہرستِ معاونین میں درج کرانے کے ذریعہ فرمادیں۔ یہ نہ صرف ہمارے حال پر عنایت ہوگی بلکہ اس پرچے کے استحکام کا باعث ہوگا۔

ہم نے اس پرچہ کو ۴۸ صفحوں سے شروع کیا تھا۔ اور اُسوقت کوئی پرچہ ان خوبیوں کے ساتھ اتنے حجم کا ایسی ارزاں قیمت پر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اب ہم بڑھاتے بڑھاتے اسی قیمت میں اسے ۸۴ صفحہ پر لے آئے ہیں۔ اس اُمید سے کہ رسالے کے قدردان خریداروں کی تعداد بڑھا کر مصارف کی زیادتی کی تلافی کردینگے۔ مگر یہ اُمید تاحال پوری نہیں ہوئی۔ تعداد ایک حد پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ ہمارے خیال میں کئی قسم کی اور ترقی اور عمدگی کی تجویزیں ہیں جن میں ایک کا اظہار انگلستان میں چھپی ہوئی تصویریں بھیج کرنے سے ہو رہا ہے۔ اور ہم ان سب کوششوں کا نتیجہ صرف ترقیِ خریداران سے چاہتے ہیں۔ لیکن اگر اسطرف ہمارے دوستوں نے کافی توجہ نہ فرمائی۔ تو نہ صرف سب تجویزیں دل کی دل ہی میں رہجائینگی۔ بلکہ رسالہ کی ترقی رک جائیگی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اسکے قدردان کبھی یہ رکاوٹ گوارا نہ فرماوینگے۔ اور اسکے حق میں کوشش کرنے سے دریغ نہ کرینگے۔

ہم نے آجتک یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو میں طاقتِ نمو ہے۔ اُردو میں لکھنے والے موجود ہیں۔ انگریزی خواں بھی اردو لکھ سکتے ہیں اور خوب لکھ سکتے ہیں۔ اُردو نثر میں بھی خیالات ہر قسم کے ظاہر ہوسکتے ہیں اور نظم میں بھی۔ پرانے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں اور نئے بھی۔ اور اس رسالہ کے اجرا سے ایک عام تحریک اُردو جرنلزم میں ترقی کرنے کی پیدا ہوگئی ہے۔ اتنا نتیجہ تو اُس حوصلہ افزائی کا ہوا ہے جو آپ حضرات نے آج تک کی۔

آؤ ہمت بڑھایئے

اور دیکھئے کہ

ابھی اور کیا کچھ ہوسکتا ہے۔

مخزن

عروس البلاد

لندن

میرے ایک مہربان بزرگ نے مجھے ہندوستان سے چلتے وقت خط لکھا۔ کہ لنڈن جاتے ہو۔ آخر عروس البلاد" کا جادو تم پر بھی چل گیا اور تم بھی اس کی طرف کھنچ گئے۔ خدا جانے اس شہر میں کس بلا کی کشش ہے معلوم نہیں۔ یہ خطاب لنڈن کو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔ یا ہمارے فاضل دوست کی طبع ایجاد پسند کا نتیجہ ہے۔ مگر مجھے یہ مناسب معلوم ہوا۔ کہ لنڈن کے متعلق مضمون لکھنے کے لئے یہ عنوان اختیار کر لیا جائے۔ کیونکہ نرا "لندن" تو کچھ روکھا پھیکا سا عنوان ہے۔ گو میں نہیں کر سکتا کہ دارالسلطنت انگلستان کس حد تک اس خطاب کا مستحق ہے۔ عروس کے لفظ سے جو پہلا خیال آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ خوبصورتی یا آراستگی ہے اور اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شاید پیرس اس خطاب کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر آراستہ۔ بانکا اور طرحدار شہر نہیں ہے۔ اور جو ایک اٹھتی سے جھلک پیرس کی ادھر آتے ہوئے ہمیں نظر آئی ہے۔ وہ نہایت دلکش تھی۔ لندن اس کے مقابل میں خوبی اور بانکپن میں نہیں جنچتا۔ ہاں لندن باعتبار اپنی عظمت و شان اور کثرت آبادی و تجارت کے ایک حیرت انگیز ہے۔ اور اس حیثیت سے جو نام بھی اسے دیدیا جائے بجا ہے

ہے۔ ایک نصف کروڑ کی آبادی - جس میں زن و مرد لڑکے لڑکیاں سب باہر چلنے پھرنے والے ہیں - جس قدر ہجوم کوچہ و بازار میں پیدا کرسکتی ہے - ظاہر ہے - اور اس انبوہ کثیر کے اِدھر اُدھر آنے جانے کے لئے جتنی ضرورت سواری کے سامان کی ہوگی - وُہ بھی محتاج بیان نہیں - اور یہ سب اہتمام اس عمدگی اور ارزانی سے کیا گیا ہے کہ بیساختہ حُسن انتظام کی داد دینی پڑتی ہے - اتنی آبادی کے لئے مکان بہم پہنچانا ایک اہم مسئلہ ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ اسے انگلستان بھی باوجود اپنی بیشمار دولت کے پُوری طرح حل نہیں کرسکا - مکان کے جو معنے مشرق میں لئے جاتے ہیں - اُس معنے میں سوائے امرا کے یہاں بہت کم لوگ مکان رکھتے ہیں - ایک ایک گھر میں کئی کُنبے بستے ہیں - اکثر کے پاس تو ایک کمرہ ہوتا ہے - اور بہت سے ایسے بھی بدقسمت ہیں جو اتنا بھی آسرا نہیں رکھتے - جہاں رات ہوگئی - وہاں ہی گھر ہے - جابجا کمرے رات بھر کے لئے کرایہ پر ملتے ہیں - جنہیں بستر مل جاتا ہے - کرایہ دیا - پڑ رہے - اور صبح ہوتے ہی پھر چل کھڑے ہُوئے - اِنکے سوا ایک اَور جماعت ان سے بھی زیادہ بدنصیب ہے - ان کے پاس اس طرح بستر کرایہ پر لینے کی بھی توفیق نہیں - اور وُہ رات یُونہی چل پھر کر کاٹ دیتے ہیں اور دن کو بنچ وغیرہ پر جو کہیں کہیں رہگزروں کے آرام کے لئے رکھے رہتے ہیں پڑے اُونگھتے ہیں - گرمی کے دِن تو اِنکے خیر کٹ جاتے ہیں - جاڑا آتا ہے تو بلا آتی ہے - بیسیوں ٹھٹھر کے رہ جاتے ہیں اور قید زیست سے آزاد ہو جاتے ہیں - اور سینکڑوں کی جان یُوں بچتی ہے - کہ سرکاری طور پر انتظام کیا جاتا ہے - کہ ہر محلے میں ایک بڑا کمرہ گرم کیا جائے - ملازمانِ پولیس انہیں گھیر گھار کے آگ کے گرد لیجا بٹھاتے ہیں اور آگ تاپتے ہوئے یہ لوگ رات بھر بیٹھے رہتے ہیں اور دن ہوتے ہی - پھر یہ ہوتے ہیں اور اِن کی آوارہ گردی اور بیکاری - دولت اور جاہ و حشمت کا جو نظارہ لندن کے مغربی حصّے میں نظر آتا ہے - وُہ بھی دو تین اور مغربی شہروں کے سوا کہیں دُنیا بھر میں نظر نہیں آسکتا -

لیکن تنگدستی۔ افلاس اور بدقسمتی کی جو دلخراش تصویر لنڈن کا مشرقی حصہ پیش کرتا ہے اس کا بھی نظیر دُنیا میں ملنا محال ہے۔ ہمارا مُلک بحیثیتِ مجموعی بیشک مفلسی کا شکار ہے اور ہماری قوم دولتمند نہیں۔ مگر نہایت مالدار لوگوں کی ہمسائیگی میں اس درجہ کی بیکسی اور بے بسی ہمارے ہاں نہیں۔ اور اگر اس زمانہ میں جاہ و ثروت کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ قوم کا ایک حصہ بالکل خوار خستہ ہوجائے تو ہم ایسی ثروت سے باز آئے۔

لنڈن دن کے وقت - مَیں یہاں ۲۹ مئی کی رات کو پہنچا تھا۔ اُس وقت تو سفر کی ماندگی غالب تھی اور ٹھکانے کی فکر تھی۔ کیا دیکھ سکتے تھے۔ قریب ترین ہوٹل میں پڑ رہے صبح ہوتے ہی شوقِ سیر نے گدگدی کی اور میں باہر نکلا۔ کرایہ پر جو یہاں گاڑیاں چلتی ہیں۔ اُن میں سب سے مقبول اور پُرانی چیز ایک ہے جسے اُمنی بس یا صرف بس کہتے ہیں۔ اُنکی بدولت یہاں بڑا آرام ہے۔ ورنہ ایک حصہ شہر میں اور دُوسرے میں میلوں کا فاصلہ ہے۔ پاؤں پیادہ چلو تو دن ختم ہوجائے اور معمولی اکیلی سواری کی گاڑی ڈھونڈھو تو جیب خالی ہوجائے۔ انکا یہ ہے کہ آنہ دو آنے دیئے اور جا پہنچے۔ بارہ آدمی اندر اور چودہ آدمی چھت پر بیٹھ سکتے ہیں۔ اور صبح سے لیکر رات کے گیارہ بارہ بجے تک بھری ہُوئی نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلی جو بس ملی۔ اُس پر سوار ہولیا اور لنڈن پر ایک سرسری نظر ڈالنی شروع کی۔ پہلا نقش جو میرے دل پر ہُوا۔ وُہ کسی قدر مایوس کرنے والا تھا۔ مَیں نے کہا یہی لنڈن ہے۔ جسکی اتنی تعریفیں سُنتے تھے اور یہی ہے۔ جس کا نام ہمارے عنایت فرمانے عروس البلاد رکھا تھا۔ انکے خیال میں عروس ہو تو معلوم نہیں۔ ہمیں تو عجوز البلاد کی پھبتی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ جدہر نظر جائے اُونچی اُونچی عمارتیں دھوئیں اور کثرتِ نم سے سیاہ۔ سڑکیں سیاہ۔ ہوا میں سیاہ ذرات۔ سانس لو تو سیاہی حلق اور نتھنوں میں گھس جائے۔ رومال سے صاف کرنا چاہو تو رومال سیاہ ہوجائے۔ بعض عمارتیں جو نئی تھیں وُہ بھی اس رُوسیاہی کے دھبے سے خالی نہ تھیں۔ پُرانی تعمیروں کا تو کیا کہنا۔ پُرانی تاریخی عمارتیں۔ جیسے

سنٹ پال کا گرجا۔ وسٹ منسٹر کا قبرستان۔ پارلیمنٹ۔ قصر بکنگھم سب سیاہ نظر آئے۔ اوپر سے مطلع بھی ابر آلود تھا اور ترشح بھی جاری تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک مشرقی آنکھ پر جو سنگ سرخ اور سنگ سفید کی صدیوں میں رنگ نہ بدلنے والی عمارات کے نظارہ کی عادی ہو۔ ایسے اسباب کا سوائے مایوسی کے اور کیا اثر ہو سکتا تھا۔ یہ نہیں کہ میں ان عمارات کی ساخت اور ان کے نقشے کی عمدگی یا ان کی غیر معمولی بلندی کی تحسین نہیں کرتا تھا۔ لیکن چونکہ میرا علم تصاویر پر مبنی تھا۔ اور تصاویر عمارات کی خوبی کو دکھاتی تھیں اور سیاہی کے بدنما داغ کو چھپاتی تھیں۔ اِس لئے میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ ان چیزوں کو جیسا سنتے تھے نہ پایا۔ بعد غور حقیقت یہ کھلی۔ کہ لندن اس بارہ میں معذور و مجبور ہے۔ اگر لندن کو لندن بننا تھا تو اسے عمارات کے ظاہری حسن سے بے پرواہ ہونا بھی لازم تھا۔ اِس شہر کی بڑائی منحصر ہے۔ اس کے مرکز تجارت ہونے پر اور تجارت یہاں منحصر ہے صنعت پر اور صنعت کلوں پر اور کلیں دخان پر۔ ہزاروں لاکھوں چھوٹے بڑے انجن ہیں جو شب و روز چل رہے ہیں۔ اور دھواں اُن کی چمنیوں سے نکل کر ہوا میں مِل رہا ہے۔ اس کے علاوہ گھر گھر میں ایک دود کش ہے۔ اور باورچی خانہ یا انگیٹھی کا دھواں دود کش کے ذریعے اوپر جا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ ہندوستان کے عام گھروں کی طرح چھتیں اور کڑیاں دھوئیں کے مارے سیاہ روغن سے رنگی جا رہی ہیں۔ یہاں گھروں میں جالے اور دھوئیں کا نشان نہیں۔ ہر کمرہ میں فرش ہے۔ ہر دیوار پر کاغذ منڈھا ہوا ہے۔ ہر چھت اندر کی طرف سفید کپڑے سے ڈھنپی ہے۔ زینوں میں بانات وغیرہ لگی ہے۔ دروازہ میں فرش ہے۔ غرض صفائی کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا ہے۔ پس جب کارخانوں سے بھی اور گھروں سے بھی ہر وقت دھوئیں کے بادل اُٹھتے رہتے ہیں۔ تو ہوا کیا کرے۔ کیونکر صاف رہے۔ اور جب ترشح شروع ہوتا ہے یہ کالے ذرات بھاری ہو کر مکانات اور زمین پر بیٹھنے لگتے ہیں اور مکانات کو باہر سے دنوں میں سیاہ کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنی پرانی کوئی عمارت ہے۔ اتنا ہی گہرا پردہ

سیاہی کا اُس پر پڑا ہوا ہے اور جو نگاہ رنگ کی خوبصورتی کو ڈھونڈھتی ہے۔ اُسے یہاں کے باشندوں کے سرخ و سپید چہروں کے غازے سے تازگی حاصل کرنی چاہیئے نہ کہ عمارات سے*

ایک نقش تو لندن کو دن کے وقت دیکھنے سے یہ ہوا۔ کہ یہ کچھ کالا کلوٹا سا شہر ہے۔ اور دُوسرا یہ کہ نہایت مصروف شہر ہے۔ جس شخص کو دیکھو دوڑا جا رہا ہے دوپہر کے قریب کاروبار کا زور ہوتا ہے۔ اُسوقت کسی بازار میں ایک آدمی بھی مشکل سے ایسا نظر آتا ہے جو آہستہ چل رہا ہو۔ کیونکہ سب تیز چلتے ہیں اور جو آہستہ چلنا چاہے۔ اس کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ ضرور دھکے کھائیگا۔ یہاں تو یہی ہو کہ راستہ لیتا جائے اور راستہ دیتا جائے۔ آہستہ خرامی کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ تیزروی کی زبردست رَو اسکو یُوں بہالیجائے گی۔ جیسے خس و خاشاک سیلاب کے آگے آگے چل پڑتے ہیں۔ روزِ محشر کی نفسا نفسی تو مدتوں سے سُنتے تھے۔ یہاں ہر روز قیامت کی گرم بازاری ہے۔ عجب سبق حاصل ہوتا ہے۔ ع رہا جو پس کارواں رہ گیا*

علاوہ بریں لندن دن میں نہایت بھلا مانس شہر ہے۔ کسی کو کسی سے مطلب نہیں۔ ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہے۔ بازاروں میں نہ صرف کاروباری لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ بلکہ اُمرا اور شرفا اور اُنکی بیبیاں اور بچے سب اپنا سامان خریدنے کے لئے نکلتے ہیں۔ ہر شخص دُوسرے سے اخلاق سے گفتگو کرتا ہے۔ خواہ اجنبی ہو۔ اور لوگ مسافر کو بہت توجہ سے راستہ بتاتے ہیں۔ دُنیا کے ہر حصے کے لوگ فرانسیسی۔ ارمنی۔ جرمنی۔ گبرو ترسا و یہود۔ ہندی۔ چینی۔ جاپانی۔ زنگ و عرب و حبش۔ غرض ہر رنگ کے لوگ اور ہر زبان کے بولنے والے اس زمانۂ جدید کے بابل کے گلی کوچوں کی رونق کو بڑھاتے ہیں۔ شہر کے باغات اور پارک دن کے وقت (سوائے تعطیل کے اوقات کے) کس مپرسی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ البتہ شام ہوتے ہی اُدھر رجوع خلائق ہوتا ہے

اور ہر باغ میں ہزارہا لوگوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔ کوئی وعظ سُنتے ہیں۔ کوئی مذہبی گیت گاتے ہیں۔ کوئی گھاس پر لیٹتے ہیں۔ کوئی باجا سُنتے ہیں۔ کوئی بنچوں پر بیٹھے ہوئے دن کی کوفت ہٹاتے ہیں اور کوئی ورزش کے لئے چکر لگاتے ہیں۔ مگر شام کے بعد کا نقشہ ہی اور ہے ۔

لندن رات کے وقت ۔ رات کو وہ دن کا کالا کلوٹا لندن ہی نہیں رہتا۔ سیاہی کو تو سیاہیِ شب ڈھانپ لیتی ہے۔ اور روشنی تاریکیِ شب سے فائدہ اُٹھا کر دوگنی آب و تاب سے چمکتی ہے۔ ہر ہوٹل۔ ہر تھیٹر۔ ہر میخانہ ایک بُقعہِ نور نظر آتا ہے۔ ان مقامات کو روز ایسی ایسی ترکیبوں سے روشن کیا جاتا ہے۔ جیسے ہم کبھی کبھی دیوالی یا شب برات کی تقریبوں یا جشنِ شاہی وغیرہ کے لئے چراغاں کرتے ہیں۔ قطار در قطار چراغاں کوئی لال۔ کوئی ہرے۔ کوئی پیلے شیشوں کے پیچھے رکھے ہوئے عجب بہار دکھاتے ہیں۔ بعض جگہ ایسے انداز سے روشنی کیجاتی ہے کہ دکان کا نام نشان آتشیں حروف میں دُور سے نظر آئے۔ بعض اور بھی ستم کرتے ہیں۔ ایسی کل رکھ دیتے ہیں۔ کہ حروف دم بدم بدلتے رہیں اور اس طرح ہر وقت انکے کارخانہ کا اشتہار ہوتا رہے۔ آدھی آبادی ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہے۔ بعض مجبور ہیں کہ اور سامان نہیں رکھتے اور بعض شوقیہ جاتے ہیں۔ جو شوقین ہیں۔ وہ ایسے ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ جہاں پندرہ بیس روپے ایک وقت کے کھانے میں اُڑ جاویں۔ نو بجے تک سب لوگ ہوٹلوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں اور اسوقت سے تھیٹروں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ یہاں ایک بجے تک تھیٹر میں نہیں بٹھا رکھتے و گیارہ بجے سب ختم کر دیتے ہیں۔ یہ وقت لندن کی عیاشی اور آوارگی کا ہے۔ جو لوگ دن کو نہایت مصروف نظر آتے تھے۔ اُن میں سے اکثر اسوقت فارغ البال دکھائی دیتے ہیں۔ رفتار میں اٹکھیلیاں ہیں۔ نظر میں بیقراری اور جستجو ہے۔ دل میں شوق اور بدن میں مصنوعی حرارت

جو آتش سیال سے پیدا کی گئی ہے - اِسوقت ان سے ذرا بچ کر نکلنا چاہئے - پولیس کو بھی اسوقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے - طرح طرح کے کیسہ بُر اسوقت اپنے شکار کے لئے نکلتے ہیں چند بازار دُنیا بھر کے بدمعاشوں کا مرجع ہیں - اور وہاں جو اکیلا دُکیلا مسافر اُنکے ہتھے چڑھ جائے تو اُنکی چاندی ہے - اسوقت جو لنڈن کی ظاہری خوشنما زینت ہو اسکو دیکھ کر بیشک اُسے عروس کا خطاب دیا جا سکتا ہے - مگر اس کے ساتھ جو آوارگی لگی ہوئی ہو - اُس کے باعث اسے ایک اصلی اور باعصمت عروس نہیں کہہ سکتے - بلکہ وُہ عروس جس کی شان میں یہ کہا جا سکے ع

کہ ہر بامداد ش بُود شوہرے ❖

لندن کے ذرائع سفر - لنڈن کے مختلف حصّوں کے درمیان جو مسافت ہو اس کے بعد کا ذکر میں کر چکا ہوں - اب دیکھنا یہ ہے کہ وُہ ذرائع کون کون سے ہیں جن سے لوگ اِدھر اُدھر سفر کرتے رہتے ہیں - کوئی کاروبار والا آدمی یہاں ایسا نہیں جو دن میں تیس چالیس میل کا سفر شہر کے اندر اندر ہی نہ کرتا ہو - اس کے لئے کیا بندوبست ہے - ایک ذریعہ کا تو ذکر آ چکا ہے - یعنے بس - یہ گاڑیاں چار ہزار کے قریب ہیں - جن کے لئے تیس ہزار گھوڑے کمپنیوں کو رکھنے پڑتے ہیں - اور اُنکی اوسط آمد اڑھائی سو روپیہ فی ہفتہ ہے - اِن کے سوا گاڑیاں ہیں - جن کی تعداد پچھلے سال کے شمار کے مطابق بارہ ہزار کے قریب تھی - آٹھ ہزار دو پہیہ اور چار ہزار چو پہیہ - اِن پر تیرہ چودہ ہزار کوچوان مقرر ہیں - جن کی اوسط آمدنی روزانہ پندرہ روپیہ فی کس ہے - ان کے علاوہ کئی ریلیں ہیں - بعض زمین کے اوپر چلتی ہیں اور بعض نیچے ❖

ہر دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے بعد گاڑی چھوٹتی ہے - اور اس پر بھی بعض اوقات جگہ پانی مشکل ہوتی ہے - ریلوں کے سوا ایک اور تہ زمینی گاڑی ہے - جو بجلی کے زور سے چلتی ہے - یہ سارے شہر میں تو نہیں جاتی لیکن شہر کے آباد ترین حصّوں کے نیچے پھر نکلی ہو اور ہر دو تین منٹ کے بعد اس کی بھری ہُوئی ٹرین چلتی رہتی ہے - کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ

ہم زینے سے اُتر کر نیچے جا رہے ہیں کہ گاڑی آئی اور نکل گئی۔ مگر تین چار منٹ سے کبھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ دوسری گاڑی آگئی۔ اب موٹر گاڑیاں بھی کرایہ پہ ملنے لگی ہیں اور کئی حصّوں میں ٹریم بھی زور شور سے چلتی ہے۔ ٹریم بجلی سے چلنے والی بھی ہے اور وہ بھی ہے جسے گھوڑے کھینچتے ہیں۔ اور ابھی شکایت ہے کہ سامان سواری کا کم ہے۔ ٹریم کی اور بجلی والی تہ زمینی ریل کی توسیع ہونی چاہیئے۔ مگر یہ سارا اہتمام تو عوام کے لیئے ہے۔ خواص کی جو اپنی دو اسپہ اور چار اسپہ بگھیاں۔ اور بانکی موٹر گاڑیاں ہیں۔ اُن کا تو کچھ شمار ہی نہیں +

لندن کا طریق دُکانداری - حرکت اور برکت کا یہ زور شور جس کا ذکر اُوپر ہوا سب تجارت کے باعث ہے۔ اور تجارت ہی میں انگلستان کی بڑائی کا راز پنہاں ہے۔ تجارت کے اُن شعبوں کا ذکر جن سے یہاں کے بڑے کارخانے اور جہازوں کے قیام گاہ آباد ہیں۔ تو علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ سر دست اس کے ایک چھوٹے سے حصے کو لیتا ہوں۔ یعنی دُکانداری۔ جُوں جُوں یہاں کے کاروبار کے اس حصّے کو دیکھتا ہُوں۔ دِل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ ہو کہ اپنے ملک کے دُکانداروں کی ایک جماعت کو یہاں لا کر یہ نمونہ دکھاؤں۔ کہ اس طرح کام کرنا چاہیئے۔ پہلی چیز جو دیکھنے اور اخذ کرنے کے قابل ہے۔ وُہ دُکان سجانے کا طریق ہے۔ ہر دُکان کے باہر ایک بڑا دروازہ شیشہ کا لگا ہوا ہے۔ جس میں تمام اُن چیزوں کے نمونے جو دُکان کے اندر مل سکتی ہیں۔ قرینے سے سجے ہیں اور ہر جنس پر قیمت لکھی ہوئی ہے۔ ہر شخص جو گذرتا ہے۔ دیکھنے کو ٹھہر جاتا ہے۔ گویا ہر دُکان بجائے خود ایک اشتہار مجسّم ہے۔ گو وُہ اس اشتہار پر قناعت نہیں کرتے۔ اشتہار کے اور وسائل بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص یونہی سجاوٹ کی کشش سے دیکھنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی چیز کھُب جاتی ہے۔ یا اُس کی قیمت جچ جاتی ہے اور وُہ اندر جا کر اُسے خرید لیتا ہے۔ اس صفائی کے شوق

سے بازار کی خوبصورتی میں ترقی ہوتی ہے۔ چیزیں خراب نہیں ہوتیں اور دُکان کی رونق بڑھتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں بڑے شہروں کے بڑے بازاروں میں ہر شخص جو نئی دُکان بنائے اُس میں اس خوبی کا التزام کرے جیساکہ وہاں بھی بعض انگریزی دکانوں کی ساخت میں کیا جاتا ہے تو کرایہ دار کو بھی فائدہ ہو اور مالک دُکان کو بھی۔ مگر جو بات اس سے بہت بڑھ کر ضروری یہاں کی دُکانداری میں ہے۔ وُہ اِن دُکانداروں کی تربیت ہے۔ انکو یہ سکھایا گیا ہے کہ گاہک کا دِل خلق اور تواضع سے موم کرلو۔ گاہک دُکان میں گھسے تو فوراً دکاندار اُس کی طرف دوڑا آئیگا۔ اور لفظ "سر" کا جس کے معنے جناب یا حضور ہیں۔ ایک تار باندھ دیگا۔ چاہے گاہک پھٹے کپڑے پہنے ہُوئے ہو۔ مَیں نے بعض دفعہ ہندوستان میں دیکھا ہے۔ کہ سفید پوش گاہک کی تو عزّت کیجاتی ہے چاہے دو پیسے بھی نہ کھٹواسکے اور غریب الحال گاہک کو خواہ وُہ مفید ہی کیوں نہ ثابت ہو کم نگاہی سے دیکھا جاتا ہے۔ ہرچند کہ یہاں کپڑوں سے انسان کی بابت رائے لگانے کا بڑا ہی رواج ہے۔ مگر دُکاندار کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کے لئے ہر گاہک "سر" ہے۔ اور بات بات میں یہ لفظ ڈالا جاتا ہے۔ اگر آپ بوٹ والے کے ہاں جاویں تو وُہ اپنے ہاتھ سے آپ کا جُوتا اُتاریگا اور پھر اپنے ہاتھ سے دُوسرا جوڑا پہنائیگا۔ اگر آپ کئی جوڑے ناپسند کردیں تو وُہ اور لیتا آئیگا اور تیوری پر بل نہ لائیگا۔ اگر آپ دیکھ بھال کر بغیر سودا لئے اُٹھ آئینگے تو بھی آپ کو "تھینک یُو" کہے گا۔ یعنی مَیں آپکی تشریف آوری کا مشکور ہُوں۔ آپ کو جوڑا پہنا کر شکریہ وُہ ادا کرتا ہے۔ پیسے لے کر وُہ ادا کرتا ہے۔ باقی واپس دیکر وہ ادا کرتا ہے اور دُکان کے دروازہ تک آپ کو چھوڑتے وقت شکریہ اور سلام وُہ عرض کرتا ہے۔ اور یہ نہیں کہ کوئی ایسے ہیں اور کوئی ویسے۔ ہر دُکاندار میں یہ عادات پائیگا۔ اب فرمائیے یہ لوگ کیوں کامیاب نہ ہوں۔ مَیں ایک بہت بڑے چھاپہ خانہ میں تصویروں کی چھپائی کا نرخ دریافت کرنے گیا بہت سا

کام وہاں بجلی کی طاقت سے ہوتا تھا اور وہ کمپنی اس درجہ کی ہو کہ ہمارے ہاں کے سب بڑے بڑے کارخانوں کو ملا کر مول لے لے تو اسے کچھ معلوم نہیں۔ اُن کا مینجر اس توجہ سے ملا۔ کہ کیا بیان کروں۔ حالانکہ اسے یہ معلوم بھی ہو گیا۔ کہ جو کام اس سے ملنے کی اُمید ہے وہ بہت قلیل ہے۔ جتنے سوال میں نے کئے۔ سب کا خوشی سے جواب دیا اور سب جوابوں میں وہی "سر" اور "تھینک یُو" موجود تھا۔ یہ ایک نہایت خفیف سی بات معلوم ہوتی ہو مگر کامیابی کے لئے ایک نادر چٹکلا ہے۔ ایک اور خصوصیت یہاں کی دوکانداری میں ہو۔ وُہ یہ ہے کہ آپ سودا کر کے وہیں چھوڑ دیجے اور اپنا پتہ لکھوا دیجے۔ آپ کا مال نہائت حفاظت اور احتیاط سے شام کو آپ کے گھر پہنچا دیا جائیگا۔ یہ بھی ایک ایسا طریق ہے۔ جو قابلِ تقلید ہے۔ اس میں گاہکوں کو نہایت سہولت ہوتی ہے۔ اور بحیثیتِ مجموعی دکاندار کو کچھ بڑا خرچ نہیں اُٹھانا پڑتا۔ مگر گاہک اس سے ممنون بہت ہو جاتے ہیں +

لندن کی پولیس۔ یہ تمام رونق یہ تمام گرم بازاری۔ یہ تمام دلچسپی کے سامان جنکی طرف اُوپر اشارہ ہوا ہے۔ ہیچ ہوتے اور مسافروں کو لندن میں رہنا اور چلنا پھرنا محال ہوتا اگر لندن کو خوش قسمتی سے ایسے عُمدہ ملازمانِ پولیس میسر نہ ہوتے۔ اکثر کہا جاتا ہے۔ کہ لندن کی پولیس دُنیا بھر میں بہترین ہے۔ اور گو ایسے فقرات انگریزوں کی زبان سے عموماً اس مبالغہ کا ایک جزوِ کثیر رکھتے ہیں جو حبِّ وطن کے جوش سے پیدا ہوتا ہے۔ اور میں انہیں بالتمام کم باور کرتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں مبالغہ کی آمیزش نہیں۔ پولیس کا سپاہی لندن میں ایک نعمت ہو۔ اپنے فرائض کا نہائت پابند۔ حلم اور نرمی کا پُتلا۔ اور انتظام کی جان ہو۔ اس کے فرائض یہاں نہایت مشکل ہیں۔ ایک بڑا کام تو اس کے سپرد یہ ہے۔ کہ وُہ یہاں کی بیشمار آمد و رفت کو باترتیب رکھے۔ چنانچہ اسے وُہ نمایاں خوبی سے انجام دیتا ہے۔ ہر موڑ پر اور ہر چوک میں دن میں بیسیوں دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف سے بس۔ ایک طرف سے ٹرم۔ کسی طرف سے گھوڑے

گاڑیاں۔ کسی طرف سے اسباب کے چھکڑے اور سب طرف سے آدمی آتے ہیں اور خطرہ ہے کہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاویں۔ یا آدمی کسی گاڑی کے نیچے آکر کچلے جاویں۔ مگر پولیس والا ان تمام خطرات کو روکتا رہتا ہے۔ جو اختیار اسے حاصل ہیں وُہ بھی قابلِ غور ہیں اور جس عمدگی سے وُہ انہیں برتتا اور لوگ مانتے ہیں وُہ بھی قابلِ داد ہے۔ پولیس والے کی ایک اُنگلی کا اُٹھ جانا علامت ہو کہ اُس طرف کے آدمی۔ گاڑیاں وغیرہ سب یکبارگی رُک جاویں اور وُہ رُک جاتے ہیں۔ تب وُہ دوسری طرف کی گاڑیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ جلدی سے گزر جاؤ۔ پھر آدمیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ دوڑ کر نکل جاویں اور پھر رُکی ہوئی گاڑیوں کو چلتا کر دیتا ہے۔ دن بھر سڑک کے مرکز میں یا موڑ پر یا چوک میں وردی پہنے۔ سیدھا۔ بُت بنا کھڑا رہتا ہے۔ دُھوپ ہو تو سوائے ٹوپی کے کوئی حفاظت نہیں۔ اسے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں۔ اور بارش ہو تو باران کوٹ اور بارانی ٹوپی ہر وقت ساتھ ہے پہن لی اور بارش میں کھڑا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی معلومات راستوں اور سڑکوں کی نسبت بہت صحیح ہیں اور ہر مُسافر کو لازم ہے کہ جہاں ذرا بھی شُبہ ہو اُس سے پُوچھ لے۔ وہ نہایت کشادہ پیشانی سے سب کچھ بتاتا ہے۔ کاش ہماری سرکار ہندوستان کی پولیس کو اس نمونہ پر ڈھال لے۔ کہ وہ حقیقت میں رعیّت کے پاسبان بن جاویں۔ اگر لندن پولیس کے تجربہ کار افسر کو کسی ترغیب سے اور زیادہ تنخواہ پر وہاں کی پولیس میں لیا جائے اور انہیں یہ ہدایت کیجاوے۔ کہ وہ اپنے ہاں کے ملازموں کا نمونہ وہاں داخل کر دیں۔ تو غالباً اچھا نتیجہ ہو مگر یہ تحریک اخبارات کا حصّہ ہے۔

لندن کے میلے ۔ لندن میں مہذب میلے روز رہتے ہیں۔ دو تین جگہ کسی نہ کسی قسم کی نمائش جاری رہتی ہے۔ جس میں ہزارہا لوگ ہر روز شام کو جمع ہوتے ہیں اور تفریح اور تعلیم دونو مطلب ان سے نکلتے ہیں۔ ہر شنبہ کے روز دو بجے کے بعد تمام باغات میں گویا نوروز ہوتا ہے۔ اور اتوار کو خصوصاً گرجا میں بہت سے لوگ

کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو گروہ در گروہ جاتے ہیں اور وہاں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے ہیں۔ کہیں جو دریا میں جزیرہ سا آجاتا ہے تو وہاں ہجوم ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ رنگ میلوں کا ہے۔ مگر ہمارے ہندوستان کی طرح کے میلے اب یہاں ناپید ہیں +

لندن اتوار کو - یکشنبہ کا دن شہر میں عجب سناٹے کا ہوتا ہے۔ اتوار کو کام نہ کرنے کا جو مسئلہ عیسائی مذہب میں ہے۔ اگر اس کی پابندی ہندوستان میں کسی دن کے متعلق اس تشدد سے ممکن ہو تو اوائل میں تو لوگوں کو زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔ جب عادی ہو جاویں۔ تو اور بات ہے۔ پوری ہڑتال ہوتی ہے۔ تمام دکانیں بند ہوتی ہیں اور بازار سنسان۔ کچھ لوگ باہر نکل جاتے ہیں۔ کچھ گھروں میں پڑے رہتے ہیں۔ کچھ گرجاؤں میں جاتے ہیں۔ مگر وہ چہل پہل سب بند ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کے سامان عموماً ہفتہ کی رات کو اتوار کے لئے بھی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور مسافروں کے لئے بھی ہوٹل وغیرہ اتوار ۶ بجے شام کے بعد کھلتے ہیں۔ نہایت بے رونقی ہوتی ہے۔ اور نئے آدمی کو شہر کا یہ رنگ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے۔ ڈاک بالکل بند ہوتی ہے۔ نہ کسی کو خط جا سکتا ہو نہ آسکتا ہے۔ اتوار کو لنڈن آرام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ہفتہ بھر کا تھکا ماندہ اس آرام کا حقیقت میں مستحق بھی ہے۔ ہمیں بھی اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہئے۔ اب پھر کسی دن جب کاروبار رونق پر ہوگا تو سیر کو نکلینگے +

عبدالقادر

بیوفائیِ احباب

(من کلام معجز نظام امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام)

دوستی اور برادرانہ اُلفت کا زمانہ نہ رہا ۔ سچائی کم ہو گئی اور لوگوں سے امیدیں قطع ہو گئیں اور مجھے زمانہ نے اس آشنا کے حوالہ کر دیا جو بہت عہد شکن ہے اور کچھ بھی مروت نہیں کرتا ۔ وُہی خدا مجھے بھی جلد بے پروا کر دیگا جس نے اُن کو مجھ سے بے پروا کر دیا ۔ کیونکہ ہمیشہ نہ امیری رہتی ہے نہ فقیری ۔ نعمت رہتی ہے اور نہ راحت ۔ اسی طرح مصیبت ہے کہ وُہ بھی گذر جاتی ہے ۔ جو دوستی اور محبت خدا کے لئے ہے وہ پاک و پاکیزہ ہے ۔ بُرائیوں سے دل میں میل آجاتا ہے ۔ جب میں کسی دوست کی بیوفائی دیکھتا ہوں تو اپنی اولوالعزمی اور حیا کی وجہ سے چشم پوشی کرتا ہوں ۔ ہر زخم کے لئے ایک دوا ہے مگر بد خُلقی کی کوئی دوا نہیں ۔ اکثر بھائیوں سے میں نے محبت کی مگر اُن کی اُلفت میں قیام نہ پایا ۔ مُنہہ پر تو ہمیشہ محبت اور اخلاص کی باتیں ہیں اور جب تک ملاقات و بے پروائی ہے دوستی بھی ہے ۔ مگر جہاں کوئی بلا نازل ہوئی اُسوقت وُہ دشمن ہیں ۔ اگر میں کسی کی نگاہ سے غائب ہو جاؤں تو اُسے کچھ بھی ملال نہ ہوگا بلکہ پیٹھ پیچھے دل کھول کر بُرا کہیگا ۔ جب سردارِ اہل بیت نے دُنیا سے رحلت کی تو اُس پر کیا کیا ستم نہ ہوئے ۔ دوستی کی مثال آج کے جانے والے مسافر کی ہے جس طرح یہ نہیں اُس طرح وُہ بھی نہیں ۔ آدمی مکر و فریب کے پُتلے ہیں ۔ بظاہر تو بہت صفائی اور محبت سے ملتے ہیں مگر باطن میں اُنکے دل زہر میں بجھائے ہُوئے ہیں ۔ میرا علم میرا دوست ہے اور میرے اخلاق عمدہ ہیں اگر مَیں ہزار دشمن تلاش کروں تو مجھے مِل جائینگے اور ایک دوست چاہوں تو ڈھونڈھے نہ ملیگا ۔ زمانہ کے سر پر خاک ۔ اُس کے عہد میں بُرائی کے سوا سچائی نہیں ۔ دُنیا میں

کوئی اپنا رفیق نہیں اور جو ہیں وہ سب ناموافق اور سچے نہیں ہیں۔

میں نے سفر کیا کہ جو کوئی ملے اُس سے پُوچھوں کہ آیا دنیا میں کوئی سچّا دوست بھی ہے۔ لوگوں نے کہا۔ دو چیزیں نایاب ہیں کہ وُہ نہیں ملتیں۔ ایک دوستِ صادق۔ دوسرا بیضۂ انوق[۵]۔ اَے بھائیوں والے۔ یہ زمانہ بھائی نہیں رکھتا۔ اُس کے سب بھائی ظالم ہیں جنکے دو دہن ہیں اور دو زبانیں۔ تجھ سے بظاہر کس خندہ پیشانی سے ملتے ہیں مگر دلوں میں بغض چھپائے رکھتے ہیں۔ اور جب تو اُن کی نظروں سے اُوجھل ہو جاتا ہے تو وُہ تیری غیبتیں کرتے ہیں اور جھوٹی جھوٹی تہمتیں دھرتے ہیں۔ اب یہ لوگ ہیں اور یہ زمانہ۔ کہ اس محبت پر بھی تجھے دو آدمی دوست نہیں رکھتے۔ اَے شخص! تنہا رہا کر اور اپنے زمانہ میں کسی سے اُنس و محبت نہ کر۔

سجّاد۔ عظیم آبادی

حبیب و ضامن

آج ہم ایسی دو تصویریں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن کے دیکھنے کا اشتیاق ناظرین کو عرصہ دراز سے ہوگا۔ جناب حبیب کنتوری امام الشعرا الشیخ امام بخش ناسخ علیہ الرحمۃ کی یادگار اور قادر الکلام کہنہ مشق اُستادِ فن ہیں۔ انکے دیوان کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل میں طرزِ قدیم و جدید کو کس خوبی سے اپنے اپنے موقع پر نباہ گئے ہیں۔ یہاں طرزِ جدید سے ہماری مراد مولانا حالی کا رنگِ غزل ہے اور اس رنگ میں جناب حبیب نے پاکیزہ غزلیں لکھی ہیں۔ جناب ضامن کنتوری حضرت حبیب کنتوری کے خلفِ رشید اور ایک قابل شاعر ہیں۔ انکی کتاب ارمغانِ ضامن رنگ اہلِ سخن سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے اور اُمید ہے کہ یہ اپنے والد ماجد کے فن کو قائم رکھیں گے

[۵] وہ جانور جو پہاڑ پر انڈا دیتا ہے ۱۲

"برسات اور باغ و بہار"

وہ مزے وصل کے وہ مینہ کا برسنا رم جھم
اُف رے برسات کی رُت ہائے وہ برسات کی رات

رات ہو اور برسات کی رات - ہر طرف سے "رم جھم - جھاجھم" کی ہی خوشگوار آواز سُنائی دیتی ہے - بادل کی گرج - بجلی کی چمک - ہوا کی تیزی - گھٹا ٹوپ اندھیاری اور موسیر پانی کا "رم جھم" برسنا - نلوں سے زوروں پر پانی نکلتے ہوئے "بم بم" اور "ہا ہا" کی آواز - ہوا کا طوفان بے تمیزی کے ساتھ - پانی کی بوچھار لئے ہوئے - اُسارے کیا دالانوں میں بلاتکلف گھس آنا - اور ڈرنیوالوں کے نازک دلوں کو پریشان سا کر دینا - یہ ساری باتیں کچھ عجب بہار اور عجب لطف دے رہی ہیں -

خوش نصیب - نامُرادوں کی مراد برآنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا - بادل گرجا - نازک مزاج سہمے - دُور بیٹھنے والے قریب ہو گئے - بجلی چمکی اور گلے سے لپٹ گئے - تُند ہوا کے تیز جھوکوں اور پانی کی بوچھاڑ نے پردے چھوڑ دینے پر مجبور کیا - آرزو مندوں کی تمنائیں پُوری ہوئیں - بادۂ محبت کے متوالے جام وصال پی کر اور بھی مست و مخمور ہو چلے -

مگر آہ اس ناکام کا حال نہ پُوچھو جو مہجوری کے صدمے جھیل رہا ہو - برسات ہو - یا ابر و باد - باغ و بہار ہو یا سُنسان جنگل یا تنگ و تاریک مکان - فراقِ یار میں - اور اپنی ناکامی پر - خُون رونیوالی آنکھوں سے - اُسے سب یکساں نظر آتا ہے -

جب وحشت میں صحرا نوردی کرتے ہوئے کہیں سبزہ زار و گلستان کی طرف نکل آتا ہے یا تو کچھ دیر جی بہل گیا - یا دلِ غمگین اور بھی اندوہگین ہو گیا - کبھی تو گل و گلزار کو دیکھ کر پھول سے رخسار یاد کر کے اور اُسے عارضِ جاناں سے تشبیہ دیکر آنکھوں سے لگاتا -

اور برگِ گل کو لبِ لعل سمجھ کر اُس کے بوسے لیتا ہے۔ اور کبھی لالۂ و گل کو دیکھ کر آنکھوں سے خون بہانے لگتا اور تاسف و حسرت کے دریا میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔

آہ! جس وقت آسمان ابر کی چادر سے قبا پوش نظر آتا ہے۔ جب پانی برستا ہوا ہوتا ہے۔ جس گھڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی ہے۔ اور جھم جھم کی صدا کانوں میں آتی ہے۔ اُس وقت مفارقت کیسا کچھ ستاتی۔ اور جُدائی دل دُکھاتی ہے۔ آسمانِ دل پر ہر طرف سے درد و غم کی گھٹا چھا گئی۔ اور رنج و محن کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ادھر گنگا ادھر جمنا موجزن ہوئیں۔ اشک اُمڈے۔ آنکھیں برس گئیں اور وصلِ یار کا خوشنما منظر دیکھنے کو ترس گئیں ؎

اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں ۔۔۔ دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں

بادِ صبا کی طرح ٹھنڈی سانس چلنے لگی۔ دیدارِ یار اور وصالِ دلدار کی لذتیں حاصل کرنے کی بہتیری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ ہائے۔ کن کن تمناؤں کا خون ہو گیا۔ آہ و زاری ہے اور بے قراری سی بے قراری!

اُف۔ یہاں سے جی گھبرا گیا۔ آئیے آپ کو اچھی اچھی جگہوں کی سیر کرا لائیں! دن چڑھ گیا ہے۔ پانی جھم جھم برس رہا ہے۔ سرد ہوا بہہ رہی ہے۔ سونیوالے اپنی اپنی حویلیوں میں مسہریوں پر چادر تانے راحت سے سوئے۔ اینڈ اینڈ کر میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے نیند ٹوٹ بھی گئی تو ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے پھر تھپکی دیکر سُلا دیا۔

اسوقت بیچارے غریبوں کی جھونپڑیوں کا کیا حال ہے؟ پانی جب زیادہ برسنے لگتا ہے تو۔ جورو خصم اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچّے کچھ پھٹے پُرانے کپڑے اوڑھے گوشوں میں سُکڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پھونس کی چھپّر جا بجا ٹپک کر۔ دو چار۔ پانچ دس قطرے ابرِ رحمت کے اُنپر بھی ٹپکا جاتی ہے۔

پانی کم ہوتے ہوئے بچے ماں کی گود سے اچھل کر پانی میں کودنے لگتے ہیں کبھی جھونپڑے سے باہر۔ سامنے والے گڑھے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ماں منع کرتی ہے۔ بلاتی ہے۔ یہ نہیں مانتے۔ آخر پکڑ لاتی ہے۔

غرض اسی طرح پروردگار عالم ان مسکینوں کی بھی کاٹ دیتا ہے۔ ؎

امیروں کو مبارک ہو حویلی غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

آئیے ناظرین! آپ کو ایک نرالی جگہ کی سیر کرائیں۔

شام کا سہانا وقت ہے۔ کم کم پانی۔ ذرا تھم تھم کر۔ برس رہا ہے۔ جھولے لگے ہوئے ہیں۔ سرمستان شباب اور جنکے دلوں میں جوانی کے امنگ وولولے جوش زن ہیں۔ آب وتاب اور اہتمام وشان سے جھولے جھول رہے ہیں۔ مہین اور سریلی دل خوش کن آواز سے حسب حال وحسب خیال گیت اور ٹھمریاں گا رہی ہیں ؎

اے موسم برسات ذرا تھم کے برسنا آجائے میرا پی تو جھماجھم سے برسنا

وغیرذلک۔ آپس میں دل لگی اور مذاق بھی ہوتا جاتا ہے۔

کہیں پانی کی رم جھم کے ساتھ ایک بار زور سے بادل کڑکا یا بجلی چمکی اور جھولنے والے سہم سہم کر مکان کے اندر گھس گئے۔ کسی کا دل دھڑکا اور ایک دوسرے سے لپٹ کر بھاگے۔ بھاگتے ہوئے کڑے چھڑے اور چوڑیوں کی آواز پانی کی آواز سے مل کر کچھ عجب کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ "رم جھم۔ چھم۔ چھن چھن۔ چھماچھم"۔

پانی تھم گیا ہے۔ اگرچہ بوندیاں ٹپکتی ہیں۔ کسی سبزہ زار یا چمن زار کی سیر کیجیے گا تو میرے ساتھ آئیے! اوہ! کیچڑ یا پانی کی کچھ پروا نہیں۔ آپ کے جوڑے قیمتی ہیں تو کیا ہوا۔ بغل میں داب لیجیے!

اوہو! یہ سامنے والا سبزہ زار کیسا ہرا بھرا لہلہاتا نظر آ رہا ہے۔ جی لوٹ پوٹ ہوا جاتا ہے۔ سبحان اللہ! قدرت کی کیسی کیسی گلکاریاں ہیں بے شک! ؎

ففی کلِ شیءٍ لہٗ آیۃٌ
تدلُ علےٰ انّہٗ واحدٌ

آہا! یہ باغ بھی کیا ہی بہار کی جگہ ہے۔ گُلاب کی پتیوں کی بھینی بھینی بُو دماغ کو تر و تازہ کر رہی ہے۔ خوشبو کی لپٹ سے دل و دماغ معطّر ہو رہا ہے۔ غنچوں کی مُسکراہٹ۔ گُلوں کی شگفتگی سے دِل کی کلی کھِل جاتی ہے۔

خوشنما درختوں کی سبز پتّیاں قلب پر عجب اثر پیدا کر رہی ہیں۔ سچ ہے۔ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورق دفتریست معرفتِ کردگار

نظرِ غور سے دیکھئے تو اس گلزار میں کسی معشوقِ طنّاز کا پُورا جلوہ نظر آ رہا ہے۔

صنوبر و شمشاد کسی سرو قد کے قامتِ رعنا کی مثال ہونے کے باعث نہال ہیں اور اِس مسرت سے بار بار جھُومنے لگتے ہیں۔ لالۂ داغدار کسی گلعذار کے عارضِ گلگوں کی ادنیٰ تشبیہ ہونے کی بدولت باغ باغ ہیں۔ پھُولے نہیں سماتے۔ نرگس کسی زہرہ شمائل کی جادو بھری نگاہ اور رسیلی آنکھوں کی بیمار ہے۔ یا یُوں کہو کہ کسی آہو چشم کے اشتیاقِ دیدار میں آنکھیں پھاڑے در کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے۔ سنبل کسی عمرِ دراز گل پُرپیچ سے پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ غُنچۂ نسترن کسی گل رو کے دندانِ سلکِ گوہر پر نثار ہے۔ ریحان کسی ہندو کے خطِ جاں ستاں سے شرمسار ہے۔ برگِ گل کسی لعل لب کے لبِ خوش گو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ خار کسی قاتل کے تیغِ مژگاں سے خار کھا رہا ہے۔ سوسن کسی حور شمائل حمیدہ خصائل کی وصف میں زبان درازیاں کر رہی ہے۔

بادِ صبا کبھی تو کسی گُل اندام نازک خرام کی اٹھلاتے ہوئے چال کی نقل بنا کر عاشق کے پامال دل کو ایک ٹھیس لگا جاتی ہے۔

کبھی کسی تُند مزاج۔ سرکش۔ بُتِ بے پیر کی طرح تیزی دکھا کر تمام درختوں کو جھنجھوڑا

دیتی ہے ۔ برسے ہوئے پانی درختوں سے گرنے لگتے ہیں ۔ اور محض تھوڑی دیر کے لیئے یہ زمین پر دوسرا آسمان بنکر مینہہ برسانے لگتے ہیں اور "رم جھم" کی آوازوں پر ایک اور ہی کیفیت پیدا کر جاتی ہے ۔

"رم جھم جھما جھم جھم جھم" اے لو! کس زور شور سے پانی آگیا ۔ اور ابھی دریا کی سیر باقی ہی ہے ۔ بوندیں درختوں سے چھن چھن کر ہمارے تمام کپڑوں پر ٹپک رہی ہیں ۔ اُف ۔ کیسی ٹھنڈی ہوا ہے ۔ چلو! گھر بھاگ چلو!!

محمد حسن میاں پھلواری (پٹنہ)

خاتون اس نام کا ایک ماہواری علمی رسالہ علیگڈھ سے نکلنا شروع ہوا ہے ۔ اس کے ایڈیٹر ہمارے لائق دوست شیخ عبداللہ صاحب بی ۔ اے وکیل ہیں ۔ اس رسالے کا مقصد صرف ایک ہے یعنی فرقہ اناث میں ترویج تعلیم اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ رسالہ ملک کی ایک واقعی ضرورت کو مدنظر رکھ کر جاری کیا گیا ہو ۔ اس رسالہ کے دو نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہیں ۔ گو دوسرے نمبر میں بہت کچھ اصلاح کر دی گئی ہو تاہم ابھی اصلاح اور ترقی کی بہت کچھ گنجائش نظر آتی ہے ۔ اگر اس رسالہ پر کافی توجہ کی گئی اور عام ضرورت کا خیال کیا گیا تو کچھ عجب نہیں کہ یہ رسالہ چل نکلے ۔ رسالہ کی لکھائی چھپائی عمدہ ہو ۔ حجم ۴۸ صفحہ ہو ۔ سالانہ قیمت ہے معہ محصولڈاک ۔ درخواست بنام شیخ عبداللہ صاحب بی ۔ اے وکیل علیگڈھ ہو ✦

کشمیر درپن ۔ یہ رسالہ الہ آباد سے ماہوار شائع ہوتا ہو ۔ ہر قسم کے علمی اور اخلاقی مضامین درج ہوتے ہیں ۔ اسکی ترتیب پنڈت تیج بہادر سپرو ایم ۔ اے ال ال ڈی وکیل ہائی کورٹ کے لائق ہاتھوں میں ہے ۔ اس رسالے میں عام طور پر کشمیری پنڈت صاحبان کے متعلق ہی مضامین ہوتے ہیں لیکن عام دلچسپی کے مضامین بھی کبھی کبھی شائع ہو جاتے ہیں ۔ کشمیر درپن کی زبان سلیس اور پاکیزہ ہوتی ہو ۔ خریداری کے درخواست بنام پنڈت منوہر لعل صاحب نقشی دارا گنج الہ آباد ہونی چاہیئے ✦

دوپٹہ

جب کچھ عرصہ ہوا میں نے ٹوپی پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تو کئی حضرات نے اس کی داد دی اور فرمائش کی کہ اب کچھ پگڑی پر بھی رہے - اس ارشاد کی تعمیل کر دیگئی - اور دستار ہدیۂ ناظرین ہوئی اب لے دیکے پاؤں کا جوتہ رہگیا ہے یار لوگ اسے بھی نہیں چھوڑتے ایک مہربان دوست نے لکھ بھیجا ہے کہ اب لگے ہاتھوں جوتے پر بھی لکھ ہی ڈالو - لیجئے اب اس کی بھی خیر نہیں - اگر دستار پر کچھ لکھتے وقت یہ معلوم ہوتا کہ ایسی ایسی فرمائشیں بھی ہونگی تو کاہیکو اس کشمکش میں پڑتے - اب تعمیل حکم ہو تو مشکل اور انکار کریں تو مشکل - اس کے سوا ایک دقت اور بھی ہے - مختلف فرمائشیں ہیں اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ مقدم کونسی ہو اور مؤخر کونسی - جہانتک ممکن ہوگا ارشاد کی تعمیل سے دریغ نہ ہوگا - جوتانامہ تو ہو رہیگا - مگر اس کی باری ابھی جلدی نہیں آسکتی - ابھی ٹوپی ہی کے سلسلے میں ٹوپی کے سر پہ دھرنے کی طرز اور دستار کے متعلق اس کے باندھنے کی وضع محتاج توضیح ہیں - پھر انگرکھے - کرتے اور پاجامے اور کوٹ پتلون وغیرہ کا موازنہ باقی ہے - مگر ان سب سے پہلے ایک دوست کی رائے نہایت صائب معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کے سر کے لباس کا ذکر تو آگیا مگر عورتوں کے سر کی زینت یعنے دوپٹے پر کچھ نہیں لکھا گیا - اور دوپٹے کا استحقاق سب سے بڑھ کر ہے کہ اسپر ایک مضمون لکھا جائے - اس رائے کو پیش کرتے وقت ہمارے قابل دوست نے نہایت شد و مد سے حقوقِ نسوان پر زور دیا ہے - وہ فرماتے ہیں "ہمارے ہندوستان کی خستہ حالی اور تباہی اسکی پستی اور زوال دنیا کے اقوام میں اسکی بے حرمتی اور بے وقعتی کا یہی تو سبب ہو کہ اس میں آبادی کا ایک نصف بالکل بیکار سمجھا جاتا ہے - مرد اپنے

غرورِ مردی میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ دُنیا انہی کے لئے پیدا کی گئی ہو اور جہاں خدا نے اور مخلوقات ان کی آسائش کے لئے پیدا کر رکھی ہے وہیں عورتیں بھی انکے آرام کا ایک حصہ ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ عورت اور مرد ملکر مکمّل انسان بنتا ہو۔ دونو کی ہستی ایک دوسرے کے لئے ضروری اور بنی نوعِ انسان کے قیام کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ عورت بغیر مرد کے اور مرد بغیر عورت کے نامکمل ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہردم ہر لحظہ عورتوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ اور کوئی ایسی فروگذاشت نہ کیجائے جس سے عورتوں کے حقوق میں کوئی کمی واقع ہو۔ جو قومیں عورتوں کا حق پہچانتی ہیں اور انکی تعلیم و تربیت ویسی ہی ضروری سمجھتی ہیں جیسی مردوں کی وُہ اس زمانے میں خوشحال اور اقبالمند ہیں اور جو قومیں اس فرض سے غافل ہیں وُہ دن بدن نیچے جارہی ہیں اور اگر وُہ اپنی غفلت سے بیدار نہ ہونگی تو ایک دن عنقریب آئیگا کہ وُہ پستی کے پست ترین گڑھے میں جا گرینگی جہاں سے پھر نکلنا نہیں ہوگا۔ کوئی جسم صحیح اور تندرست نہیں کہا جاسکتا۔ جب اس کے آدھے حصّے کو رعشہ یا فالج کا عارضہ ہو اور اگر عارضہ کا علاج نہ کیا جائے تو سارے کا مفلوج ہوجانا یقینی ہے۔ پس آپ اگر حقیقت میں ملک کی خدمت کیا چاہتے ہیں تو خفیف سی خفیف باتوں میں بھی برابر حقوقِ نسوان کا خیال رکھیں اور کبھی پلڑے کو ناواجب طور پر مردوں کی طرف جھکنے نہ دیں"۔ ان خیالات سے جو ہمارے دوست نے ظاہر کئے ہیں اکثر لوگ اتفاق کرینگے۔ لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اُنھوں نے بہت سی فصاحت بے ضرورت اس بات کے منوانے پر صرف کی ہے کہ دوپٹّہ پر مضمون لکھا جائے۔ اسکا تو کہدینا ہی اس ہدایت کے مانے جانے کے لئے کافی تھا۔ ہمیں خود خیال آیا تھا کہ اب دوپٹّہ کی باری ہے مگر تامل تھا تو یہ کہ ہمارے مُلک میں شاعرانہ رنگین مزاجی نے دوپٹّے کے ساتھ عشق و محبت کے چونچلے اس قدر ملا دیئے ہیں کہ

بغیر ان میں کسی قدر اُلجھنے کے ایسے مضمون کا تکملہ نہیں ہو سکتا۔ کون نہیں جانتا کہ دوپٹہ اکثر کھسکتا رہتا ہے یا تو اس کے مزاج میں ایک جگہ قرار سے سیماب وار نفرت ہے یا اوڑھنے والوں کی چلبلاہٹ نے اس میں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ ادھر حسن بایہ کے شیدائیوں کو ایک ختم نہ ہونے والا مضمون دیدیا ہے۔ ادھر آنچل سرکا اور اُدھر حیا جس کے سپرد خیالی پہرہ داری ہے بولی "حضور دوپٹہ سنبھال کے" کہیں دوپٹہ ہوا سے اُڑتا ہے اور عاشق مزاج خوشیاں مناتے ہیں کبھی ہوا اُسے پیشانی کے اوپر جھکا دیتی ہے۔ فوراً مشتاق نگاہیں بے تاب ہوتی ہیں اور بادِ صبا سے التجا کرتی ہیں کہ چلے اور رُخ سے یہ نقاب اُڑا دے۔ بعض لوگ ہیں کہ نہ دوپٹے سے غرض رکھتے ہیں نہ دوپٹے والوں سے۔ دوپٹے کے رنگ پر مرتے ہیں۔ کبھی دھانی رنگ کے گیت گاتے ہیں اور کبھی موتیا کے۔ کبھی پیازی پر فدا ہوتے ہیں اور کبھی چمپی اور سوسنی پر جان دیتے ہیں۔ بعض ہیں کہ پوشاک سے گذر کر صاحبِ پوشاک کی تعریف میں محو رہتے ہیں انکے نزدیک دوپٹہ ملگجا سا ہو تو اور بھی لطف ہے، مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں :-

اگر ہی کا ہے گماں شک ہو ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

سچ پوچھئے تو اس شعر میں کسی قدر ایک فطری جذبے کا بیان ہو اگر کوئی نقش دل پر گہرا بیٹھ جائے تو پھر اس کے متعلق ظاہری چیزوں کی حالت کی پروا نہیں رہتی۔ میلا رنگ بھی میلا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ کسی کے صاف رنگ کا پر تو اس میلے دوپٹے پر پڑ رہا ہو۔ مگر یہ تو سب رنگین لوگوں کی باتیں تھیں۔ ایسے زمانے میں جب انہیں فارغ البالی حاصل تھی کام کاج نام کو نہ تھا۔ "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے" کا نقشہ تھا۔ آجکل کے عملی زمانے میں تصور کا کیا کام۔ ہمیں تو دوپٹے کو ہندوستان کی عملی

ضروریات کے لحاظ سے دیکھنا ہے۔ اس ملک کی آب وہوا کے خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے۔ زنانہ سر کے لئے خاصہ موزون لباس انتخاب ہوا ہے۔ گرمی ہوئی تو ہلکا سا کپڑا لے لیا۔ جاڑے آئے تو مریینے۔ پشمینے یا پھلکاری کی نوبت آگئی۔ مردوں سے علیحدہ بیٹھے تو اُتار کے رکھدیا کہ ذرا سر کو ہوا لگے۔ صاحب خانہ آئے تو اوڑھ لیا۔ لحاظ کا اظہار بھی ہوگیا اور سجاوٹ میں بھی اضافہ ہوگیا۔ میلا ہوا تو آسانی سے دُھل گیا۔ اور سفید ہوا تو جس رنگ میں چاہا رنگ دیا۔ روز نئی زیبائش ہوگئی اور کوڑیوں کے مول۔ ایک غریب ملک کے لئے جس کی عورتیں یا تو گھروں سے باہر حسب رواج نکلتی ہی نہیں یا انہیں نکلنے کی ضرورت کم ہے۔ اس کے موزون ہونے میں مشکل سے کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن جو عورتیں باہر نکلنے والی ہیں۔ انکے لئے چنداں آرام دہ نہیں چلتے میں اس کا سنبھالنا خاصہ اچھا محنت کا کام ہے اور گلی کوچے میں جس عورت کا دوپٹہ غیر معمولی طور پر بار بار کھسکتا نظر آئے۔ اس کے بھدے پن پر یا چالاکی پر دلالت کرتا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ میمیں ٹوپی پہنتی ہیں۔ اور کئی ہمارے اہل وطن ایسے ہونگے جو دل ہی دل میں چاہتے ہیں کہ کاش ہماری بیبیاں انکا سا پہراوا اختیار کریں۔ مگر یہ خواہش مناسب حالات نہیں یہ تو ظاہر ہے کہ جب سارا لباس بدل جائے تو ٹوپی کا موقع آئے اور سارے لباس کے بدلنے میں بیشمار دقتیں ہیں۔ لیکن ویسے ٹوپی کو ہی دیکھیں تو اس میں بہت مشکلات ہیں۔ یہاں ہم میموں کو دو قسم کی ٹوپیاں پہنے ہوئے دیکھتے ہیں ایک تو نسبتاً انکی بہت پھیلاؤ والی تنکوں کی ساخت کی جو اکثر بیشمار قدرتی یا مصنوعی پھولوں سے لدی ہوتی ہیں۔ یا باریک کریپ یا ریشمی ململ کے خوش رنگ پارچوں سے سجائی گئی ہوتی ہیں۔ یہ بیشک زیب و زینت کا باعث ہیں۔ مگر معلوم نہیں کتنے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ انکے بنانے سنوارنے سر پر دھرنے اور سوئیوں سلائیوں سے بالوں میں اٹکانے پر کتنا وقت صرف ہوتا ہے پس ہمارے ملک کے حالات میں جب موسم گرم

کی شدت بسا اوقات سر کو ننگے رکھنے پر مجبور کرتی ہے اور ملک کا رواج مردوں کے آتے ہی لباسِ سر زیبِ سر کرنے کا متقاضی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی ایسی چیز جس کا پہننا اور اُتارنا خاص وقت چاہتا ہے اختیار کیجا سکے۔ دُوسری قسم کی ٹوپی جو میمیں یہاں پہنتی ہیں اور جس کی انہیں زیادہ تر اسی ملک میں ضرورت پڑتی ہے ایک طرح کی معمولی مردانہ انگریزی چھجے دار ٹوپی ہے۔ وہ دُھوپ وغیرہ میں چلنے کے لئے مفید تو ہے۔ مگر انتہا درجہ کی بدزیب ہو۔ اور فطرتِ انسانی جو دلفریبی عورت کے ساتھ منسوب کرتی ہے۔ اس کے خلاف ہو۔ دیسی عیسائی عورتیں جو سایہ اور میموں کی طرح انگریزی جاکٹ پہننے لگی ہیں۔ اور بال بھی اکثر انہی کی طرح سنوارتی ہیں ۔سر کے لئے عمومًا دوپٹے ہی کی پابند ہیں۔ اور انصاف تو یہ ہے کہ دوپٹّہ اوڑھے ہُوئے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ٹوپی انہیں شاید بدنما معلوم ہو۔ ہاں ان میں اور ہمارے ہاں کی عام مستُورات کے مذاق میں دوپٹّوں کے بارے میں بہت فرق ہے۔ یہ اکثر سفید دوپٹّے اوڑھتی ہیں خواہ گرمی ہو خواہ سردی۔ کیونکہ سردی سے بچنے کے لئے انکے باقی کپڑے کافی ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندو مسلمانوں کی عورتیں کرتیاں تو ہلکے کپڑوں کی بناتی ہیں اور اوپر ایک سیر کے بوجھ کی چادر اوڑھتی ہیں جو بہت زیبا نہیں ہوتی اور جس میں ہوا لگنے کا اور بیمار ہونے کا خطرہ باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی مستورات بالعموم گاڑھے رنگ اور گوٹے کناری کی بہت شائق ہوتی ہیں۔ گو اس بارہ میں خود بخود زمانہ بہت کچھ اصلاح مذاق کی کر رہا ہے اور ہلکے ہوائی رنگ اور سادہ دوپٹّے یا زیادہ سے زیادہ باریک دھنک کے کنارے یا گنگری یا ریشمی لیس والے زیادہ مقبول ہوتے جاتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے گھر ایسے ہیں جن میں ایک ایک چادر دریائی کی ایسی ہو جس پر سو سو تولہ گوٹہ منڈھا گیا ہو اور جسکا اوڑھنا نوجوان لڑکیوں کے لئے وبالِ جان ہو جاتا ہے اور ان دنوں میں جب انہیں ہولکے گھوڑوں پر سوار ہونا چاہیئے۔ وہ مکانوں کے صحنوں میں رینگتی ہوئی اپنی بھدی

سی چادر کے دامن سنبھالتی ہوتی چلتی ہیں۔ دوپٹوں کا ذکر ناکمل رہیگا اگر ہم ساڑھی کو بھول جائیں۔ بنگالہ میں بمبئی میں مدراس میں اور اودھ کے بعض حصوں میں اس کا بکثرت رواج ہے۔ یہ ایک بڑا دوپٹہ ہوتا ہے جس کا ایک حصہ کمر کے گرد لپیٹ کر بدن کو بھی ڈھانپ لیتا ہے اور جس کا دوسرا حصہ سر پر اوڑھا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کے لئے نہایت موزون اور خوشنما لباس ہے اور ریشم کی خوش رنگ کنارے دار ساڑھیاں اور بنارسی ململ کے حاشیہ دار دوپٹے جو ساڑھی کا کام دیسکیں عجب بہار دیتے ہیں۔ اگر سلیقے سے پہنے جائیں۔ یونتو بہت سی قومیں ساڑھی پہنتی ہیں اور پہننا جانتی ہیں۔ مگر پارسی عورتوں نے اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ خوشنما ساڑھیوں کی پُرلطف بہار اگر دیکھنے کا شوق ہو تو بمبئی تشریف لیجائیے اور شام کے وقت بینڈ سٹینڈ کی طرف نکل جائیے۔ وہاں جاکر انگریزی اور پارسی لباس کا مقابلہ کیجئے۔ پھر سوائے ساڑھی کے اور کوئی چیز نظر میں نہ جچیگی۔ میمیں باوجود اپنے خوبصورت گون اور خوشنما بونٹ (زنانہ ٹوپی) کے انکے لباس پر رشک کرتی ہیں۔ ساڑھی گھر کے اندر پہننے کے لئے بھی آرام دہ لباس ہے اور باہر نکلنے کے لئے بھی۔ اور اسی لئے اگر اس کا رواج شمالی ہندوستان میں زیادہ عام ہوجائے تو اس سے دو نتیجے پیدا ہوں اوّل تو ہندوستان خاص کے موجودہ لباس میں جو چھوٹے چھوٹے نقص ہیں وہ چھپ جائیں۔ یا دور ہوجائیں اور دوسرے تمام ہندوستان میں خواتین کا لباس قریب قریب ایک سا ہوجائے جس کے فواید محتاج بیان نہیں +

اکرام

میرا ساغر آسمان ہی

اَے شراب! بس میرے سامنے سے دُور ہو جا - کیونکہ تو دُنیاوی آلائش سے لتھڑی ہوئی ہے - اور میری رُوح تجھ سے بیزار ہے - تجھ سے کہیں زیادہ صاف اور چھلکتی ہُوئی ایک شراب ہے جس کا میں دلدادہ ہوں - اور وہ موسمِ بہار کی مستی ہے - میرا ساغر آسمان ہے - اور میری آنکھ محوِ مے کشی ہے - میرا دماغ اس کے پینے سے عالمِ بالا کی سیر کرتا ہے - اَے نیشکر آ - اور چل ہم اور تو دونوں سبز پہاڑیوں کی سیر کرینگے - اور وہاں آفتاب کی روشن شراب پئینگے - یہاں تک کہ آفتاب کی شان و شوکت ہمارے سر میں سما جائے گی۔

آے خدا! جو تمام عالم کا مالک ہے میری رُوح تیری طرف جا رہی ہے - یہاں ہماری زیست ایک خوفناک تفرقہ ہے اور بہت ہی گہری جدائی ہے - جو دُنیاوی خوفوں سے پُر ہے -

جب رُوح نکل جاتی ہے تو ہم سر اُٹھا کر اُوپر کو دیکھتے ہیں - جیسے کہ کوئی ماں اپنے بچہ کو جو عقاب کی چنگل میں ہے دیکھتی ہے - اگر یہ دیوانہ پن نہیں ہے تو کیا ہے -
اَے خدا! مجھے ان آفتوں سے بچا۔

(ترجمہ)

بشیر احمد (از لندن)

تصویرِ محبّت

میرا ایک دلی دوست تھا۔ اُس نے ایک ناز پروردہ حسین اور قابل نوجوان عورت سے شادی کی۔ اگرچہ خود اس نوجوان عورت کے پاس کچھ ایسی دولت نہ تھی۔ مگر جان نثار شوہر ایک باثروت شخص تھا۔ اور یہ دونو بڑے ناز ونعم میں رہتے تھے۔ ان دونو میاں بیوی کی طبیعتیں کچھ عجیب طبیعتیں تھیں۔ وہ عاشق مزاج اور کسی قدر متین تھا تو یہ ہمہ تن بہجت ومسرت۔ مَیں نے بارہا تجربہ کیا کہ اگر کسی مجمع میں اس کے حُسن گلو سوز کی تعریف ہوتی تو وُہ اس کی طرف ایسی پیار کی نگاہوں سے دیکھا کرتا کہ یہ بیچین ہو ہو جاتی۔ دونو ہاتھ میں ہاتھ دیئے نکلتے۔ تو عجب عالم نکلتا۔ ایک بلند بالا اور قوی تو دوسری نازک اور ہلکی پھلکی۔ شوہر اس محبّت اور اُلفت سے اسکا بازو تھام کر چلا کرتا۔ کہ یہ ایک فخر کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتی اور شرما جاتی۔ نئے نئے اُمنگوں بھرے شباب کے گلزار سراپا بہار میں جس شوق وذوق سے یہ جوڑا گلگشت کیا کرتا تھا۔ ذرا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

سُوءِ اتفاق دیکھئے شادی کو ابھی چند ہی مہینے ہُوئے تھے۔ کہ ہمارے دوست پر اچانک ایسی آفتیں آئیں۔ کہ تمام مال و اسباب ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور مفلسی تک نوبت پہنچی کچھ عرصے تک اُس نے اپنا حال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ شکستہ دل اور افسردہ خاطر رہا کرتا۔ آخر زندگی وبالِ جان معلوم ہونے لگی۔ مگر واہ رے صبر! بیوی کے سامنے ہمیشہ شگفتہ خاطر رہنے کی کوشش کیا کرتا۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کے نازک دل کو صدمہ نہ پہنچے۔ لیکن تابہ کے۔ محبّت کی تیز نظروں نے آخر بھانپ لیا۔ کہ کوئی بات ہو ضرور۔ وُہ اس کی بدلی ہُوئی حرکات۔ اور دبی دبی آہوں کو بغور دیکھا کرتی تھی اور اسکی مریضانہ صورت کو خوب سمجھتی تھی۔ اُس نے اپنی تمام ادائیں اس کوشش میں صرف کر ڈالیں۔

کہ کسی طرح یہ پھر خوش و خرم رہنے لگے۔ مگر کچھ ہُوا تو یہ ہُوا کہ ناسورِ غم اَور بھی زیادہ بڑھنے لگا جتنی
اُس کی ادائیں اُسے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اُتنا ہی یہ خیال دُکھ دیتا تھا کہ ہائے اس پر عنقریب بڑی
آفت آنے والی ہے۔ یہ تبسم تھوڑے ہی دنوں میں کافور ہو جائیگا۔ یہ آنکھیں جو اب اسقدر
دلربایانہ انداز کے ساتھ چمکتی ہیں بہت جلد بے نُور ہو جائینگی۔ یہ چلبلا دل جو اب اس پیارے
سینے میں مزے سے حرکت کر رہا ہے کل ہی دُنیاوی رنج و غم کے نیچے دب کر رہ جائیگا۔
آخر ایک دن وہ میرے پاس آیا اور اپنی ساری سرگذشت ایک عجیب یاس کے ساتھ مجھ سے
بیان کی۔ مَیں سُن چکا تو پوچھا "تمہاری بی بی کو یہ سب حال معلوم ہے"؟ یہ سُنتے ہی وہ زار زار
رونے لگا اور کہنے لگا "خدا کے واسطے اگر تمہیں میری بیکسی پر رحم آتا ہے تو میری بیوی
سے اسکا ذکر نہ کرنا۔ یہ اُسی غریب کا تو خیال ہے جو مجھے دیوانہ بنائے ڈالتا ہے۔ مَیں نے
کہا کیوں نہیں کہہ دیتے آخر کبھی نہ کبھی معلوم ہوگا ہی پھر اُسوقت یہ خبر شاید اَور بھی قہر لائے تمہارا
کہنا کچھ اَور بات ہے۔ علاوہ اس کے تم سخت غلطی میں ہو کہ اُس کی غمخواری سے فائدہ اُٹھانے
کا موقع ہاتھ سے دے رہے ہو اور نہ صرف یہ بلکہ رشتۂ اُلفت کو کمزور کر رہے ہو۔ اُسے جلد
معلوم ہو جائیگا کہ کوئی شے چپکے چپکے تمہارے دل کو توڑ رہی ہے۔ سچی محبت کشیدگی
کو برداشت نہیں کر سکتی۔ محبوب اگر اپنا رنج بھی عاشق سے چھپائے تو عاشق کو سخت
صدمہ ہوتا ہے"۔ اُس نے جواب میں کہا "میرے مہربان! کیونکر اُس سے کہوں کہ تیری
ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ ہائے کس طرح اُسے بتلاؤں کہ تیرا شوہر کنگال ہو گیا اور
تجھے سارا عیش و نشاط چھوڑ کر غریبی اور گمنامی میں بسر کرنا ہوگا۔ ہائے میری زبان سے کیسے
نکلیگا کہ مَیں نے تجھے اس اَوج سے کھینچ کر گرایا ہے جہاں تو ہر کسی کی آنکھوں کا سکھ اور
کلیجے کی ٹھنڈک ہو کر رہا کرتی تھی۔ ہائے وُہ غریبی کیونکر برداشت کریگی وُہ تو ثروت نعمت
میں بڑے نازوں سے پلی ہے۔ اُسے بیکسی کی تاب کس طرح آئیگی وُہ تو ہر دلعزیز رہی ہے
نہیں! نہیں! اُس کا دل ٹوٹ جائیگا وُہ جان دے دیگی!" مَیں نے دیکھا کہ اب یہ

بڑے جوش میں ہے۔ خاموش ہو رہا کہ اچھا ہے باتوں میں اس کے دل کا بخار کچھ نکل جائیے۔ آخر جب اُسکا جوش مدھم پڑا اور وُہ چپ ہو گیا تو مَیں نے نہایت ملائمت کے ساتھ پھر اُسی قصّے کو چھیڑا اور سمجھایا کہ اُسکا ذکر اپنی بیوی سے ضرور کرنا۔ اُس نے بڑی افسردگی کے ساتھ سر ہلایا۔ پھر مَیں نے کہا کہ بھئی اب تم اپنا ٹھاٹھ بھی بدل ڈالو۔ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے تمہارے بعض دوست ایسے ہیں کہ اس حالت میں بھی تمہیں ویسا ہی سمجھینگے جیسا پہلے سمجھتے تھے۔ اور پھر تمہیں تو اپنی پیاری بیوی کے ساتھ رہنا ہے۔ جھونپڑے میں بھی رہو گے تو محل کے لُطف اُٹھاؤ گے"۔ اُس نے جواب میں کہا "میری جان سے زیادہ پیاری بی بی"! پھر مَیں نے کہا "میرے دوست! خوب طرح یقین کر لو کہ اس کا اثر تمہاری محبوبہ پر کچھ زیادہ نہیں پڑیگا۔ اُسے تمہاری خدمت کا اور زیادہ موقع ملیگا۔ وُہ تمہیں خوب تسلّی دیگی۔ عزیز! ہر عورت کے دِل میں محبّت کی ایک چنگاری ہوتی ہے جو اقبال کے روز روشن میں خاکستر میں چھپی رہتی ہے مگر ادبار کی شبِ تاریک میں نکلکر بھڑک اُٹھتی ہے۔ کیسکو معلوم نہیں کہ میری بیوی بھی ایک فرشتۂ رحمت ہے۔ ہاں اُسوقت خبر ہوتی ہے جب وُہ اس کے ساتھ دُکھ درد سہتی ہے اور اُف نہیں کرتی"۔ میری نصیحت نے میرے دوست پر بڑا اثر کیا۔ وُہ مجھ سے وعدہ کر کے رخصت ہُوا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد مَیں نے خیال کیا کہ تو نے اُسے صلاح دے تو دی اگر اُس بی بی کو صدمہ پہنچا اور اُس نے اپنے پُرفضا طریقِ زندگی کو چھوڑ کر ذلّت وحقارت کے تاریک گڑھے میں گرنا گوارا نہ کیا تو کیا ہو گا! مَیں یہ خیال کر کے کانپنے لگا اور جب تک اگلے روز میرے دوست نے آکر مجھ سے امرِ واقعی کا اظہار نہ کیا میرا دِل برابر دھڑکتا رہا۔ ملاقات کے سب سے پہلے مَیں نے یہی پُوچھا "کہو دوست کیا حال رہا؟ اُس نے جواب میں کہا "میری فرشتہ خصلت بیوی! وُہ اپنا رنج وغم سب بھول گئی۔ اُس نے میری گردن میں باہیں ڈال دیں اور کہا بس اتنی ہی بات تھی جس کے باعث اتنے مغموم تھے" مگر میری بھولی بھالی! اُسے معلوم نہیں کہ غریبی کی ناگوار فکر میں چھوٹی چھوٹی ضرورتیں

اور ذرا ذرا سی ذلّتیں پیش آئینگی تو عجب حال ہوگا"۔ پھر میں نے اُس سے کہا کہ ایک مشکل معاملہ تو بخیریت فیصل ہوگیا اب دنیا پر بھی ظاہر کر دو۔ خالی خولی تمکنت سے فائدہ جب گرہ میں چار پیسے ہی نہ ہُوئے۔ اور پھر ٹیپ ٹاپ رکھی بھی تو قلعی کب تک نہ کھلیگی۔ بس مفلسی سے جھینپو نہیں مفلسی پھر چنداں ناگوار نہ ہوگی"۔ میرے دوست نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ وہ مغرور طبیعت نہ تھا اور اُس کی بیوی کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ چند روز بعد وُہ شام کو مجھ سے ملا۔ معلوم ہوا کہ اُس نے اپنا گھر بیچ ڈالا اور شہر سے چند میل کے فاصلے پر دیہات میں ایک جھونپڑی لے لی۔ وُہ تمام دن اُسکا اسباب پہنچانے میں لگا تھا اور یہ اسباب کچھ زیادہ نہ تھا بہت تھوڑا اور وُہ بھی انتہا کا سادہ۔ اُس نے اپنا پہلا بیش بہا سامان سارا دے ڈالا مگر اپنی پیاری بی بی کی ستاری رکھ چھوڑی۔ اس سے جُدائی ممکن نہ تھی۔ یہ ان دونوں کے ایام محبت کی یادگار تھی۔ مَیں اُس حسن و عشق کے قصّے کو سُنکر مُسکرایا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ اب مَیں اپنے نئے گھر کو جارہا ہُوں۔ میری بیوی دن بھر چیزیں درست کرنے میں مصرُوف رہی ہے"۔ میرا تعلق اس کُنبے سے اِس قدر بڑھ گیا تھا کہ میں نے ساتھ چلنے کی اجازت چاہی۔ اور ہم دونوں چل کھڑے ہُوئے۔ وہ دن بھر کی کلفتوں سے اتنا تھک گیا تھا کہ راستے میں اُس نے ایک بات نہیں کی۔ خاموش سنجیدہ صُورت بنائے قدم بڑھائے چلا گیا۔ آخر اُس کے مُنہ سے یہ نکلا "میری غریب بی بی" مَیں نے پُوچھا کیوں اَور کیا ہوا؟ جواب دیا "ہُوا کیا! کیا یہ کچھ نہیں کہ وُہ غریب ایک ذلیل سی جھونپڑی میں مقیّد ہو اور اپنے ہاتھوں سے وہ کام کرتی ہے۔ جو کبھی اُس کے آگے نوکر کیا کرتے تھے؟ مَیں نے کہا ایں! تو کیا وُہ اس نئی حالت سے ناخوش ہے"۔ "ناخوش"؟ اُس نے جواب میں کہا "وُہ تو ہمہ تن مسرّت براحت ہے۔ اصل پُوچھئے تو وُہ پہلے سے بھی زیادہ خوش ہے۔ آہ! وُہ تو

سراپا محبت اور سراپا شفقی ہے۔ "ماشاء اللہ واہ وا" میں پکار اٹھا "یار! تم تو کہتے تھے کہ ہم غریب ہیں۔ تمہارے قبضے میں تو وہ بے انتہا بیش بہا خزانہ ہے کہ شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ پھر وہ کہنے لگا "مہربانِ من! اگر یہ پہلی ملاقات بخیریت گذر جائے تو مجھے غالباً پھر کچھ غم نہ ہوگا۔ آج وہ دن ہے کہ پہلے پہل وہ ایک ادنے سی جھونپڑی میں آکر رہی ہے اور اس کے کم حیثیت سامان کی درستی میں اسکا دن بھر صرف ہوا ہے۔ آج اسکو معلوم ہوا ہوگا کہ خانہ داری کی تکلیفیں کیسی ہوتی ہیں۔ آج اس کو خبر ہوئی ہوگی کہ اب ہم کو ایسے گھر میں رہنا ہوگا جس میں کوئی شوق کی چیز بلکہ کوئی آرام کی چیز نہیں۔ ہائے اب وہ تھکی ہاری افسردہ خاطر بیٹھی ہوگی اور سوچ رہی ہوگی۔ کہ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے"۔ مجھے خود ایسا ہی خیال تھا اس لئے اس خیال کی تردید نہیں کی اور چپ چاپ بڑھا چلا گیا۔

اب ہم سیدھی سڑک کو چھوڑ کر ایک تنگ سے راستے کو ہولئے۔ اس راستے پر لمبے لمبے گھنیرے درختوں کا سایہ تھا جن سے خاموشی و عزلت ٹپکی پڑتی تھی۔ کچھ دور چل کر جھونپڑی دکھائی دینے لگی۔ صورت میں اگرچہ نہایت سادہ تھی مگر ایک عجیب کیفیت چھائی تھی۔ ہری ہری انگور کی بیل نے ایک حصے کو سبز سبز پتوں سے ڈھانک رکھا تھا۔ کچھ درختوں کی شاخیں اس پر سایہ کئے تھیں اور دروازے کے آگے اور سامنے کے چمن میں متعدد گملے قرینے سے رکھے تھے۔ پھاٹک سے ایک تنگ سا راستہ چند سرسبز جھاڑیوں میں چکر کھاتا ہوا دروازے تک پہنچا تھا۔ جوں ہی نزدیک پہنچے گانے بجانے کی آواز ہمارے کان میں پڑی۔ ٹھٹک کر سننے لگے۔ آہ! مریم نہایت بھولے پن کی اداسی اپنی ستاری پر ایک چھوٹا سا گیت گا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے دوست کا ہاتھ جسے میں اپنے ہاتھ میں لئے تھا کانپنے لگا۔ وہ گانا سننے کے لئے اور آگے بڑھا۔ قدم پڑتے ہی کنکریلی روش پر کچھ شور سا ہوا۔ فوراً ایک حسین چہرہ جھروکے سے جھانک کر

غائب ہوگیا۔ پھر پاؤں کی ایک نرم آہٹ سُنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مریم ٹھم ٹھم کرتی ہمارے استقبال کو آرہی ہے۔ لباس سفید خوبصورت اور دیہاتی وضع کا تھا۔ پیارے پیارے بالوں میں پھول اٹکے تھے۔ رخساروں پر شگفتگی تھی اور سارا کا سارا چہرہ مُسکراہٹوں کے باعث روشن تھا۔ میں نے ایسی دلربا صورت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی "میرے پیارے جرمیس" اُس نے پکار کر کہا "تمہارے آنے سے مجھے کسقدر خوشی ہوئی۔ ایک مدت سے میں تمہاری منتظر تھی۔ کئی مرتبہ دوڑ دوڑ کر پھاٹک تک گئی کہ دیکھوں چلے آتے ہیں کہ نہیں۔ دیکھو جھونپڑی کے پیچھے ایک خوبصورت درخت کے نیچے میں نے ایک میز لگایا ہے اور کچھ مزیدار چھوٹے چھوٹے پھل اُسپر چُنے ہیں۔ بالائی کیسی نفیس تیار ہوئی ہے (شوہر کے بازو میں بازو ڈال کر اور ایک مسرت کے ساتھ اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر) اوہو ہم کیسے خوش نصیب ہیں ✦

ہمارے دوست سے ضبط نہ ہوسکا اُس نے جھٹ اپنی دلربا کو سینے سے لپٹا لیا اور خوب سا پیار کیا۔ بات اُس کے مُنہ سے نہ نکلتی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں اِس کے بعد میرے دوست نے بارہا مجھ سے کہا کہ اگرچہ اب ہم خوش و خرم ہیں اور مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر اُس لمحے سے بڑھ کر مسرت بخش کوئی لمحہ نہیں گزرا جس وقت اِس گھر میں آتے ہی میری پیاری بی بی نے میرا نہایت محبت و اُلفت سے استقبال کیا تھا ✦

(ترجمہ از ارونگ) سید نذیر حسین

خود ضبطی

۱- اِنسان میں دو طرح کی طبیعتیں ہوتی ہیں ایک اعلیٰ اور دُوسری ادنیٰ - ایک جسمانی طبیعت ہے جو اُسے اس دُنیا رفانی اور اس کی لذّتوں میں گھسیٹ کر لا ڈالتی ہے - دُوسری رُوحانی طبیعت ہے جو اُسے خواہشات نفسانی اور بدیوں سے دُور رکھتی ہے - اور عاقبت اور عالمِ جاودانی کا راستہ دکھاتی ہے - اِنسان کی زندگی کیا ہے - اعلیٰ اور ادنیٰ میلانوں کے درمیان ایک کش مکش ہے - اور چُونکہ ادنیٰ درجہ کے میلان اور خواہشیں زیادہ زور کرتی ہیں - اِس لئے ضرور ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے آپ کو قابُو میں رکھیں - اگر ہم سُستی اور کاہلی کی طرف مائل ہوں تو ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں - اگر ہم پر خود غرضی طاری ہوتی ہے - تو ہمیں اُسے یکلخت چھوڑنا چاہیئے - کیونکہ ہمیشہ خود غرضی میں محو رہنا کمینہ کام ہے - اگر ہماری طبیعت قابو سے باہر ہونا چاہتی ہے - تو ہمیں اُسے حتی المقدور روکنا چاہیئے - اور اگر کوئی چھوٹی یا بڑی بُرائی ہم پر غالب آنا چاہتی ہے - ہمیں اپنی قوّتِ ارادی سے اُس بدی پر غالب آنا چاہیئے - کیونکہ اگر شروع ہی بں بدی کو نہ روکا جائیگا - تو ہم جلدی اُس کے بس میں ہو جائینگے - ہربرٹ سپنسر صاحب رماتے ہیں - کہ عمدہ آدمی کی ایک کمال خوبی یہ ہے کہ اپنے فطری جذبات اور خواہشیں ں کے بس میں ہوں - تعلیم اور کم از کم اخلاقی تعلیم کا یہ کام ہے کہ انسان محرّک نہ بنے ور ہر ایک خواہش کے ذریعہ جو باری باری اُس پر غالب آتی ہے جوش میں نہ آجائے - را اپنے تئیں قابو میں رکھے - اِدھر اُدھر لغزش نہ کھائے - اور جو کچھ اُس کے خیالات را وہ ہر ایک امر پر غور و فکر کے ساتھ بحث کر کے فیصلہ کر دیں اُس کے مطابق عمل کرے عدہ ہے کہ انسان بُری خواہشوں کے بس میں رہتا ہے - اور انکو نفس کُشی ہی کی

ت سے قابو میں رکھ سکتا ہے اور اسی طاقت کے ذریعہ اخلاقی اور حیوانی زندگی میں
ز ہو سکتی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اپنے پر نیک طور سے حکومت کرے یعنی اپنے آپکو
ی کی طرف راغب کرے۔ انسان کو اس سے زیادہ اور کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ اپنے
پ پر چپکے چپکے فتح حاصل کرنے سے اصلی عظمت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام
قول ہے کہ جو شخص اپنی طبیعت پر حکومت کرتا ہے وُہ اس سے بہتر ہے جو ایک شہر کو
سخیر کرتا ہے +

اگر تم میں بدیاں ہیں جنکا استیصال کرنا لازم ہے۔ یا جذبات ہیں جن کا قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ عقل کو اپنا آقا بناؤ اور اپنے جسم پر اپنی رُوح سے حکومت کرو۔

برابر لڑتے رہو اور جہانتک ہو سکے اپنی تمام طاقت سے مقابلہ کرو۔ گو لڑائی میں تمہارے خون کیوں نہ نکل آئے۔ تم گناہ کے لشکر کو گونگے مویشیوں کی طرح مغلوب کرلوگے۔ کیونکہ ہمت اور ارادہ کے ساتھ سب کچھ ہو سکتا ہے +

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بُود گلدستہ گردد

۲۔ اپنے آپ پر قابو پانے سے ایک قسم کی جُراُت پیدا ہوتی ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ سمائل صاحب فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے جذبات اور نفسانی خواہشوں کی باگوں کو ڈھیلا چھوڑ دے تو اس کی اخلاقی آزادی اسی وقت سے جاتی رہتی ہے۔ جس طرف زندگی یا دُنیا اُسے لئے جاتی ہے۔ اُس طرف وہ بہا چلا جاتا ہے اور جس موقع پر جو خواہش سب سے زیادہ غالب ہوتی ہے اُسی کا مطیع بنجاتا ہے۔ بہت سی بڑی خواہشیں ہیں جو سوسائٹی کو ذلیل کرتی ہیں۔ اور جب لوگ ان خواہشوں میں مُبتلا ہوتے ہیں تو ان کا

نتیجہ وہ جرائم ہیں جن سے سوسائٹی ذلیل ہوجاتی ہے۔ لیکن جب لوگ عزت اور نفس کشی میں ترقی کرتے ہیں تو یہ خواہشیں بالکل نہیں رہتیں۔ ان نیکیوں کا بغور استعمال کرنے سے دل اور طبیعت کی صفائی اور پاکیزگی مستترہ ہوجاتی ہیں اور چال چلن میں پاکدامنی نیکی اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ چال چلن کی عمدگی عادت پر موقوف ہے اور اگر قوتِ ارادت نیک اور حق کاموں کی طرف رجوع کیجائے تو عادت ہمیں مہربان حاکم معلوم ہوگا اور اگر قوتِ ارادی بُرے اور ناحق کاموں کی طرف راجع کیجائے تو عادت ہمیں ظالم اور خودسر بادشاہ معلوم ہوگا۔ عادت ہمیں نیک راستہ پر چلنے میں مدد دے سکتی ہو۔ اور یہی عادت ہماری بربادی اور تباہی کا باعث ہوسکتی ہے۔ عادت کو احتیاط سے سدھانا اور تربیت دینا چاہیئے۔ اور تم یہ دیکھ کر حیران ہوجاؤ گے کہ انسان باقاعدہ تربیت اور ڈرل سے بہت کچھ کرسکتا ہے۔ مثلاً فوج میں دیکھو۔ نہایت ہی ناکندہ تراش اور نکمّے لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے گستاخ اور وحشی لوگ جنکو گلی کوچوں میں سے پکڑ کر لے آتے ہیں۔ یا ناتجربہ کار اور ناشائستہ دہات کے لڑکے ہوتے ہیں۔ جنکا کام ہل چلانا ہوتا ہے۔ لیکن عمدہ ضبط اور قواعد کے ذریعہ ان سب میں ہمت جفاکشی اور نفس کشی کے اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں جنکا گمان بھی نہ تھا۔ اور اگر انکو احتیاط سے تعلیم و تربیت دیجائے تو یہی لوگ لڑائی کے میدان میں یا اَور مصیبت کے موقعوں پر اصلی بہادری اور شجاعت کی خاصیتیں ظاہر کرتے ہیں ✦

۳۔ اخلاقی ضبط اور قواعد عمدہ خصلت کے پیدا کرنے میں بھی کم مدد و معاون نہیں ہیں۔ بغیر قوتِ ضبط کے کتابِ زندگی کا شیرازہ کھل جاتا ہے ✦

سلف ریسپکٹ یعنی خودداری کے خیال کی تربیت۔ فرمانبرداری کی عادت کی تعلیم۔ فرض کے خیال کی ترقی۔ یہ سب باتیں ضبط پر موقوف ہیں۔ جس شخص کو اپنے اوپر پورا پورا اطمینان بھروسہ ہوتا ہے اور جو اپنی طبیعت پر قادر رہے وہ شخص ہر حالت میں اپنے

جذبات کا حاکم ہے - اور ہر شخص میں ضبط جسقدر زیادہ مکمل ہوگا - اسی قدر اس شخص کی اخلاقی حالت برتر ہوگی - اُسے اپنی خواہشوں کو سدھانا ہے - اور ان خواہشوں کو اپنی خاصیت کی اعلیٰ طاقتوں یا قوتوں کے بس میں رکھنا ہے - ان لوگوں کو اپنے اندرونی ہادی یعنی ضمیر کے حکم پر چلنا لازم ہے - ورنہ یہ اپنی نفسانی خواہشوں کے غلام ہونگے اور تحریک کے بس میں ہونگے *

۴ - اصلی شجاعانہ خصلت حلم اور قوتِ ضبط کے ذریعہ تکمیل کو پہنچتی ہے - واشنگٹن بالطبع پرجوش اور تند تھا - وُہ جو اَور لوگوں سے نرمی ملائمت اور خوش خلقی سے پیش آتا تھا اور اُنکا لحاظ رکھتا تھا - اس کا باعث صرف اُس کی سخت نفس کشی کی عادت تھی - جس پر وُہ لڑکپن سے بڑی محبت سے کاربند رہتا تھا - اُس کی سوانح عمری لکھنے والا اسکی نسبت یہ بیان کرتا ہے کہ اُسکا مزاج پُرجوش تھا - اُس کے جذبات اور خواہشیں تیز تھیں - اور چونکہ بہت کچھ ترغیب اور تحریک دلانے والی باتوں سے کام پڑتا تھا وہ ہر دم اس امر کی کوشش کرتا تھا کہ اپنے مزاج پر قادر ہو اور اپنے جذبات کو بس میں رکھے اور آخرش وُہ اُنپر غالب آہی جاتا تھا - اور پھر یہ بھی لکھا ہے - کہ اُس کے جذبات تیز تھے اور بعض اوقات بڑی تیزی سے بھڑک اُٹھتے تھے - لیکن وہ ان کو لمحہ میں یعنی فوراً بس میں کرسکتا تھا *

ولیم خاموش کا یہ نام اس لئے نہیں ہوا کہ وُہ چُپ چاپ شخص تھا - کیونکہ جہاں کہیں فصاحت کی ضرورت ہوتی تھی وُہ نہایت فصیح اور عُمدہ تقریر کرتا تھا - بلکہ یہ نام اُسکا اس لئے ہوا کہ جب کبھی بولنا حکمت میں داخل نہ تھا وُہ خاموش رہ سکتا تھا اور جب کبھی وُہ یہ دیکھتا کہ اُس کی نصیحت کا اظہار کرنے سے اُس کے ملک کی آزادی کو نقصان پہنچتا ہے تو وُہ اپنی نصیحت اور صلاح کو باحتیاط تمام اپنے دل میں رہنے دیتا اور ظاہر نہ کرتا تھا - اُس کا برتاؤ اس قدر حلیم اور صلح پسند تھا کہ اُس کے دشمن بھی اُسکو

بزدل اور مسکین مزاج کہتے تھے۔ لیکن جب لڑائی کا موقع آتا تھا تو اُسکی ہمت شجاعانہ تھی اور اُسکا استقلال غیر مغلوب تھا+

۵۔ اپکٹیٹس کا بیان ہی۔ سقراط کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ اُس نے ترغیب اور خواہش نفسانی کو کیسا پُورا پُورا بس میں کیا ہے۔ اور غور کرو کہ اُس نے اپنے پر جو دانستہ فتح حاصل کی وُہ کیسی عظیم ہے۔ یہ ایسی فتح ہے جو اکھاڑے میں ایک پہلوان دوسرے اپنے برابر کے پہلوان پر حاصل کرتا ہی۔ یہ ایسی فتح ہے جس سے ہم اُسے رستم ثانی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ بخدا ہر شخص اُس کو یہ کہکر سلام کرے تو بالکل بجا ہی اَے عجیب اور نمایاں فتح حاصل کرنے والے منصور تجھے مُبارک ہو۔ جس نے اپنی خواہشات نفسانی پر پُوری پُوری فتح حاصل کی۔ اور یہ بدنصیب اور کمبخت گھونسوں سے لڑنے والے اور پہلوان اور یہ کُشتی کرنے والے جوان سے مشابہ ہیں سلام کرنے یا تعظیم کے لائق نہیں ہیں۔ اور اگر تم خالی بکواس کرنے کے سوائے اس طرح اپنی طبیعت کو سدھانے کے عادی ہوجاؤ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ تمہارے کیسے کندھے اور کیسے رگ پٹھے ہوجائینگے۔ وُہ ہی شخص اصلی پہلوان ہی جو اپنے پر آپ حکومت کرسکتا ہی۔

"شہنشاہ کا اوّل فرض یہ ہے کہ خود تعلیم و تربیت حاصل کرے اور پھر اپنی کچہری اور لشکر پر حکومت کرے۔ اوّل اپنے آپ کو لڑائی میں مغلوب کرے۔ اور پھر اپنے دشمنوں کو مارنے کے لئے کوچ کرے۔ کیونکہ کون شخص اَور آدمیوں کو مطیع کرسکتا ہے۔ جس نے اوّل اپنی اندریوں کو بس میں نہیں کیا"+ (مہابھارت)

م - ل

سمندر کا اِک اَور نظّارہ

ہندوستان کے مغرب میں اسٹیمر کی رفتار کے مطابق بمبئی سے چھ۔ سات گھنٹے کے فاصلے پر شام کے ساڑھے چھ بجے کے قریب سمندر کے کنارے اک عظیم الشان پہاڑ کے دامن میں سیاہ پتھر کی چٹان پر گیروے کپڑے پہنے اِک جوان شخص بیٹھا ہے۔ بار بار گردن پھرا پھرا کر گرد کی نظّارے کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ سوائے خُدا کی ذات کے کوئی آس پاس نہیں۔ توشہ نہ منزل کا بھروسہ۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ نے غمِ دُزد نے غمِ کالا۔ بیٹھا ہے اور بے فکر بیٹھا ہے۔ ؎

چادر چڑھائی چاکِ گریباں نے پھول سی
لاکھوں بناؤ دیگئیں یہ دھجیاں مجھے

اِس کے دہنے ہاتھ میں ایک نوکدار ٹہنی یا شاخ ہے جسے گھس گھسا کر قلم کا کام لینے کو ٹھیک کیا ہے پہلو میں ناریل کے خول یا چھلکے کا اِک گہرا ٹکڑا ہے جسمیں کسی پہاڑی درخت کی چھال کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ زانو پر دبیز سے کاغذ کا اک میلا سا تختہ دھرا ہے جو خدا جانے کس طرح بے برگیوں میں اس کے پاس پڑا رہگیا۔ اِدھر اُدھر قُدرت کی دلاویزیوں کو دیکھتے دیکھتے دفعتًا اِن سے وجدانیت کے عالم میں میر انیس مرحوم و مغفور کی یہ رباعی پڑھی:۔

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں | یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سُو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے | حیراں ہُوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

اور بے تکلّف اپنے مشاہدے کو لکھنا شروع کر دیا جسے لفظًا لفظًا ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"یہ مقام جیسا صبح شام نہایت ہی دلچسپ اور قدرتی صنّاعیوں پر مرمٹنے والوں کے لئے بے نظیر تفرج گاہ ہے۔ ویسا ہی ٹھیک دوپہر۔ اندھیری رات۔ اور مہاوٹوں میں سخت مخدوش۔ ڈراؤنا اور اکیلے دُکیلے چھوڑ دن میں بھی آدمیوں کے لئے بھی ایک جگہ ٹھہر رہنے پر رُوح فرسا ہے۔ جزیرۂ حبشان یا نوآبانِ

حبشی نژاد کا پایۂ تخت اسی بھیانک مقام سے مراد ہو جو ساحل بحیرۂ عرب پر نہایت ہی وحشی مخلوق سے جگہ جگہ آباد ہو۔ میرا مُنہہ مشرق کی طرف ہو۔ اس لئے سامنے کی چٹانیں جھاڑیاں اور تری تک پہنچتے پہنچتے ریت کا دریا طے کرکے پھر جہاں تک نگاہ کام کرتی ہو۔ چاروں طرف پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہو یا یُوں کہنا چاہئے کہ سامنے کے رُخ ہزارہا کوس تک کرۂ ارض کو نیل میں غوطہ دیدیا ہو۔ سوائے خدا کے اور کون جانتا ہو کہ اس سیل پانی کے نیچے کوئی سیال چیز کتنی بھری ہُوئی ہو۔ اس کے گہراؤ میں کیا کیا ہو۔ کون کونسی مخلوق کیا کچھ کرتی ہو اور اسکی انتہا کہاں تک ہو۔ میں یہاں کی بابت کسی سے ضرور پُوچھتا بشرطیکہ یہاں کوئی آدمی ہوتا۔ اکثر اوقات میں یہاں ٹہلا کرتا ہوں لیکن کبھی میں نے سوائے پولیس کے دو اک نیلی وردی والوں اور بعض بعض صرف لنگوٹی بند بھیلوں کے کسیکو اِدھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ یا ہر روز قلعہ میں سے نکلتی ہُوئی چند کشتیوں اور اپنے اپنے اوقات پر قلعہ کے مقابل اِدھر اُدھر سے آکر ٹھہرنے والے اسٹیمروں کو جنپر راجپوری اور پرنس لکھا ہُوا ہوتا ہے بیشک دیکھا کرتا ہوں۔ شاذ و نادر اگر کبھی کوئی غریب سپاہی یا قلعہ کا کوئی تلوریا قریب آبھی نکلتا ہو اور اس سے میں کچھ پُوچھ بیٹھتا ہُوں تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ وہ گجراتی یا کسی اور زبان میں کیچڑ چپاتا ہو۔ اور میں اُردو میں چناں و چنیں کرکے خاموش ہوجاتا ہُوں باقی جتنے اصلی باشندے یہاں کے ہیں وُہ تو آدمی کی شکل دیکھ کر اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیطان لاحول سے۔ میرے پس پُشت وہ نہایت ہی خوفناک درندوں سے بھرا ہوا خونخوار لٹیروں کا پُشت پناہ۔ آسمان سے باتیں کرنیوالے پہاڑوں کا نا متناہی سلسلہ ہو جو کہیں کہیں رُوح کی تیزی سے جلکر ملگجی ہو جانیوالی چھوٹی چھوٹی گھانس سے ڈھکا ہوا ہو اور کہیں بالکل کالی کلوٹی چٹانیں جہاں تنکے کا نام بھی نہیں اسکی قلعی کھولے دیتی ہیں۔ ہاں دامن میں بیشک صدہا ہرے بھرے مختلف قسم کے درخت ہیں جنمیں اکثر کے میں نام بھی نہیں جانتا اور نہ میں نے کبھی دیکھے بلکہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں کہہ سکتا ہُوں نہ یہاں سے سمندر کے کنارے تک چاروں طرف خشکی کا تمام ریتلا حصّہ۔ بادام۔ ناریل۔ چھالیا۔ تاڑ۔ شریفے۔ انجیر۔ خودرو بیلوں۔ بیریوں اور مختلف جھاڑی بوٹیوں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ اپریل کا آخری

حصّہ ہے اور دوپہر کے سکون کے بعد شام ہوتے ہی بحیرۂ عرب کا تمام پانی چونچال ہوتا چلا ہے۔ دہنی طرف ذرا فاصلے پر اک اَور چھوٹا سا پہاڑ ہے جو عین سمندر میں قدم جمائے کھڑا ہے اور جس کے پیچھے جاکر دن بھر کا تھکا ماندہ آسمانی سیّاح بھی آرام لینے کو ہے۔ واللہ و باللہ گو اس سے پہلے بھی ڈوبتے سُورج اور لہریں مارتے ہُوئے نیلگوں سمندر کی چھب تختی اکثر تصویر کے پردے میں دیکھی جا چکی ہے۔ مگر نہیں نقل کو اصل سے کیا نسبت؟ بلکہ جتنا جتنا غور کرتا ہُوں میری یادداشت کی سب تصویریں موجُودہ نظارے کے سامنے نقش بر آب ہیں۔ اللہ اللہ! جھٹ پٹا ہوتے ہی پانی کی سیاہی مائل چادر کو یُونہی کا یُونہی بچھا ہوا چھوڑ کر ذرا اُوپر تو دیکھئے۔ رنگا رنگ بادلوں کے ٹکڑے نیچے اُترتے اُترتے حدِ نگاہ تک جاکر کس پیار سے بحیرۂ عرب کے دُوسرے بازو سے جا لپٹے ہیں۔ کہ مجھے بے اختیار دو ارمان بھری آغوش کا ایک دُوسرے سے وابستہ ہو جانا یاد آگیا۔ غصیلے سمندر کا زہر ہلاہل پانی دُھر اُدھر سے شور مچاتا ہوا آتا ہے اور نگاہ کے فاصلے کو موج در موج طے کر کے مُنہ سے کف ڈالتا ہوا پھر پلٹ جاتا ہے۔ بائیں طرف مختصر سا شاہی قلعہ ہے جسے جزیرہ کہتے ہیں لیکن نشان کے پھریرے کا ہوا میں نہ لہرانا صاف بتا رہا ہے کہ رئیس آجکل یہاں نہیں ہے۔ آہا ہا شفق پھولنی شروع ہُوئی۔ سمندر کا مکھڑا ابھی ہلکا ہلکا گلابی ہو چلا۔ نہیں نہیں گلاب کے پھول جگہ جگہ تیرنے لگے۔ اب جُوں جُوں رات زیادہ آئیگی وُہ ٹھنڈی ہوائیں تیز تیز چلینگی۔ موجیں گھڑی گھڑی پھرینگی۔ قلعہ کی بلند دیواروں اور چٹانوں کی کنگروں پر مینڈھا اُچھلنے لگیگا۔ لو وُہ رات کی گہری سیاہی پہاڑوں پر سے اُتری۔ آگے بڑھی۔ پھیلتی چلی۔ آج شاید آخری چاند اپنا جلوہ دکھائے تارے کچھ بیچ بیچ نکلیں اُنکا عکس پانی میں پڑے اور نقاشِ قدرت اس سائے سے دُوسرا باغ لگا دے۔ پھر پچھلا پہر ہوگا۔ پو پھٹیگی۔ پرند چہچہانے لگینگے۔ ابابیلیں جھومر ڈالینگی۔ شبنم میں ڈوبی ہُوئی ہوائیں چلینگی۔ بھونرے گونجتے نکلینگے۔ شہد کی مکھیاں اُڑینگی کلیاں کھلینگی۔ پہاڑی پھولوں کی بھینی بھینی لپٹیں آئینگی۔ سبزہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھیگا۔ ڈالیاں جھومینگی اور رات بھر کے بے حس ہو کر پڑے ہوئے محنت کش اپنے اپنے کام پر لگ جائینگے ۔

(آغا شاعر دہلوی)

فنِ اشتہار

گو ہندوستان میں بھی آجکل بہت سے نمونے اشتہار دیکر فایدۂ کثیر اُٹھانیکے موجود ہیں۔ مگر اشتہار کی پُوری قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے اور اُس کی قوت کی انتہا کو جانچنے کے لئے تو مغربی دُنیا کی سَیر کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہمارے مُلک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اشتہار کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور اشتہار دینے والوں کو کسی قدر مذموم جانتے ہیں۔ اسی طرح یُورپ میں بھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کسی معزز کارخانے کو اِشتہار کے ذریعہ روپیہ نہیں کمانا چاہئے۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ خیال آبادی کے ہر طبقہ میں موجود ہے اور تجارت پیشہ لوگ بھی اِس سے آزاد نہیں لیکن مغرب میں یہ رائے غیر تجارتی لوگوں میں باقی ہے۔ لیکن کاروباری دُنیا اشتہارات کی ضرورت کی پوری طرح قائل ہو گئی ہے۔ اور کوئی ناموَر سے ناموَر بڑے سے بڑا۔ مالدار سے مالدار کارخانہ ایسا مشکل سے مِلسکتا ہے جو اشتہارات سے فائدہ نہ اُٹھاتا ہو۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کامیابی کی دوڑ میں جو تجارت اپنے کارنامے پُورے طور پر مشتہر نہیں کرتی وُہ دنوں میں زوال پانے لگتی ہے اور جب واقفانِ راز سے مشورہ لیتی ہے تو وہ اِس کے مرض کا درمان اشتہار ہی بتاتے ہیں۔ اِسی سبب سے اب انگلستان میں جو بمقابلہ امریکہ کے بہت قدامت پرست مُلک ہے اور عموماً پُرانے خیالات کے چھوڑنے پر مائل نہیں ہوتا بعض پُرانی پُرانی اور دیر سے جمی ہُوئی کمپنیاں بھی اشتہارات کی طرف رجوع لائی ہیں اور اُنہوں نے لاکھوں روپے صرف کر کے یہ نوبت پہنچائی ہے۔ کہ آدمی کہیں جائے اُن کے اشتہارات سے چھٹکارا مشکل ہے۔ بس گاڑی پر سوار ہو تو وُہ موجود۔ ٹرام پر چڑھو تو وُہ حاضر۔ ریل میں بیٹھو تو سٹیشن کی دیوار اُن سے پُر ہے۔ گاڑی میں بیٹھو اُنکی زیارت ہوتی جاتی ہے اور اُتر کر زینے پر چڑھنے لگو تو ایک ایک سیڑھی پر نمایاں حروف میں کسی نہ کسی چیز کا اشتہار پاؤ گے۔ اشتہارات کی طرف اِس عام رجوع کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اشتہار لکھنے۔ اُنکی ترکیب سوچنے۔ اُنکی تصاویر بنانے۔ اُنکے چھاپنے اور اُنکے تقسیم کرنے کا

ایک خاص صیغہ قائم ہوگیا ہے اور لندن کے بازاروں میں چلتے ہوئے جا بجا لکھا ہوا نظر آتا ہے "اشتہارات کی ایجنسی - یہاں تمام دُنیا کے اخبارات کے لئے اشتہار لئے جاتے ہیں"۔ کہیں لکھا ہوتا ہے "ٹھیکہ دارانِ اشتہار"۔ ان دوکانوں کے مالک وُہ لوگ ہیں جو اس صیغہ سے خاص واقفیت رکھتے ہیں۔ وُہ مختلف جنسوں کے بیچنے والوں کو یہ بتا سکتے ہیں۔ کہ کونسا ذریعہ اُن کے لئے زیادہ مفید ہوگا کسی کو کہتے ہیں کہ آپ کے لئے اخبارات میں اشتہار دینا بہتر ہے۔ کسی کو مشورہ دیتے ہیں کہ ماہوار رسالے آپ کے لئے مفید ہونگے۔ کسی کو رائے دیتے ہیں کہ ریل کے سٹیشنوں پر اور مختلف گاڑیوں پر آپکے اشتہار کا موجود رہنا اچھا ہے۔ کسی کو نمائش میں بڑے بڑے کاغذ چسپان کرانیکی صلاح دیتے ہیں اور کسی کو کہتے ہیں کہ ان سب ذریعوں سے کام لے اور ایک دفعہ پانی کی طرح زر بہاوے۔ پھر دیکھے کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ انہیں ہر ذریعہ اشتہار کے نرخ معلوم رہتے ہیں۔ اور مختلف اخباروں اور رسالوں کی اشاعت کا حال بھی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح یہ لوگ مشورہ دے سکتے ہیں کہ کون کون سے اخبار اور رسالے کارآمد ہونگے۔ یا کس جنس کے لئے کونسا پرچہ اچھا رہیگا۔ ہر ایسے کارخانے میں دو تین آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ جو اشتہارات کا مضمون لکھنے یا انکی ترکیب سمجھانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس ترکیب کو بطور ایک فن کے سیکھتے ہیں اور جب اُس میں ماہر گنے جاتے ہیں تو نہایت معقول تنخواہیں پاتے ہیں۔ کئی کارخانے ایک ایک ایسا آدمی خاص اپنے ہاں نوکر رکھ لیتے ہیں۔ جسکا کام اُنکے اشتہار کے لئے مختلف تدبیریں سوچتے رہنا ہوتا ہے اور جو کسی کارخانہ سے سروکار نہیں رکھتا۔ ہمارے ملک میں شاید اس امر پر تعجب ہوگا۔ کہ اشتہار لکھنا اور فن! اور بہت حضرات کہینگے کہ اس میں کون سی کرامات درکار ہے۔ ذرا سی مشقِ انشا اور قوتِ مبالغہ درکار ہے۔ اپنی چیز کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی۔ اور اسکی خوبیوں کو آسمان پر چڑھا دیا۔ چلئے اشتہار ہوگیا۔ کوئی نہ کوئی بیوقوف تو پھنس ہی جائیگا۔ ع چو احمق درجہاں باقی است کس مفلس نمے ماند۔ بیشک یہ تو احمقوں کے پھانسنے کی ترکیب ہوئی۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ داناؤں کے پھنسانیکا بھی کوئی ڈھنگ ہے یا نہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ہاں ہے۔ اور اسے یورپ اور امریکا میں کمال کو پہنچا یا گیا ہے۔ مگر اسکے سیکھنے کے لئے ویسی ہی مشق اور کاوش درکار ہے جیسی کسی اور فن کے لئے۔ اگر کوئی سیکھنا چاہے تو اُس کے سکھانیوالے موجود ہیں۔

باقاعدہ طور پر انکا شاگرد ہونا پڑتا ہے۔ ماہوار فیس یا معقول معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ مدت تک دماغ سوزی ہوتی ہے۔ جب کہیں جاکر اُنکے معیار میں پورا اُترتا ہے ٥١

کسی ماہرِ فن کی اشتہار نویسی اور ایک ناواقف مگر اچھے پڑھے لکھے آدمی کی اشتہار نویسی میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ ماہر جس بات کو چند لفظوں میں کہہ سکتا ہے۔ ناواقف کئی سطروں میں اُس خوبی سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ چند لفظ آسانی سے نظر میں کھُب جاتے ہیں۔ دُور سے رہگذر کی آنکھ بھی اُنپر پڑ سکتی ہے۔ اور دل پر بھی نسبتاً آسانی سے منقوش ہوتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں اکثر مشتہرین کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ جہانتک ہوسکے کاغذ زیادہ کالا کیا جائے۔ اخبار میں جگہ زیادہ مانگتے ہیں۔ پھر جتنی جگہ لیں اس میں مضمون زیادہ بھرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ گنجان تحریر ہو جاتی ہے اور اس قدر الابلا اُس میں بھری ہوتی ہے کہ سوائے بالکل بیکار آدمیوں کے بہت کم لوگ اشتہارات کو دیکھنے کی پروا کرتے ہیں۔ اس غلطی کا باعث صرف اصُولِ اشتہار سے آگاہی کا نہ ہونا ہے۔ اشتہار چاہیے وہ جس پر سرسری دیکھنے والے کی بھی نظر پڑے۔ اُس کا آغاز چاہیے ایسے لفظ یا الفاظ سے ہو جو باقی حصّے کے پڑھنے پر انسان کو مجبور کر دیں۔ اور باقی الفاظ ایسے چاہئیں جو آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائیں اور تیر کی طرح نشانے پر جا بیٹھیں۔ پڑھنے والے کے دل میں ایک بار تو اُمنگ پیدا ہو جائے کہ ہاں یہ سودا لینے کے لائق ہے۔ اور کچھ نہیں تو وُہ خط لکھ کر نمونہ ہی منگوائے۔ پھر اگر مال میں کوئی خوبی ہے تو گاہک خواہ مخواہ اپنا ہو گیا۔ یورپ میں تصویر سے اشتہارات میں بہت مدد لی جاتی ہے اور معقول بھی ہے۔ کیونکہ تصویر عام توجہ کے کھینچنے میں الفاظ سے زبردست آلہ ہے اور اگر دلکش یا تعجب خیز تصویر کے ساتھ چیدہ اور دلنشین الفاظ کی قوت بھی شامل کر دی جائے تو پھر دلوں کے قفلوں کی کُنجیاں آپکے ہاتھ میں ہیں کھولتے چلے جایئے۔

ہمارے ہاں اشتہار کو ایک زائد اور غیر ضروری خرچ سمجھا جاتا ہے۔ اور گو ایک دُوسرے کو دیکھ کر کئی

٥١ راقم کو چونکہ بحیثیت اخبار نویسی کے زمانہ سے تعلق کے اشتہارات سے دلچسپی تھی۔ اِس لئے لنڈن پہنچتے ہی اس فن کے حالات دریافت کئے۔ اب ایک نامی معلم سے ملاقات ہو گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ باوجود ابتدائی مشق موجود ہونے کے ایک سال بھر کی کوشش کامیابی کے لئے درکار ہے۔ اپنی طرف سے پوری سعی کی جائیگی۔ اور اگر خدا کو منظور ہوا۔ تو اس تحصیل سے بعض اہلِ ملک کو فائدہ پہنچیگا۔

ہمارے یہاں بکثرت سے اشتہار دینے کا شوق کرنے لگے ہیں۔ مگر وہ اشتہار میں ہر طرح ارزانی کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں پر علیحدہ چھپواتے ہیں تو ردی۔ کم قیمت۔ بدنما کاغذ پر۔ سستے چھاپہ خانے میں۔ ایک ایک صفحہ پر بیشمار سطریں بے ضرورت اور بے ربط عبارت میں شائع کر دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں دس ہزار اشتہار تقسیم کئے۔ مگر صدائے برنخاست صرف چند خطوط آئے اور تو کوئی بولا نہیں۔ اب اشتہار میں بھی کچھ نہیں رہ گیا" کوئی اُن سے یہ تو کہے کہ اشتہار میں تو سب کچھ ہے۔ آپ اپنے دماغ سے بھی کام لیں۔ دس ہزار پر جو لاگت آئی ہے۔ اس لاگت سے ایک ہزار چھپوائیے۔ کاغذ ہو عمدہ۔ لکھائی ہو نفیس۔ عبارت ہو دلچسپ۔ فقرے ہوں تھوڑے۔ کچھ کچھ سجاوٹ بھی ہو۔ صاف چھپیں اور احتیاط سے تقسیم کرائے جاویں۔ اندھا دُھند نہیں۔ کہ چیز ہے عوام میں بکنے کی اور اشتہار تقسیم ہو رہے ہیں ایک ایسے اخبار میں جس کا بیشتر حصہ اُمرا کے ہاتھ میں جاتا ہے یا چیز ہے اُمرا کے کام کی اور اشتہار تقسیم ہو رہے ہیں کسی ایسے پرچے میں جس کے سب گاہک کم بضاعت یا متوسط الحال لوگ ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہے کہ کامیابی کے لئے جو مناسب ترکیبیں ہیں وہ تو عمل میں نہ لائی جاویں۔ مگر کامیابی کی توقع رکھی جائے اور جب وہ مُنہ نہ دکھائے تو شکایتیں ہوں۔

اسکے سوا بعض چیزوں کو چھوڑ کر جنکی فروخت ہر وقت ہو سکتی ہے کئی اشیا ایسی ہیں۔ جو خاص موسموں سے متعلق ہیں فرض کیجئے۔ کہ ایک شخص پشمینہ کا سوداگر ہے۔ اور تمام ہندوستان کے اخباروں میں سال بھر اشتہار دیتا رہتا ہے۔ اور جب گرما میں ایک آدھ گاہک بھی بمشکل ملتا ہے تو اخبارات اور اشتہارات سے ناراض ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نصف کے قریب روپیہ اس مد میں بالکل ضائع کر رہا ہے یہی روپیہ اگر موسم کے موقع پر اشتہار کے اَور طریقوں پر لگائے تو بحیثیت مجموعی زیادہ نفع حاصل ہو اور موسم کے دنوں میں اگر اسکا اشتہار روز رنگ بدلتا ہے اور نئے سے نئے پیرایہ اور رنگا رنگ کی ترکیبوں میں نکلتا ہے تو زیادہ لوگ اسکی طرف کھنچیں۔ ہم نے کئی اشتہار اپنے اہلِ وطن کے دیکھے ہیں کہ ہر اخبار میں کئی سال سے ایک عبارت میں چھپ رہے ہیں۔ اور جو روپیہ اس غفلت سے بے نتیجہ صرف ہو رہا ہے اُس پر نہایت افسوس کرتے ہیں۔

یہ تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جوں جوں مُلک میں تجارت ترقی کریگی اور مغربی تہذیب کا اثر بڑھیگا۔ اشتہارات کے متعلق جو تعصب ہے وہ تو کم ہو جائیگا اور وہ لوگ جو اب اشتہار نہ دینے پر فخر کرتے ہیں وہ بھی چار و ناچار اس ذریعہ تجارت کے استعمال کرنے پر مجبور ہونگے۔ گویا یہ ایک نہ رکنے والا سیلاب ہے جو آ رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہیئے تو یہ کہ اشتہار دینے والے دیسی کارخانوں کے چیزوں کے الزام سے بری رہیں۔ اور اچھی اصلی الاقسام کارآمد چیزوں سے عوام کو آگاہ کریں۔ اور اشتہارات دینے میں ایسے اصول

مفید ثابت ہوں۔ اور انکی اشاعت میں اُن تراکیب سے فائدہ اُٹھاویں۔ جو اِسوقت مغربی ملکوں میں مستعمل ہیں۔ جہاں اس فن کی بُنیاد پڑی۔ اور جہاں سے اب ہندوستان میں اسکی تقلید شروع ہوئی ہے۔ عبد القادر

بلالؓ

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہُوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وُہ آستاں نہ چھُٹا تجھ سے ایک دم کے لئے کسی کے شوق میں تُونے مزے ستم کے لئے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وُہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

ستم ہے شوق کی آتش کو مثلِ موجِ ہوا
"خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا"

نظر تھی مثلِ سلیماں[1] ادا شناس تری شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا اُویس[2] طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نُور تھا گویا ترے لئے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید

ترے نصیب کا آخر چمک گیا اختر علی کے سینے میں جو راز تھا کھُلا تجھ پر
گری وُہ برق تری جانِ ناشکیبا پر کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
نمازِ عشقِ حسینِ حجاز ہے گویا یہی نمازِ خدا کی نماز ہے گویا

[1] حضرت سلمان فارسی رحمۃ اللہ علیہ۔ [2] حضرت اُویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ۔

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وُہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُسکا

خوشا وُہ روز کہ دیدار عام تھا اُسکا

اقبال

ظفر کی موت

یہ نظم حضرتِ گوہر کے جگر گوشہ عبد الرحمٰن ظفر علی مرحوم کی مَوت کا ماتم ہے۔ ہم کو حضرتِ گوہر سے دِلی ہمدردی ہے۔ خُدا اُنکو اس صدمۂ جانکاہ کی برداشت کی طاقت اور صبرِ جمیل عطا فرماوے۔

یہ کیا سبب ہے الٰہی کہ چرخِ کجرفتار — اُڑا رہا ہے بصد یاس سر پہ خاک و غبار
یہ کس کی سوزشِ غم نے جلا دیا اس کو — چڑھا ہوا ہے جو خورشیدِ صبح کو بھی بُخار
یہ کس کا غم ہے کہ اُترا ہے مُنہہ ستاروں کا — یہ کیا الم ہے کہ ماہِ دو ہفتہ ہے بیمار
ہوائیاں سی یہ کیُوں اُڑ رہی ہیں چہرہ پہ — اُداس کیُوں نظر آتے ہیں صبح کے رُخسار
یہ کس کے سوگ میں پہنا ہے ماتمی جوڑا — اُتار کر شبِ مہ نے دوشالۂ زرکار
ذرا سا مُنہہ نکل آیا ہے کیوں یہ غنچوں کا — یہ کس کے غم میں گلوں کا ہو آج سینہ فگار
یہ کس کا سانحۂ جانکاہ ہے کہ شبنم تک — بہائے جاتی ہو آنکھوں سے اشکِ حسرت بار
یہ کیُوں نسیمِ سحر آہ سرد بھرتی ہے — یہ کس کے بَین میں بےخود ہے بُلبلِ گلزار
چمن سے کس گلِ رعنا نے آج کوچ کیا — بڑھائے بیٹھی ہو زیور جو نو عروسِ بہار
یہ کس عزیزِ غریب الوطن کا ماتم ہے — کہ رو رہے ہیں گلے مل کے آج لیل و نہار
یہ کس کی مرگِ مفاجات کی خبر سُنکر — مٹا رہی ہے ہوائے خزاں چمن کا سنگھار

وہ کونسا گُلِ خوبی قضا نے سونپا ہے — کہ غم سے سینۂ تربت ہوا ہے ناہموار
بنا ہے صحنِ چمن غمکدہ یہ کیا باعث — نہ غنچہ محوِ تبسم نہ صرف خندہ ہزار
نہ بلبلوں کے وہ نغمے نہ رقصِ طاؤساں — درختِ خاک بسر سبزہ پائمالِ غبار
نہ جامِ لالۂ احمر میں بادۂ رنگیں — نہ چشمِ نرگسِ شہلا میں کچھ نشہ کا خمار
زبان بند ہے وہ چپ لگی ہے سوسن کو — نہ چھیڑ چھاڑ نہ طعنہ نہ شوخیٔ گفتار
بنائی شکل ہے سنبل نے سوگواروں کی — کُھلے ہیں بال پریشاں ہے طُرّۂ طرار
ظفر تمہیں بھی خبر ہے تمہارے مرنے پر — ہوئی تمہارے عزیزوں کی کیسی حالت زار
سعید بیٹوں کا شیوہ تو یہ نہیں ہوتا — کہ دیکھیں روتا ہوا اپنی ماں کو زار و قطار
یہ کیا ستم ہے کہ تم بے خبر ہوا اے بیٹا — غمِ فراق سے جس نے کیا ہے سینہ فگار
تمہارے باپ کا ماں کا تمہاری دادی کا — تمہارے بھائیوں کا لے گیا جو صبر و قرار
مگر تمہاری نہیں کچھ خطا ظفر اس میں — شکایتیں یہ عبث تم سے یہ گلے بیکار
کہاں ہے نقد دوائے اجل زمانہ میں — نہیں زمانہ کو جب آپ ہی سکون و قرار
یہ اضطراب ہے کمزوریوں کے باعث سے — ہمیں تو چاہیئے ہونا خدا کا شکر گذار
کہ اس نے تم کو حقیقی حیات طیب دی — اُٹھا لیا میرے سر سے تمہارے فرض کا بار
نجات تم کو زمانہ کے درد سے بخشی — دیا ہے رہنے کو تم کو بہشت کا گلزار
کسے خبر ہے کہ تم کس طرح بسر کرتے — کسے خبر ہے کہ کیسی گذرتی آخرِ کار
یہی دعا ہے کہ جس طرح تم گئے معصوم — خدا ہمیں بھی اُٹھائے با حمدِ مختار
رہیں تو دینِ محمد پہ برقرار رہیں — چلیں تو ساتھ چلے ظلِ عیسیٰ وادار

ذو الفقار علیخان گوہر رامپوری

صورت و سیرت

حسنِ صورت نے یہ اِک روز بصد ناز کہا
نیک سیرت سے کہ میں بھی ہوں عجب چیز بنا
کونسا دِل ہے وہ جسمیں نہیں میری اُلفت ؟
کونسی آنکھ ہے وہ جو نہیں میری شیدا !
وہ ہے مرغوبِ طبائع وہ ہے محبوبِ قلوب
میں موالیدِ ثلاثہ میں سے ہوں جسکو ملا !
قیسِ نجدی کو کیا کس نے بالآخر مجنوں ؟
میں نہ ہوتا تو بھلا چیز ہی کیا تھی لیلےٰ !!
شہرتِ عام میری وجہ سے وامق کو ہوئی
میں ہی تھا جسکو سمجھ رکھا تھا اُس نے عذرا
میں نے ہی اسکو کیا کوہ کنی پہ مائل
سوجھتا کچھ نہ تھا فرہاد کو شیریں کے سوا !
غور فرمایئے اور اس میں تھے کیا لعل ٹکے ؟
میری ہی وجہ سے پنوں ہوا سسی پہ فدا
اِک اِنہی پر نہیں موقوف جدھر کیجے نظر
شش جہت میں ہیں کرشمے میرے ہر جا صدہا
کہو احسنت جمادات میں دیکھو جو مجھے !
گر نباتات میں پاؤ تو کہو صلِّ علےٰ !
شاعروں کے ہوئے منظورِ نظر نرگس و گل
چشمِ بینا نے جو لکھی مجھے اُن میں دیکھا
ان میں میری نہ جھلک ہو تو ہیں خضرا دمن
لالہ و یاسمن و نسترن و مہر گیا
میں نہ شامل ہوں تو ہر ایک ہے کنکر پتھر
لعل یاقوت ۔ زمرد ہو کہ موتی ۔ ہیرا
مجھ کو چلتا ہوا جادو جو کہیں زیبا ہے
حُب کا نایاب عمل سمجھیں تو بالکل ہے بجا !
خود ہے اللہ جمیل اور اُسے محبوبِ جمال
ذکر انساں کا کیا چاہتا ہے مجھ کو خدا !!

ختم جب کر چکا تقریر یہ حسنِ صورت
حسنِ سیرت نے کہا صدّقنا ۔ آمنّا
جسقدر آپ نے اوصاف کیے اپنے بیاں
میرے نزدیک ضرورت نہ تھی اسکی حاشا
فیض خورشید سے آگاہ ہیں دنیا میں سبھی
لیکن اُس نے کبھی تعریف کی اپنی نہ ثنا

شہد کو حق نے کہا فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاس ــ اپنے مُنہ سے نہ کہا اُس نے کہ مَیں ہُوں میٹھا
خوشنوا کہتے ہیں بُلبل کو تو گل کو رنگیں ــ زعم پر اُس کو نہ کچھ اُسکا نہ اسکو دعویٰ
اِس قدر اَوج پہ گردُوں کی تواضع دیکھو ــ یہ جھکا ہے کہ زمیں پر ہے بچھا سا پڑتا
خودستائی ہی بڑا عیب اگرچہ - لیکن ــ آپ کے واسطے تعریف ہے اپنی زیبا
آپ کی خوبی و محبوبی میں شک ہی کس کو ــ غور کیجے تو نہیں میرا بھی کچھ کم رُتبا
لعل و الماس و زمرّد تو بڑی چیز ہوئے ــ دیکھیے حنظلِ ناچیز کی شکلِ زیبا!
دیکھ کر صورتِ خوب اس کی وُہ رنگِ مرغوب ــ نظرِ شوق کو ہے لُطف سا آیا کرتا!
خاک ہو جاتا ہے نظّارے کا پر سب یہ مزا ــ دھیان آنے سے کہ ہے ذائقہ اُسکا کڑوا!
حُسنِ صُورت بھی ہی اک موہنی منتر بیشک ــ حُسنِ سیرت ہو اگر ساتھ تو پھر کیا کہنا
صُورتِ خوب بھی ہی ایک طرح کا جادُو ــ سیرتِ نیک کو اعجاز جو کہئے ہے بجا
صُورتِ خوب پہ بدخُلق اگر ہو کوئی ــ ہے وُہ اِک پھول کہ جس میں نہیں خوشبو اصلاً
حُسنِ سیرت کسی بدشکل کو حاصل ہو اگر ــ ایک ہنستے کو ملا آلۂ فتحِ دُنیا!
پہ نہ وُہ اسپہ کچھ اترائے نہ یہ ناز کرے ــ دونو یہ عیب ہیں سخت ایک سے ہی ایک بُرا
آپ ہیں گر گُلِ خوشرنگ تو مَیں ہوں نگہت ــ آپ خوشبو ہیں میں نسیمِ سحری کا جھونکا
آپ گر شمعِ فروزاں ہیں تو مَیں لمعۂ نور ــ آپ ہیں چاند تو مَیں اپنی جگہ شمسِ ضحیٰ!
فوق کچھ آپ کو مجھ پر نہ مجھے آپ پہ کچھ ــ غور کیجے تو ہے دونوں کا برابر درجا

حُسنِ صُورت کے لئے سیرتِ نیکو زیور
حُسنِ سیرت کے لئے صُورتِ زیبا گہنا

سیّد علمدار حسین بنوڈی

نقشِ عبرت

جناب عرش ایک مشاق اور ذی استعداد اہل سخن ہیں۔ اس نظم میں نہایت خوبی سے انقلاب زمانہ کی تصویر کھینچتے ہیں جو قابل داد ہے۔

واسطے سیر کے گلشن میں گیا تھا میں کل عیش و آرام میں بلبل کے نہ تھا کوئی خلل
ہائے اے بادِ خزاں تُو نے دیا رنگ بدل آج دیکھا جو وہاں تھے نہ تو وُہ پھول نہ پھل
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

خواب سے کرتے نہیں آکے انہیں کیوں بیدار کیا ہُوئے اُنکے وُہ احباب وہ یار و غمخوار
زندگی سے تو یہ کل تک نہ تھے کچھ بھی بیزار آج کیوں آکے ہیں سوئے ہُوئے یُوں زیرِ مزار
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

زندگی پر جو ہیں بھُولے ہُوئے ہیں دیوانے نہ تو میخوار رہینگے۔ نہ سدا میخانے
یک قلم بھُول گئے رات کے سب افسانے ہیں دمِ صبح نہ وہ شمعیں نہ وُہ پروانے
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

یہی دہلی ہے جسے کہتے تھے سب رشکِ جناں دم اُلجھتا ہے مرا آج اُداسی سے یہاں
کل جو تھا تخت نشیں ہر وُہ شہنشاہ کہاں کیا ہُوئے آج مکیں اور ہُوئے کیا وُہ مکاں
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

صُورتیں ہیں تو - مگر ہائے وُہ صُورت نہ رہی اب وُہ دِن سِن نہ رہے اب وہ طبیعت نہ رہی
دوستوں میں وُہ جو تھی تھوڑی مروّت نہ رہی کِس سے کیجئے اُلفت کہ وُہ اُلفت نہ رہی

حیف درچشم زدن صُحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

ہے بقا ذاتِ خدا کو نہیں اس سے انکار اور جو شئے ہے فنا ہونے کو ہے وُہ تیار
کیا سبب آج جو سنسان ہیں دشت و کُہسار کل تو تھا قیس یہاں اور ہی کچھ تھے آثار

حیف درچشم زدن صُحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

ہیں امیر[۱] آج کہاں اور وہ فریاد[۲] و رفیق[۳] کیا ہوئے حشر[۴] و ضیا[۵] آہ[۶] و نفیس[۷] اور لئیق[۸]
تھے مرے دَور میں یہ اہلِ صفا پاک طریق عیش[۹] و خورشید[۱۰] کہاں اور کہاں ہیں وُہ شفیق

حیف درچشم زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

ٹھنڈی ٹھنڈی نہ ہوا ہے نہ پتا سبزے کا اب نہ وُہ سبزے خنکی اور نہ وُہ رنگِ فضا
نہ وُہ ملّاح نہ کشتی ہے نہ ہے وُہ دریا نہ تو ساحل ہے نہ پیاسے ہیں نہ ہے وُہ نقشا

حیف درچشم زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

جُز ابابیل کہاں رہتے ہیں انساں وُہ ہاں مسجدیں چھوڑ گئے تھے جو سلاطینِ زماں
صاف کہدے کہ ہے جنات کا اب تو وُہ مکاں اب موذن سے جو دہر کو کہے کوئی اذاں

۱ امیر مینائی مرحوم۔ ۲ مولوی غلام حسین فریاد ہڈ مولوی گیا ضلع اسکول۔ ۳ دوست ہیچمدان۔ ۴ مولوی فصیح احمد حشر گیاوی۔ ۵ میاں علی رضا ضیا عظیم آبادی۔ ۶ شیخ ذوالفقار علی عرف مو بہ آہ گیاوی۔ ۷ جناب میر خورشید علی صاحب نفیس لکھنوی خلفِ انیس مرحوم مرثیہ گو۔ ۸ لیق اشرف پیہر سہرامی تلمیذِ مصنف۔ ۹ نواب لیاقت علی عیش رئیس ڈگرگیا۔ ۱۰ خورشید لکھنوی مولفِ افادات۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

دیکھے ہیں گردشِ ایام کے نقشے کیا کیا	جھوٹے وُہ آپ ہیں کہتے ہیں جو ہم کو جھوٹا
جس میں کل تک نظر آتے تھے مسافر صدہا	آج سنسان ہے ویران ہے بالکل وہ سرا
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

آتشِ جوش میں وُہ شعلہ فشانی نہ رہی	خشک دریا کی طرح دل میں روانی نہ رہی
شاعری اُٹھ گئی۔ وُہ مرثیہ خوانی نہ رہی	عرشؔ میں پیر ہوا میری جوانی نہ رہی
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

عرشؔ مصنّف حیاتِ تسلیم

ترکیب بند

پچھلے سال جب علیگڈھ کی انجمن الفرض کا ڈپوٹیشن حیدرآباد دکن گیا تھا۔ تو ان کے لئے کئی عالیشان جلسے کئے گئے تھے۔ اُن میں ایک جلسہ کا اہتمام مسٹر ظفر علیخاں کی طرف سے تھا۔ اور اس جلسہ میں جناب ضامن کنتوری نے ایک نہایت عمدہ نظم بصورت ترکیب بند پڑھی تھی جسکے پہلے تین بند درج کئے جاتے ہیں:۔

لائی ہے بادِ صبا مژدۂ فصلِ بہار	جوش سے ہے گوہر فشاں فرشِ چمن پُر نگار

سبزۂ نورستہ ہے یا کہ لباسِ حریر　　قطرۂ شبنم ہیں یہ یا گہرِ آبدار
لالہ و گل سے بنے معدنِ یاقوت و لعل　　گلبن و بستانسرا دشت و دمن کوہسار
ایک طرف خندہ رُو یاسمن و نسترن　　ایک طرف مستِ ناز سروِ لبِ جوئبار
موجۂ بادِ نسیم جنبشِ نبضِ رواں　　رشتۂ جانِ بہار سنبلِ پیچاں کے تار
غنچۂ تر برگِ سبز طُرّۂ گنجِ نشاط　　گل لبِ رخسار تاجِ سرِ افتخار
سادگیِ برگ میں رنگِ امل کی جھلک　　خامیِ اثمار میں چاشنیِ انتظار
چاشنیِ انتظار میوۂ امید کی　　میوۂ جنت سے ہے خوش مزہ و خوشگوار
گھیرے ہے ہم کو مگر یاس ہر اک سمت سے　　شاہدِ امید نے کر دیا خالی کنار
اب کسے سمجھائیں ہم اور کسے تسکین دیں　　دل ہے الگ بیقرار چشم الگ اشکبار

گلشنِ اسلام میں دورِ خزاں آگیا
نکبت و ادبار کا ابرِ سیہ چھا گیا

یاد ہیں وہ دن کہ تھا باغ تمنا ہرا　　گلشنِ اسلام میں دخل خزاں کا نہ تھا
دولت و اقبال میں حشمت و اجلال میں　　کوئی جہاں میں نہ تھا ہمسر و ہم مرتبا
فتح و ظفر تھے نقیب راہنما تھا نصیب　　پھر گئے قوموں کے رُخ ہم نے جدھر رُخ کیا
ابرِ ترقی پہ تھا یا کوکبِ احمدی　　دیکھتے ہی دیکھتے چار طرف چھا گیا
کر دیا قوموں کو ایک ہو گئے بدسار نیک　　شرع کی تعلیم نے خوبیاں دیں سب سکھا
دینِ مبیں نے کیا ایک سیاہ و سپید　　شامی و رومی کا فرق ہم میں نہ باقی رہا
یاوریِ بخت سے ہاتھ لگا تاج و تخت　　پیرویِ عقل سے مل گئی راہِ ہدیٰ
خاک نشینی پہ تھے مہرِ سپہرِ عروج　　نقشِ قدم جنکے ہیں زینۂ بامِ علا
خادم و مخدوم کا فرق نہ تھا قوم میں　　سامنے اسلام کے ایک تھے شاہ و گدا
شمعِ طریقِ عمل ملتِ بیضا ہوئی　　رسمِ اخوت بنی حبلِ متینِ ولا

شانِ اخوت سے تھی شان سب اسلام کی
یکجہتی پر بنا ہوتی تھی ہر کام کی

جب سے کہ بدلا یہ رنگ اور ہی عالم ہوا — تھا جو نہالِ مراد وہ شجرِ غم ہوا
بادِ سمومِ نفاق چلنے لگی چار سمت — کینہ و بغض و حسد ذائقۂ سم ہوا
گھٹ گئیں غمخواریاں بڑھ گئیں عیاریاں — جاتی رہیں یاریاں جوششِ صفا کم ہوا
سلسلۂ اتحاد قوم کا شیرازہ تھا — ٹوٹتے ہی جس کے سب دفتر برہم ہوا
شیعہ و سنی کی جنگ فارسی ترکی کی جنگ — تا ابد تفرقہ ہم میں مسلّم ہوا
ناصحِ مشفق کا نام ہجو میں آنے لگا — جس نے کہی نیک بات مستحقِ ذم ہوا
کوششِ رفعِ نفاق گذری دلوں پر گراں — بارِ جہالت سے قد حلقۂ خاتم ہوا
نیچریوں کا گروہ قابلِ لعنت بنا — چارہ گری کا صلہ قعرِ جہنم ہوا
نوحۂ مرگِ پدر نغمۂ عشرت فزا — اور ترقی کا راگ نوحۂ ماتم ہوا
عقل پہ پتھر پڑے ہو گئی الٹی سمجھ — ہر ادب آموزِ قوم جہلِ مجسم ہوا

خواری و ذلت کو بھی سمجھے کہ اقبال ہے
ساری تباہی کی جڑ زشتئ اعمال ہے

قریۂ ویران

اے مرے او بنِ دلکش - قریۂ راحت فزا! — قرب کے گاؤں میں تیری فرد تھی نشو و نما
خطۂ زرخیز تیرا اس قدر آباد تھا — راس تھی کچھ ایسی کھیتوں کو تری آب و ہوا
فصل یاں ہوتی تھی پوری گاؤں والے شاد تھے — تندرستی کے دھنی تھے ہر طرح آباد تھے

ایا کرتی تھی یہاں آغازِ موسم میں بہار
ٹھہرا کرتا تھا زمستاں کا یہاں پچھلا کھا

سادہ و دلکش تھے تیرے کُنج ہائے پُرفضا
تھے یہ ایامِ جوانی میں مری آرامگاہ

جبکہ آتا تھا مجھے ہر مشغلہ میں اِک مزا
سیرِ سبزہ زار کی کرتا تھا تیرے بارہا

یرے ہر منظر سے ہوتی تھی مجھے فرحت نصیب
بارہا دیکھی ہیں رُک کر تیرے اشیائے عجیب

وہ پھلا اور پھُولا مزرعہ - جھونپڑا وہ سادہ سا
وُہ سدا لبریز چشمہ - آسیا سرگرم کار

وہ کلیسائے مصفا - اُونچے اُونچے دلپسند
قرب کے ٹیلوں سے سر رکھتے تھے جو اپنا بلند

انٹے والی جھاڑیاں تھی جنکے پردے میں نہاں
راز گوئی کے لئے خلوت سرائے عاشقاں

یک جالِ گُل کے جنکے اوٹ میں پیرِ کہن
خُوب تھے آپس میں کرتے گرم بازارِ سخن

ف رے اس دِن کی تمنا اس دلِ شیدا کی جب
فکرِ دُنیا سے تھی ملتی فرصتِ عیش و طرب

ور آتے تھے اُمڈ کر گاؤں کے برنا و پیر
مرد و زن ادنےٰ و اعلےٰ - کیا غریب اور کیا امیر

دور از رنج و محن - آزاد از فکرِ جہاں
زیرِ اشجارِ مبسّط کھیلتے تھے شادماں

یرِ سایہ کھیل ہوتے تھے عجب انداز کے
نوجواں لڑتے تھے آپس میں تو بوڑھے دیکھتے

بیسیوں نیرنگیاں دکھلائی جاتی تھیں یہاں
علم و فن کی کارسازی - جوہرِ زورِ یلاں

ختم ہو چکتا تھا جب ہر کھیل دو یا تین بار
اور کھیلوں کی طرف دیتا تھا مجمع دل اُبھار

بھولے بھالے گاؤں والے کو نہ تھا ہرگز گماں
کہ ہے کالک کا ٹیکا اُس کے چہرے پر عیاں

اور اُس کے چار سو کل دیکھنے والے کھڑے
چھکے چھپکے کیا لگاتے تھے مزے کے قہقہے!

شرمگیں دوشیزہ کا ترچھی نگہ سے دیکھنا!
اور انکو سن رسیدہ عورتوں کا گھُورنا!

تھیں یہ تیری خوبیاں اے قریۂ راحت فزا
جلد جلد ایسے تماشے ہوتے رہتے تھے سدا

اِن سے محنت اور مشقت میں بھی آتا تھا مزا
اِن سے ہو جاتی تھی دُونی سبزہ زاروں کی فضا

تجھ میں تھیں ایسی بہاریں - قریۂ رشکِ جناں!
پر وہ اگلی سی فضا وہ حُسن و صُورت اب کہاں!

اَے مقامِ دلکشا! اَے قریۂ راحت فزا / کیا ہُوئے تیرے تماشے۔ تیری وُہ نشوونما
گنج میں آتا ہے تیرے ہاتھ ظالم کا نظر / چھا رہی ہے مُردنی سی تیرے سبزہ زار پہ
ایک ہی مالک کا تیری سرزمیں پر ہے مدار / نصف مزرعہ رہ گیا ہے انتہائے کشت زار
اب کہاں اگلی سی تیری آبشاروں میں صفا / چشمۂ شفاف میں وُہ روزِ روشن کی ضیا
ہر طرف موجیں بھری ہیں اب خس و خاشاک سے / اب نظر آتے ہیں بہتے چشمے کچھ ناپاک سے
مرغزاروں میں تیرے۔ وُہ تیرا تنہا میہماں / یعنے اِک مسکین بگلا با صدائے پُر فغاں
پاسبانی کرتا ہے اپنے نشیمن کی سدا / (ڈر کسی دشمن کا گویا اُس کے ہے دل میں لگا)
مُرغِ آبی۔ ایک رہِ متروک پر اُڑتا ہُوا / کرتا ہے شورش سے اپنی بدمزہ اسکی صدا
کیسے ویراں ہو رہے ہیں مرغزارِ دلپسند / ہو گئی ہے گھاس دیوارِ شکستہ سے بلند
کانپتے۔ ڈرتے ہُوئے ظالم کے دستِ جور سے / تیرے بچّے دُور کے مُلکوں میں اب ہیں جا بسے
ہے جہاں زر کو ترقی اور انساں کو زوال / ایسے مُلکوں کا بُرا اکثر ہوا کرتا ہے حال
اغنیا کی گر نا ممکن ہے سرِ نو سے اُبھار / باتوں باتوں میں ہوا کرتا ہے اُنکا اقتدار
پر ہُوئی دیہاتیوں کی قوم گر زیر و زبر / غیر ممکن ہے پنپنا ان جوانمردوں کا پھر
وُہ بھی تھا کوئی زمانہ فرخ و میموں قدم / خطۂ انگلینڈ سے جب دُور رہتا نامِ الم
جبکہ دو گز سرزمیں تھی اپنے مالک کا عصا / کیونکہ اُسنے محنتوں سے ہوتا تھا حاصل سدا
اِتنا ہی ہوتا تھا حاصل تھی ضرورت جس قدر / پر نہ تھا ملنے کا حاجت سے زیادہ شمہ بھر
سادگی اور تندرستی اس کے یارِ خوشخصال / اور دولت اسکی تھی بے علمیٔ مال و منال
اب گئے وُہ دِن کسانوں کا گیا اب اقتدار / سنگدل تجار کی اب ہر طرف ہے گیر و دار
منتشر قریوں سے پہلے تھا بسا جو مرغزار / اب ہے اونچے اونچے ایوانات کا دار القرار
ہم عنانِ جاہ و ثروت یعنی طرفہ حاجتیں / کبر و نخوت کا نتیجہ رُوح فرسا کلفتیں
ہر طرف چھائی ہُوئی ہے اُنکی اب کالی گھٹا / مٹ گئی اگلے زمانہ کی بہار دلکشا

اب کہاں اگلے سے وہ اوقاتِ پُرعیش و سرور   جن سے استغنا نے رکھا تھا غبارِ فکر دور
اب کہاں وہ آرزوہائے قلیل و خوشگوار   امر مشکل تھا نہ جنکا پورا ہونا زینہار
اب کہاں وہ صحت افزا مشغلے اے دوستدار   جن سے تھی آنکھوں کو ٹھنڈک اور سبزوں کی بہار
چل بسے اب سب کے سب ایک اور ساحل کی طرف   ہیں جہاں اک آدھ باقی یادگارانِ سلف

قریۂ راحت فزا! اے صورتِ فصلِ بہار!   جورِ ظالم کے ہیں منظر تیرے اُجڑے مرغزار
اب تیری راہِ مسلسل کشتِ ویراں پر اگر   جا نکلتا ہوں کسی دن میں اکیلا بھول کر
جب نظر آتا ہے مجھ کو بعد مدت وہ مقام   جس جگہ تھے جھونپڑے اور جھاڑیاں [illegible] تمام
یاد آجاتی ہے مجھ کو تیری اگلی داستاں   سامنے آنکھوں کے پھر جاتا ہے وہ گذرا سماں
ہُوک سی اُٹھتی ہے دل میں دیکھ کے صورت تری   اے گلِ پژمردہ یہ کیا ہوگئی رنگت تری!

تھا جنوں سا جس زمانے میں مرے سر پر سوار   گردشِ ایام کے جب ہو رہے تھے مجھ پر وار
پائے وحشت جب لئے پھرتی تھی مجھ کو دربدر   پر نہ ملتا تھا کہیں افکارِ دنیا سے مفر
تھا اسی امید سے دل کو سہارا صبح و شام   آئیگی جب صبحِ پیری موت کا لیکر پیام
آئیگا بھرنے کو جب اس زندگانی کا ایاغ   اور جب بجھنے لگے گا اپنی ہستی کا چراغ
زندگی کی چپقلش سے پھیر کر آخر زمام   پھر کرونگا سبزہ زاروں میں ترے آکر قیام
تاکہ ہوں ایامِ پیری عیش و راحت سے بسر   اور اپنی شمع بجھنے سے بچے پیش از سحر
یہ بھی تھی دل کی تمنا فخر اور پندار سے   مبتلا ہیں جس مرض میں سارے چھوٹے اور بڑے
گرد مجمع کے کسانوں کو بٹھا کر وقتِ شام   گوش زد انکے کرونگا سرگذشت اپنی تمام
اور دکھلاؤنگا اپنے علم کی اُن کو بہار   جس سے ہو جائیگا زاید گاؤں میں اپنا وقار
جس طرح خرگوش کوئی از پئے جانِ عزیز   اول اول تو سگی سے کرتا ہے کیا کیا گریز
گھیر کر لاتی ہے لیکن پھر قضا اسکو وہیں   بھاگ نکلا تھا جہاں سے ہو کے دل [illegible]
مجھ کو بھی امید یہ تھی عمر کے پچھلے دنوں   جبکہ انکار و تمرّد کے زمانے ختم ہوں

تیرے ہی آغوش میں ہو زندگی اپنی بسر مسکنِ مالوف میں اپنا بندھے رختِ سفر

(ترجمہ از گولڈسمتھ) محمد شہاب الدین خاںؔ

ویران مکان

مخزن کے گذشتہ نمبر میں ایک مختصر سا مضمون اُجڑا ہُوا گھر مترجمہ پیرزادہ بشیر احمد صاحب چھپا تھا۔ حضرت احسن صاحب کو یہ مضمون بہت پسند آیا اور وہ نہایت خوبی سے نظم کرکے بغرضِ اندراج ہمارے پاس بھیجتے ہیں:-

خراب موت سے ہستی کا کارخانہ ہُوا مکان رہگیا خالی مکیں روانہ ہُوا
کرایہ دار تھے اس گھر کے زندگی و خیال اسی مکاں میں گذاری تھی عمر سالہا سال
نہ اپنے جانے پہ کوئی نشان چھوڑ گئے شکستہ حال سا خالی مکان چھوڑ گئے
کچھ ایسے مضطرب الحال دل ملُول گئے کہ گھر کی کھڑکیاں بھی بند کرنا بھُول گئے
ہے اُن دریچوں میں بے رونقی کی مہمانی جہاں تھی نور کی دو پتلیوں کی دربانی
ہر ایک حصہ میں اس گھر کے کیا اندھیرا ہے چہار سمت سے وحشت نے آکے گھیرا ہے
کھُلے پڑے ہیں بھیانک وُہ آج دروازے ہزار بار جو کھُلتے تھے بند ہوتے تھے
چہل پہل ہے نہ ہنگامہ گفتگو کا ہے مکانِ عیش جو تھا وُہ مقام ہُو کا ہے
ہوس تھی جس میں بسی وُہ ہوا نہیں آتی خموشیاں ہیں۔ کہ کچھ بھی صدا نہیں آتی
خدا کسی کو دکھائے نہ ایسا سناٹا ہر اک طرف نظر آتا ہے کیسا سناٹا
نہ انجمن ہی رہی اور نہ وُہ انجمن آرا مکان کیسا یہ ڈھنڈھار ہوگیا سارا

کھلے ہوئے ہیں جو در اُن پہ ڈال دو پردے ۔ کہ میرے دل کو یہ وحشت نہ مضطرب کر دے
یہ بے نشاں سارہی گا نشان مٹّی کا ۔ ملا دو مٹی میں اب یہ مکان مٹّی کا

احسن لکھنوی

دمِ واپسیں

ذیل کے اشعار حضرت اعجاز نے اپنی ایک سالہ بھتیجی کی وفات حسرت آیات کی یادگار میں لکھے ہیں۔ یہ نظم مسافرِ عدم کی حالت کی ایک صحیح اور اعلیٰ درجے کی تصویر ہے۔ اسی مضمون پر ایک انگریزی شاعر ٹامس ہُڈ کی نظم "بسترِ مرگ" بھی نہایت خوب ہے۔ ان دونوں نظموں کے مقابلے سے مشرقی اور مغربی طرزِ فکر و طرزِ ادا کا فرق معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا :-

عناصر کی کشاکش تھی بلا کا درد پنہاں تھا ۔ قیامت تھی ذرا سی جان کو رنج فراواں تھا
جُدائی رُوح میں اور جسم میں بیڈھب لڑائی تھی ۔ کہ ہر پیغام صُلح و آشتی اک آفتِ جاں تھا
تماشا تھا مریضِ نیمجاں بیزار جینے سے ۔ عزیزوں کو تلاشِ چارہ گر تھی فکرِ درماں تھا
گڑی تھیں سانس پر نظریں یہاں آیا یہاں آیا ۔ وہ اک تارِ نفس سلکِ دُرِ صد بحرِ ارماں تھا
سبکساری تھی واں مدِ نظر بارِ علائق سے ۔ یہاں ارمان بھرا دل زیرِ بارِ یاس و حرماں تھا
وہاں قطرہ کو بیتابی فنا فی البحر ہونے کی ۔ یہاں ہر قطرۂ اشک الم ہمشکلِ طوفاں تھا
ہوا ہر دم رکے تھے مجتمع واں سر کی گرمی میں ۔ یہاں شیرازہ عقل و فہم کا یکسر پریشاں تھا
وہاں دم ٹوٹتا تھا اپنی ہمت ٹوٹی جاتی تھی ۔ وہاں ہونٹوں پہ دم تھا لب پہ اپنے شور افغاں تھا

بدن ٹھنڈا ہوا جاتا ہے - اب کس کام آئیگا
ہمیں کو پھونکنے کو تو مگر اُسے سوزِ پنہاں تھا

وُہ سلطانِ جہاں جانِ جہاں تھی جانِ جاناں تھی
چلے جاتے ہی اُسکے خانۂ دل اپنا ویراں تھا

لگایا فانیوں سے دل تم اے اعجاز ناداں تھے
وُہ ہستی زندگی اک خواب تھا عبرت کا ساماں تھا

تازہ غزلیں

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں مَیں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اُسے مکیں مَیں نے

سوالِ دید میں لذت ہو اُسے کلیم ایسی
ہزار بار سُنی ہے وُہی نہیں مَیں نے

قطعہ

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھسے
بُھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں مَیں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں مَیں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اَوجِ خیالِ فلک نشیں مَیں نے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں مَیں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں مَیں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا
وُہ سادہ لوح ہوں میں کر لیا یقیں مَیں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں مَیں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں مَیں نے

کبھی مَیں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں مَیں نے

کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میداں میں
کہی کسی کو ستم پر کبھی آفریں مَیں نے

سُنایا ہند میں آکر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں مَیں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سُنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلافِ معنیٔ تعلیم اہلِ دیں میں نے
اُٹھائے تلخیٔ انکار میں مزے کیا کیا — بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو — جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اِسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر — لگا کے آئینۂ عقلِ دُور بیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہُوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا — خُدا بچائے یہ باتیں سُنی نہ تھیں میں نے
وُہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی — سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے
نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم — بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے
خُدا تو ملتا ہے اِنسان ہی نہیں ملتا — یہ چیز وُہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں میں نے

عجیب شَے ہے صنم خانۂ امیر اقبال
مَیں بُت پرست ہُوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

اقبال

غزل

(از جناب حضرت مولوی شاہ معشوق علی صاحب کشش پھلواری)

اے میرے بخت خدا کے لئے بیدار بھی ہو
خواب ہی میں سہی اُس کا کہیں دیدار بھی ہو

کیا قباحت ہے اگر آج ہی دیدار بھی ہو
فرض ہو حشر بھی ہو مجمعِ اغیار بھی ہو

بے مدد چل سکے کیا مُلکِ عدم کو وہ غریب
خود بھی کمزور ہو عصیاں سے گرانبار بھی ہو

قتل ابرو سے کرو۔ یا کرو مژگاں سے ہلاک
کیا ضرورت ہے کہ نیزہ بھی ہو تلوار بھی ہو

مدد غم کا رہوں فرقت میں نہ کیونکر ممنوں
ان غریبوں کے سوا کوئی مددگار بھی ہو

طالبِ جلوہ سے یہ شرط عجب ہے اُن کی
دشتِ ایمن کا بھی ہو اور شبِ تار بھی ہو

مذہبِ عشق میں کامل ہے وہی اے زاہد!
ہاتھ میں سبحہ بھی ہو دوش پہ زنّار بھی ہو

قتل میں عاشقِ بیدل کے تامّل کیا ہے
جو کہ بیمار بھی ہو جینے سے بیزار بھی ہو

زینتِ دل ہے۔ تیرے یاد مژہ کا رہنا
حسنِ گل کا ہے یہی اُس میں کوئی خار بھی ہو

یاد میں کیوں رُخِ روشن کے جلاتی ہو ہمیں
دل مرا طور ہو کیا۔ نور بھی ہو نار بھی ہو؟

پوچھو اُس قلبِ شکستہ سے ذرا خطرۂ حشر
جسکو اُمید نہ ہو اور گنہگار بھی ہو

لطف ہو دشت نوردی کا یہی جوشِ جنوں
آبلہ پاؤں میں ہو۔ وادیٔ پُرخار بھی ہو

نکلے حسرت تو ساری کسی صورت دل سے
تیر پیکاں میرے سینہ کے کہیں پار بھی ہو

پا پیادہ چلوں کس طرح عدم کو اے موت!
ناتوانی سے یہاں طاقتِ رفتار بھی ہو

فصلِ گل آنے کی کیا اسکو خوشی ہو صیاد
پر شکستہ بھی جو ہو اور گرفتار بھی ہو

ہاتھ کیا اب ہو بڑھاتا طرفِ جیب جنوں
دیکھ لے بیٹھے۔ گریباں میں کوئی تار بھی ہو

جلوہ اُس یار کا ہر ذرہ میں ظاہر ہے کشش
ہاں نظر والا کوئی طالبِ دیدار بھی ہو

غزل

مژدہ وصال یار کا آیا نہیں ہنوز — دیدارِ دوست آنکھ نے پایا نہیں ہنوز
ہو جس میں بوئے مہر و وفا گل نسیم نے — ایسا کوئی چمن میں کھلایا نہیں ہنوز
موسیٰ تو کوہ طور پہ غش کھا کے گر پڑے — پردہ کو تو نے رُخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز
بسمل تڑپ رہا ہے مگر تو نے عشق اِ جم — کاری جگر پہ کوئی لگایا نہیں ہنوز
بے تاب ہو گئے ترے جھونکے سے اے نسیم — پیغامِ یار تو نے سنایا نہیں ہنوز
اچھی رہی کہ مُفت میں بدنام ہو گئے — اور اشکِ چشمِ تر سے گرایا نہیں ہنوز
افسوس تو نے مرغِ نوا خوانِ صبحدم — سوزِ درونِ عشق کو پایا نہیں ہنوز
اے آفتابِ حشر تو کیوں کانپنے لگا — میں نے تو داغِ دل کو دکھایا نہیں ہنوز
ابرِ بہار بھی ہے جنُوں بھی ہے کیا سبب — دامن پہ ہاتھ اُس نے بڑھایا نہیں ہنوز
کیوں ساتھ چھوڑتا ہے سکندر کا تو خضر — آبِ حیات لب سے لگایا نہیں ہنوز
جل جل کے بجھ گئی شمع پیرِ مے فروش — ہم نے چراغِ دل کو جلایا نہیں ہنوز
دل سننے والوں کا میرے نالوں سے ہل گیا — جو دل میں بھید تھا وہ جتایا نہیں ہنوز

برہم ہوئی ہے محفلِ اربابِ معرفت
صادق نے دردِ دل کو سنایا نہیں ہنوز

(صادق علی خاں)

غزل

ابرِ بہار جوش پر آیا نہیں ہنوز — دل کے تپش کو اس نے بجھایا نہیں ہنوز
جلتا رہا دیا مری تربت پہ تا سحر — کیوں اے نسیم تو نے بجھایا نہیں ہنوز
کیا مجھ نیاز مند کے دل کی تمہیں خبر — ناز آپ نے کسی کا اُٹھایا نہیں ہنوز
ناصح نہیں ہے محرمِ اسرارِ عاشقی — جس نے کسی سے دل کو لگایا نہیں ہنوز

ہم مدتوں سے بیٹھے ہیں مقتل میں سر جھکائے
قاتل نے حکمِ قتل سنایا نہیں ہنوز

نالوں کو رہنے دیجئے کیوں آپ ڈر گئے
ہم نے تو آسمان کو ہلایا نہیں ہنوز

چھانا ہے نجد ناقۂ لیلےٰ ذرات بھر
گم گشتہ کا نشان بھی پایا نہیں ہنوز

آئی ہے جان لب پہ مری انتظار میں
لیکن غضب ہے یہ کہ وہ آیا نہیں ہنوز

شاید شہیدِ خنجرِ ناز و ادا ہوا
قاصد جوابِ نامہ جو لایا نہیں ہنوز

پہنچے ہیں یاد منزلِ مقصود پر ہمیں
اے بختِ خفتہ تو نے جگایا نہیں ہنوز

فرصت کہاں حبیب اسے بزمِ غیر سے
گھبرا رہے ہیں ہم کہ وہ آیا نہیں ہنوز — سید حبیب

غزل

پلا پلا کے اسے رحمت کی قسم دیتے ہیں
کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں

اسی رفتار سے اٹھے گی قیامت اک دن
یہ خبر ہم کو ترے نقشِ قدم دیتے ہیں

ان کی باتوں میں نہ آ جائیگا بندہ نواز!
مفت کا آپ کو اغیار بھرم دیتے ہیں

کہہ رہی ہے مرے ساقی کی عنایت مجھ سے
لے چھلکتا ہوا ساغر تجھے ہم دیتے ہیں

داغ دیتے ہو جو دل پر تو ذرا ٹھنڈک سے
مُہر کے واسطے کاغذ کو بھی نم دیتے ہیں

دل جو قیمت نہیں بوسے کی تو پھر کچھ بھی نہیں
ہاتھا چھانٹی نہیں کرتے ہیں تم دیتے ہیں

کوئی مضمون پھڑکتا ہوا لکھنا شاعر
آج ہم پھر تمہیں قرطاس و قلم دیتے ہیں

آغا شاعر قزلباش

یعنی

اڑھائی روپیہ میں حکیم حاذق

پاکٹ کیس ادویات جوہری

جس سے ہر ایک شخص پورے حکیم کا کام لے سکتا ہے

منظور شدہ عالیجناب لارڈ کرزن صاحب بہادر وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند

مصدقہ ڈاکٹران یورپ و حکمائے یونان و سلاطین ہند و ایڈیٹران اخبار و نوابان و راجگان و جاگیرداران

خدا شاہد ہے

کہ اس بکس کے ذریعہ آج تک مختلف امراض کے تخمیناً ایک لاکھ مریض شفا پا چکے ہیں۔ (سندات قابل ملاحظہ ہیں)

پانچ اور دس روپے والا **پاکٹ کیس** تو چودہ پندرہ سال سے جاری تھا ہی مگر اب ہزارہا شائقین کی تحریک پر ایک اور چھوٹا پاکٹ کیس **اڑھائی روپے** والا اس غرض سے تیار کیا ہے کہ ہر ایک امیر و غریب اس سے فائدہ اٹھا سکے + اس چھوٹے پاکٹ کیس میں بھی وہی مختلف **پچاس بیماریوں** (مندرجہ حاشیہ) کی نہایت مجرب ادویہ جو تخمیناً سو ڈیڑھ سو مریض کے لئے کفایت کریں موجود ہیں۔ ہر ایک دوا کی ترکیب استعمال جو ہر پاکٹ کیس کے ساتھ بھیجا جاتا ہے ایسا عام فہم ہے جو ہر ایک کی سمجھ میں بخوبی آ جائے۔ یہ عجیب و غریب پاکٹ کیس بڑی جانفشانی سے انگریزی و یونانی ادویات کے جواہر کو ترکیب دے کر ان اشخاص کے لئے تیار کیا گیا ہے جو اکثر سفر یا ایسے مقاموں میں رہتے ہیں جہاں حکیم یا ڈاکٹر وقت پر نہ مل سکیں یا ان عیالداروں کے لئے جنکو اکثر شکایتوں کے واسطے حکیموں یا ڈاکٹروں کے پیچھے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے یا ان غربا نوازوں کے لئے جو خلق خدا کو فی سبیل اللہ دوا تقسیم کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ایک انسان کے لئے گویا بغل میں حکیم حاذق ہے جس سے واقعی وقت پر پورے حکیم کا کام لے سکتا ہے۔ بڑے بڑے نامی حکیموں اور ڈاکٹروں نے بھی اسے زبدۃ الحکمت مان لیا ہے کیونکہ اکثر طبابت پیشہ اصحاب اب اسی کی ادویات سے مریضوں کا علاج کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بکس خورد (۲؍۸) - درمیانہ (۵؍) - کلاں (۱۰؍) محصول بذمہ خریدار

المشتہر

حکیم ڈاکٹر چراغ الدین جوہری ایل ایم ایس سرجن اینڈ فزیشن امرتسر (پنجاب)

امجد بیگ کا روغن خضاب

صرف پانچ منٹ میں سپید بالوں کو قدرتی بالوں کیطرح سیاہ کر دیتا ہی باندہنے کی ضرورت نہیں صرف برش سے لگا لیجے دوسرے خضابوں کی طرح بالوں میں بہورا پن نہیں آتا ایک مدت دراز تک بدرنگ نہیں ہوتا اور اِسی ہی بات پر مجھے ناز ہی ورنہ خضاب کے نسخے ہزاروں آجکل مروج ہیں مگر میرے خضاب کیطرح بالوں کا رنگ قائم اور نرم چمکدار نہیں بنا سکتے اور قیمت سب خضابوں سے بہت کم یعنی فی بکس مع محصولڈاک ایک روپیہ اور اِس بکس میں دو شیشیاں ہیں ؛

اِسکے علاوہ لاتی ہر قسم کی نایاب اشیاء جرمن فرانس امریکہ لنڈن مثلاً گہڑیاں ہر قسم کی بائیکل خوشنما مضبوط گاڑی گہوڑوں کا سازسامان موٹر کار یہ گاڑی بجلی کی قوت سے خود بخود چلتی ہی عجیب طلسمی گاڑی ہے غرضیکہ تمام دنیا کی چیزیں میرے ذریعہ آپکو گہر بیٹھے پہنچ سکتی ہیں ؛

برقی فیتہ اِن فیتوں میں بجلی کی قوت دیگئی ہی جس بچہ کے گلے میں پہنا دیا جائے دانت بہت آسانی سے نکل آئیں تمام ڈاکٹروں کا اِس پر اتفاق ہے **قیمت دو روپے**

سرمہ کی گولی نہایت مفید آزمودہ آنکھ کی ہر مرض کیلئے تاثیر اکسیر رکہتی ہی **قیمت فی تولہ ایک روپیہ**

قرآن مجید یہ قرآن شریف ایک انچ لمبا اور ایک انچ سے کسیقدر کم چوڑا مختلف دہاتوں کے تعویذ میں بند ہی اور اسکے ساتھ ایک آئی گلاس بھی ہی آئی گلاس کے ذریعہ خوب اچھی طرح سے پڑہا جاتا ہی دوسرے یہ کتنی برکت کی بات ہے ایک تعویذ تمام کلام شریف کا جو نہایت خوشنما گلے میں ہے اس سے زیادہ حرز جان کیلئے عمدہ کوئی چیز صاحب ایمان و اسلام کو ممکن نہیں ہے **قیمت تین روپے** ـ

بواسیر کا چھلہ جو ماہ رجب کی ایک مخصوص تاریخ میں برکت اسماء الٰہی سے تیار کیا جاتا ہی خونی بادی ہر قسم کی بواسیر کو دفع کرتا ہی ایک درویش کامل کا عطا کیا ہوا ہے **قیمت فی چھلہ ۱۰ ـ**

المشتہر

مرزا امجد بیگ تاجر کتب بمبئی بھنڈی بازار ـ

بولتی ہوئی تصویریں

ہم نے انتظام کیا ہے کہ اپنے سلسلۂ تصاویر کے لئے جو جنوری ۱۹۰۵ء سے شروع ہے ہاف ٹون تصویریں ولایت سے بنوا کر منگوائیں چنانچہ اس مہینے کے پرچے میں جو تصویریں درج ہیں وہ انگلستان سے چھپ کر آئی ہیں۔ یہاں ابھی اس کام کی ابتدا ہے اور انگلستان میں درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ وہاں جو تصویریں چھپتی ہیں ان میں ایک ایسا قدرتی رنگ ہوتا ہے کہ گویا منہ سے بولتی ہیں۔ اگر کوئی صاحب اپنی کسی کتاب یا رسالے کے لئے یا ویسے شوقیہ ایسی تصاویر کھنچوانا چاہیں تو ہم سے خط و کتابت کر کے نرخ دریافت کریں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم انہیں کلکتہ بمبئی مدراس کے کارخانوں سے عمدہ کام تیار کرا دینگے۔ اور نسبتاً ارزاں بھی۔ ان کارخانوں سے تانبے کی پلیٹ کی تیاری چھپوائی اور کاغذ کی قیمت کا مفصل نرخ منگوا کر مقابلہ کیجئے اگر مقابلہ میں ہمارے نرخ سستے نظر آئیں تو ہماری معرفت کام بنوائیے۔ نرخ دریافت کرنے کے لئے دفتر مخزن لاہور سے خط و کتابت کیجائے۔

جست کے پلیٹ کی نسبت تانبے کی پلیٹ پر تصاویر نہایت صاف اور خوبصورت چھپتی ہیں

آؤ ہم بتلائیں کہ پچیس ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوتے ہیں

ممیرہ کراماتی — مقوی بصر۔ محافظ بینائی۔ دافع نزول الماء۔ دھند۔ غبار۔ آب روانی وغیرہ۔ قیمت فی تولہ دو روپے ۔ عہ۔

حب ذیابطیس — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر رک کر تندرستی نصیب ہو۔ فی تولہ عـہ

حب دائمی قبض — ایک گولی سے دائمی قبض معدہ اور تمام عوارض درد سر۔ ہیجان وغیرہ کافور ہو جاتے ہیں عہ

جوہر عشبہ — صفائی خون کے لئے بے مثل۔ گندے خون کو زہر سے صاف کرتا ہے۔ دافع پھوڑا۔ پھنسی۔ ناسور۔ بھگندر۔ خارش شیشی کلاں عہ شیشی خورد عہ۔

نور علی نور — چند منٹ میں بال دور۔ ۴ تولہ ایک روپیہ عہ۔

حب دافع وجع مفاصل — دردِ اعضاء جوڑوں کا درد دور ہو۔ ۲ ہفتے کے لئے ۔ عہ

حب دافع طحال — تلی یا لف کے دفعیہ کے لئے شرطیہ۔ ۲ ہفتے کے لئے دو روپے عہ۔

مسی ایل — دلربا خوشبو کے علاوہ بال بے وقت سفید نہیں ہونے دیتا۔ نزلہ۔ زکام کو دور کرتا ہے۔ ضعف دماغ کو مفید فی شیشی عہ۔

مورد کن — اس کے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے عہ۔

دوائی خارش — رانوں کی خارش اور بدن کے دانے دو دن میں خشک ہو جاتے ہیں۔ ۲ تولہ عہ۔

باق السعال — اخراج بلغم۔ درد سینہ۔ سرفہ کہنہ اور خراش گلو۔ نزلہ کا چھاتی پر گرنا اس کے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کارآمد۔ ایک تولہ کی قیمت دو روپے ...... عہ۔

حب قائم مقام افیون — چانڈو۔ افیون بلا تکلف اس سے چھوٹ جاتے ہیں ایک تولہ عہ

روغن اعجاز — برسوں کا زخم بھر جاتا ہے۔ بھگندر و ناسور کے لئے اکسیر اور مجرب الاثر ۲ تولہ عہ

دوائی درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو جاتا ہے ایک شیشی دو سو مریض کو کافی ہے عہ

چورن مقوی معدہ — خوش مزہ بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے۔ ۴ تولہ ایک روپیہ عہ

سنون مستحکم دندان — ہلتے دانت مضبوط اور میل دور کرتا ہے۔ ایک روپیہ عہ

بدالقدر دافع بخار — دو رتی بھر سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے قیمت ۲ درجن عہ

دمہ یا ضیق النفس — سانس رکنا اور بلغم وغیرہ دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے عہ

رعنا — چہرہ کے بدنما داغ و چھائیاں دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ عہ

سفوف درد گردہ — درد گردہ اور ریگ مثانہ بلا تکلف خارج ہو جاتی ہے ۴ تولہ عہ

اکسیر شفا — دوائی طاعون بطور علاج حفظ ما تقدم کے مریض کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے خوراک ۲ منٹ فی شیشی ایک روپیہ عہ

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور (موچی دروازہ)

الندوہ

ندوۃ العلماء کا ماہوار علمی رسالہ

ایڈیٹران

مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب رئیس بھیکن پور۔ شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی ناظم سررشتۂ علوم وفنون حیدرآباد دکن۔

جمادی الاولی ۱۳۲۲ھ ہجری کے پہلے ہفتہ سے انشاءاللہ تعالیٰ شائع ہوگیا ہے۔ اسکا مقصد علوم اسلامیہ کا احیا، تطبیق معقول ومنقول اور علوم قدیمہ وجدیدہ کا موازنہ ہوگا۔

علاوہ مندرجہ بالا مقاصد کے اس میں حسب ذیل مضامین بھی ہوا کرینگے۔(۱) عربی کی نادرالوجود کتابوں پر تقریظ وتنقید۔(۲) ممالک اسلامیہ میں آجکل جو کتابیں لکھی جارہی ہیں اُنپر تقریظ۔(۳) اکابر سلف کی سوانح عمریاں (۴) نصاب تعلیم مروجہ پر بحث۔(۵) ندوۃ العلما کے حالات (۶) علمی خبریں۔

چونکہ دقیق مضامین سے عام لوگوں کو دلچسپی نہیں ہوسکتی اس لئے ہر پرچے میں ایک دو دقیق مضمون باقی عام فہم اور آسان ہونگے۔

یہ رسالہ دو قسم کے کاغذ پر چھپتا ہے: اوّل قسم کی قیمت مع محصول (للعہ) چار روپیہ اور دوسری قسم کی مع محصول تین روپیہ (للعہ) سالانہ ہے۔ لو شاہجہانپور دفتر ندوۃ العلما سے ہر عربی مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔ جن حضرات کو خریداری منظور ہو وُہ مینجر رسالہ کو مذکورہ بالا پتہ سے مطلع کریں اور رسالہ کے ساتھ نقد قیمت بھیجیں یا ویلیو پے ایبل بھیجنے کی اجازت دیں +

سید عبدالحئی (مددگار ناظم) مینجر الندوہ


چاندی کے عمدہ قفل نما بٹن
قیمت فی سٹ دو روپیہ
گرتے کے گریبان کے نئے چاندی کے زنجیر دار بٹن
چاندی تو ہے مگر
ایسے عمدہ ہیں کہ
یہ بٹن خالص چاندی کے بنے ہیں
تیار ہو سکتے ہیں
قابل دید زنجیر میں آویزاں ہے قیمت فی عدد تین روپے
کی طلائی اور مرصع کیلیں
کو منگا کر تحفہ دیجئے اور حسن خدا داد کا تماشا دیکھئے۔
قابل دید
سنہری چینا کلی
بڑی خوبصورت دلفریب اپنی طرز کی
چینا کلی منگائیے اور
کسی حسین خوش رو کو تحفہ
دیکھئے پری زاد
طلائی ملمع شدہ خوشنما جڑاؤ آرسی
یہ آرسی جس کا نقش آپ کے
پیش نظر ہے۔ ہم سے
منگائیے
خالص چاندی قابل دید عمدہ مثال
کا شوق ہے تو آپ ایک مثال
کارخانہ سے منگائیں۔ اسیر نقش و نگار
قابل تعریف ہیں اصلی خوبی دیکھنے پر ظاہر ہوگی
قیمت دو روپیہ بارہ آنہ
طلب فرمائیے شیخ رحیم الدین زیور فروش
اصل چاندی